ماہنامہ

چیف ایڈیٹر: محمود شام

انتہاؤں میں رابطہ

اطراف

کراچی

دسمبر 2024

125

کتاب نمبر

بھارت میں اُردو کتابوں کے ناشرین تعارف۔ رابطے

جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر ایمریٹ جناب اختر الواسع کے توسط سے

قیمت: پاکستان میں 500 روپے
بیرون پاکستان۔ 5 ڈالر

ہمدرد
عافیت سے جیتے رہو!
قدرتی جڑی بوٹیوں کی
طاقت سے فوری آرام پائیں
• کھانسی، نزلہ اور زکام
• سینے کی جکڑن اور بند ناک
• گلے کی خراش
Sualin
Lozenges
سُعالین
Sualin
/Hamdardpkofficial

باقاعدہ تصدیق شدہ اشاعت ABC certified

انتہاؤں میں رابطہ

ماہنامہ

اطراف

کراچی

جلد 11: شمارہ: 12

دسمبر 2024

قیمت فی پرچہ: 500 روپے۔ سالانہ: 5000 روپے۔ بیرون ملک۔ 50 ڈالر

چیف ایڈیٹر : محمود شام

ایڈیٹر : خان ظفر افغانی

ریذیڈنٹ ایڈیٹرز: تنویر شہزاد (لاہور)، عبدالغفور چوہدری (کینیڈا) عاصم متین خان (نیویارک)

نگراں شعبۂ اولاد۔ تربیت۔ تواضع : رخشندہ محمود

نمائندہ خصوصی : محمد اجمل (کوئٹہ) ، پروفیسر شاداب احمد صدیقی (حیدرآباد)

ڈیزائن : محمد شاہد رفیق : عکاسی : شکیل قریشی : مارکیٹنگ: محمد آصف : 0331-0063311

سرکولیشن منیجر: راجہ شاہد : 0300-8210636 , 0332-2561774

﴿دسمبر خاص﴾ ہندوستان سے اُردو پبلشرز اور مصنفین کا تعارف
پروفیسر اختر الواسع
35-46

اہل تدبر کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا
اطرافیہ
05

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟
☆ سید ارتقا احمد زیدی
23-25

ٹی وی ڈراما مافیا
☆ عمران سلیم
07-08

60 سال سے زیادہ پرانی 3 کتابیں
☆ غفور اسد
29-30

ٹرمپ انتظامیہ میں کون کون، کیا کیا؟
☆ عاصم متین خان، نمائندہ خصوصی
11-13

لاہور کے معزز اہل قلم
☆ عطرت بتول، لاہور
53-54

Feel Like
☆ غزالہ خالد
14

حیدرآباد، گجرات، میلسی، لاہور، ڈی جی خان، ملتان، بوریوالہ میں کتابوں کی دکانیں
57-67

سعیدہ افضل، پروفیسر ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی، شبیر ابن عادل نسیم انجم کی پسندیدہ کتابیں
75-81

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا؟
☆ فرید زکریا
15-18

پیراماؤنٹ بکس، اسلام آباد۔ اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی قلات پبلشرز، کوئٹہ
68-72

ڈھاکہ میں کتابوں کی دکانیں
☆ شبانہ نوید
83-84

عمر کا سورج
☆ سعیدہ افضل کی آپ بیتی
19-21

پشاور میں کتابوں کی دکانیں
☆ ناصر علی سید
73-74

تذکرہ کتابوں کا
☆ خان ظفر افغانی
91-94

سرورق کی شخصیات

☆ درمیان میں، خالد عزیز۔ کتاب میلے کے محور و مرکز

☆ دائیں سے پہلے، فاروق احمد۔ اٹلانٹس پبلی کیشنز کراچی کے سربراہ

☆ دوسرے، اقبال صالح۔ پیراماؤنٹ بکس کراچی، اسلام آباد کے سربراہ

☆ بائیں سے پہلے، عابد علی۔ مثال پبلشرز فیصل آباد کے سربراہ۔ ادبی کتابوں کی اشاعت میں پیش پیش

☆ بائیں سے دوسرے، فہیم عالم۔ بچوں کا کتاب گھر لاہور کے سربراہ۔ بچوں کے ادب کی الف لیلہ کی 20 جلدوں میں اشاعت۔ مرتبہ: نذیر انبالوی۔ کا کارنمایاں

☆ کتابوں کے حوالے سے پانچوں ہستیاں لائق تکریم ہیں

ایڈیٹر پبلشر: طارق محمود شام۔ پرنٹر: اسلم ذکی عائشہ پرنٹرز۔ مقام اشاعت : اے 262 بلاک 3 گلشن اقبال کراچی۔

خط و کتابت صرف اس پتے پر: اے 262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی۔ فون: 0300-8210636

www.atraafmagazine.com :ویب سائٹ Mahmoodshaam@gmail.com

AM
AL MASHWAN TRAVEL AND TOURS
From anywhere to anywhere
in the World
We are just a phone call away
021-34545100
0300 8220435
PLAN YOUR UMRAH NOW
JOURNEY OF THE HEART
PACKAGE INCLUDES
VISA | AIR TICKET | ACCOMODATION | GUIDES | GROUND
TRANSPORT | HISTORICAL SITES TOUR IN MAKKAH MUKARRAMA & MADINAH MUNAWARA
More information call / Whatsapp
+92 0300 8220406
+92 0300 8220407
BOOK NOW
almashwan
Address:
Plot No136 Muslim Colony, Shahrah-e-Faisal Rd, near FTC Building, Block B Sindhi Muslim CHS (SMCHS), karachi, Sindh 75350.

اہلِ تدبر کو اپنا کردار ادا کرنا ہوگا

آپ کو مبارک ہو۔آپ کا 'اطراف' اب سفر کے گیارہ سال پورے کر کے 12 ویں سال میں داخل ہوگیا ہے۔
یہ محض اس رحیم وکریم کے فضل سے ہے کہ ہم انتہائی ناسازگار حالات میں یہ طویل مسافت طے کر پائے ہیں۔
جنوری 2014 سے دسمبر 2024۔محض گیارہ سال ہیں۔لیکن اس دوران میں پاکستان سفا کی۔ بے حسی۔ بے بسی۔ بے ادبی کی صدیاں کاٹ چکا ہے۔ لائبریریاں ویران ہوچکی ہیں۔کتابوں کی دکانیں۔گارمنٹس اسٹور میں۔کباب کی دکانوں میں بدل چکی ہیں۔کئی اخبارات بند ہو چکے ہیں۔جو ہیں ان کے صفحات محدود ہو رہے ہیں۔بدزبانی ہم سب کی زبان بن چکی ہے۔کتاب کی ورق کی جگہ موبائل اسکرین لے چکی ہے۔لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ اس نئے دَور خودکار کو مصنوعی ذہانت یا عقل خودساختہ کو بھی حرف کی۔عبارت کی۔متن کی ضرورت ہے۔معاشرہ بہت عجلت میں ہے۔جرائم بڑھ رہے ہیں۔انسانی رشتے اپنا احترام کھو چکے ہیں۔اپنے خونی تعلق کا معاوضہ جائیداد میں اپنے حصّے کی صورت میں۔محلے داری معدوم ہے۔کچھ خبر نہیں ہمسائے میں کون رہتا ہے۔
شور بہت ہے کہ ریاست ماں جیسی ہونی چاہئے۔لیکن بیٹوں کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ ان کی ماں کو حکمران طبقوں نے یرغمال بنالیا ہے۔وہ بے چاری ممتا کا مظاہرہ کیسے کرے۔
غضب اور تسلط کے دَور میں حرف کی حرمت۔اظہار کی عصمت کو برقرار رکھنا ایک جہاد ہے۔
اظہار کے راستے مسدود ہو رہے ہیں۔اخبار کا وجود عدم ہو رہا ہے۔ٹی وی چینلوں کو مقبولیت کا عروج حاصل ہوا۔لیکن اب جب وہ حقائق چھپانے کا معاوضہ لینے لگے ہیں تو ان کے ناظرین بیزار ہو گئے ہیں۔ان چینلوں کو بھی اپنے مدمقابل سوشل میڈیا کا روپ دھارنا پڑ رہا ہے۔ان ے مالکان میں۔ڈائریکٹرز میں۔اینکر پرسنز میں اتنی ہمت نہیں ہے کہ وہ 'یوٹیوب' کا مقابلہ کریں۔وہ بلکہ خود یوٹیوب چینل کھول کر بیٹھ گئے ہس۔وہی اینکر پرسن یوٹیوب پر کلمہ حق کہہ رہے ہیں۔جبکہ اپنے باقاعدہ چینل پر حقائق کا اخفا کر رہے ہیں۔چینلوں پر اپنا حکم چلانے والے ان کے یوٹیوب چینلوں کو بند نہیں کروار ہے ہیں۔حکمرانوں اور میڈیا مالکان میں خاموش سمجھوتہ ہے کہ ناظرین دوسرے یوٹیوبرز کی طرف نہ جانے پائیں۔بددیانتی اپنے عروج پر ہے۔
21 ویں صدی رابطوں کی صدی ہے لیکن پاکستان میں ہم مجموعی طور پر اس صدی میں نہیں پہنچے ہیں۔ابھی تک ہمارے جاگیردار۔سردار۔حکمران طبقے پاکستانی معاشرے کو 18 ویں صدی کے تاریک دَور سے نہیں نکلنے دے رہے ہیں۔تاریخ کے پہیے کو پیچھے دھکیلا جا رہا ہے۔پاکستان کی نئی نسلیں اس بہت ہی عجیب کشمکش میں پیدا ہو رہی ہے۔پرورش پا رہی ہیں۔
صورت حال ظاہری طور پر بہت مایوس کن ہے۔ہر سمت اندھیرا ہے۔راستہ کون دکھائے گا۔پاکستان خرد افروزی کے حوالے سے بانجھ نظر آتا ہے۔صرف دانش کی بنا پر کوئی سوچ رہا ہے نہ بات کر رہا ہے۔کسی کو اپنی نوکری محفوظ رکھنے کی فکر ہے۔کوئی ریٹائرمنٹ کے بعد پنشن اور دیگر مراعات سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔نگرانی احتساب کرنے والوں۔انصاف کرنے والوں کی ملازمت کے دوران سہولتیں ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ریٹائر ہونے کے بعد بھی تنخواہیں اسی طرح ملتی رہیں گی۔وہ ملک سے باہر چلے جائیں تو انہیں یہ رعایتیں وہاں کی کرنسی میں ملیں گی۔تاجر صنعت کار کاروبار فیکٹریاں دوسرے ملکوں یں لے جا رہے ہیں۔اسٹاک ایکسچینج۔مصنوعی ذہانت سے کام لے رہی ہے
تدبر۔مروت۔تفہیم۔اصول۔قواعد۔ضوابط لغت سے نکال دیے گئے ہیں۔درباریت۔مصلحت۔سمجھوتہ۔چشم پوشی کامیابی کے اصول بن گئے ہیں۔
ایسے میں جو بھی حرف۔دانش۔تربیت۔علم۔خرد افروزی۔تصنیف۔تالیف۔تخلیق۔تحقیق سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے لائق تحسین ہے۔قابل احترام ہے۔
ہر سال کی طرح دسمبر میں اس بار بھی 'اطراف' نے کتاب نمبر کا اہتمام شایانِ شان طریقے سے کیا ہے اپنے ہمسائے بھارت سے اطراف نواز کرم فرما پروفیسر اختر الواسع نے ہماری درخواست پر پورے بھارت سے اُردو مصنّفین۔ناشرین۔کتاب فروشوں کے کوائف ہمیں فراہم کیے ہیں۔اُردو قومی زبان ہماری ہے۔لیکن اس کی آبیاری بھارت میں ہو رہی ہے۔
قومیں اپنے ادب۔ثقافت۔تہذیب سے نمو پاتی ہے۔اس میں بنیادی کردار کتاب ادا کرتی ہے۔کتاب بھی ایسی جو ایک معاشرے میں ہر لمحہ ہوتی سماجی تبدیلیوں پر روشنی ڈالے مختلف قومیتوں میں نئے پرانے رجحانات کا مطالعہ کرے۔نسل در نسل رہن سہن کا جائزہ لے۔اُردو میں بالخصوص پاکستان میں ایسی کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں۔یہ ذمہ داری یونیورسٹیوں کی ہے کہ ان موضوعات پر تحقیق کروائیں۔جن کا ربط ہمارے معاشرے سے ہو۔
پاکستان ان دنوں جس سیاسی اخلاقی آئینی عمرانی۔نفسیاتی۔سماجی بحران کا سامنا کر رہا ہے۔اس میں ایسی کتابوں کی اشاعت ایک قومی فریضہ بن جاتی ہے۔
ہزار شکر کہ ہم اپنے قارئین کے تعاون سے 'اطراف' کے صفحات کو نئی پرانی نسلوں کے امتزاج۔رجحانات کے تجزیے کا سرچشمہ بنائے ہوئے ہیں۔

محمود شام

EMPOWER
HEALING
WITH YOUR
ZAKAT

PAKISTAN EYE BANK SOCIETY
PEBS
PEBS HOSPITAL

DONATION VIA BANK DEPOSIT

FOR ZAKAT
Meezan Bank Ltd.
PK97 MEZN 0099210102450686

FOR DONATION
Allied Bank Ltd.
PK10 ABPA 0010011795080021

FREE ORAL CANCER SURGERIES
Habib Bank Ltd.
PK29 HABB 000 7860079659003

DONATE ONLINE

ST - 19/7 , Sector 14B, Shadman Town , North Karachi
Info@pakistaneyebank.org.pk www.pakistaneyebank.org.pk 0213 6908053

ڈراموں میں پولیس کا بڑھتا ہوا کردار خطرے کی علامت

تحریر: سلیم عمران

پاکستانی ڈرامے بن رہے ہیں، چل رہے ہیں، پٹ رہے ہیں اور کبھی کبھی ہٹ بھی کہلا رہے ہیں۔ کئی دہائیوں سے یہ وہ ہی چند موضوعات ہیں جنھیں بار بار بنایا جارہا ہے۔ سرمایہ دار دنیا میں کہتے ہیں کہ مقابلے کی فضا اس لئے پیدا کی جاتی ہے کہ کسی ایک کی اجارہ داری قائم نہ ہونے پائے اور کئی اجارہ دار مل کر ایک ایسا سینڈیکیٹ تشکیل دیتے ہیں کہ مارکیٹ میں مقابلے کی فضا کا تاثر بن جاتا ہے اور یہ بھی جتلایا جاتا ہے کہ اس مقابلے کے ہونے سے صارفین کو زیادہ معیاری مصنوعات ملنے کا چانس ہے کیونکہ مقابلے کے شرکا ایک دوسرے سے آگے نکلنے اور ایک دوسرے کو شکست دینے کے واسطے اپنی چیزوں کو اپنے حریف کے مقابلے میں معیاری اور سستا رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی کوئی یہ ایسی حکمت عملی ہو جس سے کچھ نہ کچھ ایسے ملکوں میں صارفین کو فائدہ پہنچ جاتا ہو جہاں کے سرمایہ دار کچھ نہ کچھ باضمیر ہوتے ہیں اور اپنی شناخت کے حوالے سے معیاری مصنوعات کے ذریعے اپنا نام بنانا چاہتے ہیں۔ لیکن پاکستان جیسے ملکوں میں سرمایہ دارانہ نظام کچھ اس طرح کام کرتا ہے کہ سارے متحارب فریقین باہمی لوٹ کھسوٹ کی حفاظت کے خیال سے ایک ایسا گروہ تشکیل دیتے ہیں جو ایک دوسرے

''گرین'' چینل کو بھی مفاداتی گروہ نے ''جیو'' بنا دیا

کے مفادات کی رکھوالی کرتا ہے اور کوئی بھی مقابلے کا فریق اپنے حریف کو شکست دینے کے لیے ایسی معیاری مصنوع بنانے کی غلطی نہیں کرتا، جو اس کے حریف کے لئے مشکلات پیدا کر سکتی ہو، چنانچہ پاکستان جیسے ملکوں میں کسی بھی شعبے میں سرمایہ دارانہ نظام مقابلہ کرتا ہوا نظر تو آتا ہے لیکن در پردہ مسابقت کی روح کہیں موجود نہیں ہے۔ جس کا بھی مال اٹھا کے دیکھ لو سب کچرا ہے اور سب ایک جیسا ہے۔

گرین نام کے چینل نے پہلے پہل یہی تاثر ناظرین کو دیا تھا کہ وہ باقی ڈراموں کے چینلز سے مختلف ڈرامے بنا کر دراصل اس جمود اور یکسانیت کو پاش پاش کرنے کے لئے میدان میں اترا ہے۔ جس سے ناظرین پوری طرح بیزار آ چکے ہیں اور انھیں پاکستان کے ''شادی ڈراموں'' سے اس حد تک نفرت ہو چکی ہے کہ نوجوانوں میں شادی نہ کرنے کا رجحان پنپنے کی خبریں آیا کرتی ہیں۔

تاہم گرین چینل کا یہ ڈھکوسلہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکا اور اس نے مفاداتی گروہ سے ہاتھ ملاتے ہوئے انھی جیسی مصنوعات یعنی ڈرامے

بنانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے مخالفین کو پھر سے گہری اور اطمینان کی نیند سونے کا موقع فراہم کر دیا اور بدلے میں اپنے ایک مفاداتی ساتھی کی کونٹینینٹ ڈپارٹمنٹ کی بی بی علینا کو باآسانی کچھ اچھا پیکج آفر کر کے گرین میں انسٹال کرا لیا ہے اور اب خیر سے جیو اور گرین دوپٹا بدل بہنوں کی طرح ایک دوسرے سے اتنا قریب ہو چکے ہیں کہ ان کی شکلیں پہچاننا مشکل معلوم ہونے لگا ہے۔ یہی نہیں مفادات کی وسعت نے جس طرح ہر شعبے کو اپنے ہی عوام کے خلاف استوار اور آراستہ کیا ہے۔ ہم ٹی وی جسے آپ چینل کی عمارت میں فروکش ہونے کے احسانات کے سائے میں اپنی کچھ نہ کچھ افرادی قوت گرین کو فراہم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ غالباً اسی لئے مصطفیٰ آفریدی جو ہم ٹی وی کے خاندانی رائٹر سمجھے جاتے تھے۔ انھوں نے گرین کے لیے ''فرار'' نامی ایک ڈراما سیریل لکھا ہے۔ اس ڈرامے کے ڈائریکٹر کوئی فلمی قسم کی مخلوق ہیں اسی لئے ڈراما شروع

ہی سے بے حد گھسے ہوئے، پٹے ہوئے فلمی زاویوں سے اٹا ہوا ہے۔ حالانکہ اس بار سید وجاحت حسین کے ساتھ شریک ڈائریکٹر مصدق ملک بھی ہیں۔ پاکستان میں جو کام کوئی ایک انسان خراب کرتا ہے اسے ٹھیک

'فرار' ڈرامہ سب نے مل کر کچرا کنڈی بنا دیا

کرنے کے لیے ایک سے زیادہ لوگ لگاؤ تو وہ سارے مل کے اس کا بیڑا غرق کرنے میں زیادہ شدت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دونوں نے مل کر اس ڈرامے ''فرار'' کو ایسا کچرا کنڈی بنایا ہے کہ دیکھنا دشوار ہے۔ ویسے ہم ٹی وی کے فیملی رائٹر مصطفیٰ آفریدی نے بھی ایسی ایسی کرامات دکھائی ہیں کہ کہنا پڑتا ہے فیملی ڈاکٹر کی طرح فیملی رائٹر بھی صرف فیملی کے لیے ہی قدرے سود مند ہوتا ہے، ذرا کسی اور چوکھٹ پر لے جا کر کھڑا کر دو اجنبیت اور ماحول کی بیگانگی سے غریب کا حال پتلا ہو جاتا ہے۔ مصطفیٰ آفریدی کی حالت بھی ایسی ہی نظر آتی ہے۔ فرار نامی اس ڈرامے کو ہمایوں سعید کی بیگم ثمینہ ہمایوں کی بیٹی ثنا شاہنواز کے پروڈکشن ہاؤس نیکسٹ لیول نے بنایا ہے۔ (ہو گیا نا ثابت کہ سرمایہ دارانہ گروہ اپنے مشترکہ مفادات کے لئے اکھٹے ہو جاتے ہیں۔) رائٹر ہم کا فیملی ٹائپ پہچان کا نمائندہ ہے۔ جبکہ نیکسٹ لیول کے زیادہ ڈرامے اے آر وائی کے لیے بنائے جاتے ہیں اور ڈائریکٹر جیو کی مزدوری زیادہ کرتے رہے ہیں لیکن اس ڈرامے کا چینل ہے ''گرین'' جس کے لئے یہ کہا جاتا ہے

کہ کوئی ایویں بھی انکار کرنا چاہے تو بڑی بہادری کی ضرورت ہے۔ اتنی بہادری تو ہمارے ہاں کہیں کبھی دیکھنے کو ملی نہیں۔ تو پھر چلو سب ایک ہی جگہ سر جوڑ لیتے ہیں۔

کراچی کا چہرہ رائٹر نے غنڈہ گردی اور بدمعاشی سے مصور کیا ہے۔ ان کا ہیرو (حمزہ علی عباسی) بھی ایک ٹارگٹ کلر ٹائپ کوئی مخلوق ہے۔ جو بعض سیاستدانوں یا ایسے ہی ناجائز دھندوں میں ملوث لوگوں کے لئے کام کرتا ہے۔ اس کی بربریت کی عکاس ذہنیت کا یہ حال ہے کہ جس لڑکی کو وہ پسند کرتا ہے اسے چھیڑنے والے تین لڑکوں کے جسموں میں اس کے چمچے ڈرل مشین سے سوراخ کرنے والے ہوتے ہیں یا ڈراتے ہیں انھیں اس اقدام سے کہ سوراخ کر سکتے ہیں۔ پاکستانی ڈراموں میں یا تو تشدد بڑھایا جارہا ہے یا پھر گھریلو گھٹیا، پسماندہ ذہنیت کو بڑھاوا دیا جارہا ہے۔ کیا بیمار ذہنوں سے نکلے ہوئے ڈرامے ہیں۔؟ (یہ سوال اکثر سنجیدہ محفلوں میں کیا جاتا ہے) رائٹر نے جو دوسرا چہرہ دکھایا ہے۔ جہاں ایک ایسے لڑکے کو فوکس کیا گیا ہے۔ جس کا تعارف ہی اس طرح ہوا ہے کہ وہ ایک تیر اندازی قسم کا کوئی مقابلہ اپنے حریف سے ہار جاتا ہے اور جیتنے والا اسے آنکھ مارتا ہے۔ جس کے جواب میں ہارنے والا اس کے ساتھ دست و گریباں ہو جاتا ہے۔ اس لڑائی کو قبیلے کے کسی بزرگ کے کہنے پر ختم کرا کے دونوں کو گلے ملنے کو کہا جاتا ہے۔ آنکھ مارنے والا حریف اس کی پشت پر ایسے ہاتھ پھیرتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ اس کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کرنے کے لئے بے قرار ہے۔

تیسرا حصہ لاہور کا دکھایا گیا ہے۔ جہاں ایک عورت کو ایک دوسری زور آور عورت نے اپنے بھائیوں کی مدد سے کرسی سے باندھا ہوا ہے اور اس کے بھائی اور وہ خود اس پر تشدد کر رہے ہیں۔ کرسی سے بندھی ہوئی عورت پر الزام ہے کہ اس نے تشدد کرنے والی عورت کے خاوند سے ناجائز رشتے بنائے ہوئے ہیں۔ یہ تشدد کرنے والی عورت نادیہ جمیل ہے۔ جو کسی زمانے میں ٹی وی ڈراموں کی بڑی اچھی اور منجھی ہوئی اداکارہ سمجھی جاتی تھیں۔ فرار میں نادیہ جمیل نے اپنی زندگی کا سب سے برا منظر اور پرفارمنس شوٹ کرائی ہے۔

اس منظر سے نادیہ جمیل ایک ہی جھٹکے میں اپنے ماضی کی بہترین کارگزاریوں کے مقابلے میں پستی میں گرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ دوسرے اہپی سوڈ میں انھی واقعات اور کہانیوں کو آگے بڑھایا گیا ہے۔ ویسے تو ان دنوں ناظرین کے ذوق اور ڈرامے دیکھنے کی صلاحیت پر سوالیہ نشانات پہلے سے لگے ہوئے ہیں کہ وہ ہمیشہ نہایت پست معیار کے اور بے پناہ دوہرائے ہوئے کچرا ڈراموں کو سر پہ بٹھا کے انھیں ہٹ کرا دیتے ہیں۔ میرا ماننا ہے کہ اس نام نہاد مقبولیت میں وہ ہوشیاریاں اور ساز باز بھی شامل ہوتا ہے کہ کیسے کسی بھی پروڈکٹ کو پروپیگنڈے کے ذریعے ناظرین کی توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ مارکٹنگ کے ماہرین کے بارے میں یہ مثل مشہور ہے کہ وہ چاہیں تو کچرے کو بھی سونا بنا کر بیچ سکتے ہیں۔ اور جب ناظرین کے پاس کوئی متوازی راستا موجود ہی نہ ہو تو وہ ان نوسر بازوں کا شکار نہ ہوں تو اور کیا کریں۔ پھر بھی فرار کے پہلے اہپی

سوڈ کے مقابلے میں دوسرے اہپی سوڈ کے یوٹیوب ویوز کم ہوئے ہیں۔ جس کا مطلب ہے کہ ناظرین کو یہ غنڈہ گردی اور تشدد کے طریقے کچھ خاص متاثر نہیں کر پائے۔ ''جنٹلمین'' نامی ڈرامے کی ناکامی کے بعد بھی گرین نے اپنی وہ روش قائم رکھی ہوئی ہے جس میں کراچی پر غنڈوں بدمعاشوں کا راج دکھایا جارہا ہے۔

'سن میرے دل' ایک دہائی پرانا مسودہ گرد جھاڑ کر حاضر

''قرض جاں'' رابعہ رزاق کا لکھا ہوا یہ ڈراما صدیوں سے مرد کے بنائے ہوئے خاندانی نظام میں پستی ہوئی عورت کا افسانہ ہے۔ جو ہمارے ہر دوسرے دوسرے ڈرامے رونا دھوتا ٹاپک ہے۔ صرف اتنا فرق ہے کہ رابعہ رزاق قانونی جنگ لڑنے کی تیاری کر رہی ہیں۔ کردار ہے یمنیٰ زیدی۔ (تیرے بن) کی کامیابی کے بعد اب ہر چینل والے نے یہ مان لیا ہے کہ کسی بھی ڈرامے میں یمنیٰ زیدی اور وہاج علی کو کاسٹ کرلیں تو ڈرامے کو کامیاب کرایا جاسکتا ہے۔ چاہے ان کے آس پاس کثرت سے ٹھکرائے ہوئے اور معمولی معاوضوں پر کام کرنے والے

اداکاروں کو ہجوم ہو۔ ایسا ہی وہاج علی کے ساتھ کیا جارہا ہے جس کی سب سے قریب ترین مثال ''سن میرے دل'' ڈراما ہے جسے خلیل الرحمن قمر کی ایک دھائی سے بھی زیادہ پرانی الماری کے گرد و غبا میں اٹے ہوئے اسکرپٹ کو جھاڑ کر وہاج علی کی مقبولیت کے سہارے پیش کیا جارہا ہے ورنہ یہ ڈراما دیکھنے کے لائق کم سے کم آج کے عہد میں تو نہیں ہے۔ قرض جاں کی اگر کوئی قابل ذکر بات ہے تو وہ یہ کہ سکینہ سموں سب سے اچھی اور ستھری اردو بولنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ ان کے الفاظ کی ادائیگی قابل تعریف کہی جاسکتی ہے۔ دوہرائے ہوئے ان ڈراموں سے کوئی نہیں جانتا کہ کیسے اور کب نجات ملے گی۔

اے آر وائی کے ڈراموں کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ کوئی بہت ہی نیک گھڑی ہوتی ہے۔ جو اس چینل کا کوئی ڈراما لائق تعریف اور دیکھنے کے قابل ہو۔ اس بار ہم ذکر کر رہے ہیں ایک ایسے ڈرامے کا جس کا نام ہے ''اے عشق جنون'' مجنوں کے یہ وارث عشق سے کم پر تو بات ہی نہیں کرتے۔ سب سے زیادہ عشق اور محبت کے عنواتات اے آر وائی کے ڈراموں کے رکھے جاتے ہیں۔

ان کے عنوانات رکھنے والے تاجروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ نوجوانوں کی یہی ایک ایسی شہ رگ ہے جسے جب بھی دبائیں گے تو اس سے لہو ضرور ٹپکے گا۔ اے عشق جنوں۔ سعدیہ اختر نے لکھا ہے اور قاسم علی مرید نے اس کی ڈائریکشن دی ہے۔ بے شمار انگریزی فلموں اور ہندوستانی ویب سیریز میں دوہرایا ہوا یہ منظر کہ لڑکی کو کسی امیر زادے نے ہٹ اینڈ رن کیس میں کچل دیا ہے اور بدلے میں اس امیر لڑکے کا کوئی باپ یا ماں اسے بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لڑکی ہوسپٹل میں اپنی زندگی کی جنگ لڑ رہی ہے چونکہ اس ڈرامے میں یہ لڑکی ہیروئن اشنا شاہ ہے۔ تمام ناظرین کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ اگلی تمام اقساط میں بھی اگر اس لڑکی کو ہٹ کیا گیا، گاڑی سے کچلا گیا تب بھی۔ یہ چالیس اقساط پوری کئے بغیر مرنے والی تو نہیں ہے۔ مذکورہ ڈرامے میں یہ نظر آرہا ہے کہ مارنے والے کا بھائی اس لڑکی کا عاشق بننے والا ہے۔ بہر حال ایسے حماقت سے بھرے ڈرامے دیکھنا اور پھر ان پر لکھنا کتنی اذیت کا کام ہے۔ یہ وہ ہی سمجھ سکتا ہے جو اس قسم کے پستیوں میں گرے ہوئے بار بار کے دوہرائے ہوئے ڈراموں کو دیکھنے پر مجبور ہیں۔ اور دیکھ کر تھکتے ہیں نہ باز آتے ہیں۔ پاکستان میں ترقی کیوں نہیں ہوتی کیونکہ لوگ ایک جیسے معاشی حالات سے تنگ آکر اس کی بنیادوں کو اکھیڑ پھینکنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ بنگلہ دیش میں غلط یا صحیح ظلم کے نظام کے خلاف بہر حال لوگوں نے اپنی زندگیوں کو داؤ پر لگایا اور اسے اکھاڑ پھینکنے میں کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آپ دیکھتے رہیں گے اور ہم لکھتے رہیں گے۔ جن کی تجوریاں اس سرکس، اس تماشے سے مسلسل بھر رہی ہیں۔ جب آپ انھیں تنبیہ ہی نہیں کرنا چاہتے۔ تو وہ کیوں باز آنے لگے۔ تینوں ڈراموں میں پولیس کا رول بڑھتا ہوا دکھائی دیا، جس سے اب پاکستانی ڈرامے اس نئی بھیڑ چال کی طرف راغب ہیں کہ پولیس گردی بھی ڈرامے کا کوئی نیا تخلیقی زاویہ ہوسکتا ہے!

Enroll Now
DIHE
DIHE
DADABHOY INSTITUTE
OF HIGHER EDUCATION
PROGRAMS
BUSINESS MANAGEMENT
BBA (2 & 4 YEARS)
ADBM (2 YEARS)
REHABILITATION SCIENCES
DPT (5 YEARS)
ADPT (2 YEARS)
LAW
LLB (5 YEARS)
OUR FACILITIES
Library
Cafeteria
Air Conditioned Classrooms
Labs
About US
The Dadabhoy Institute of Higher Education (DIHE) is a chartered degree-awarding institute established in 2003. It offers well-designed academic programs taught by qualified faculty. DIHE aims to provide a unique educational experience, integrating academic excellence, and best practices. Its programs focus on developing skills for future success, with hands-on learning and experiential knowledge.
For Further Information Contact
021-34389103-06
0336-5417958
SNPA-17/B, Block 3, K.C.H.S. Lal Muhammad Chaudry Road, Hill Park, Karachi.
www.dadabhoy.edu.pk
admission@dadabhoy.edu.pk

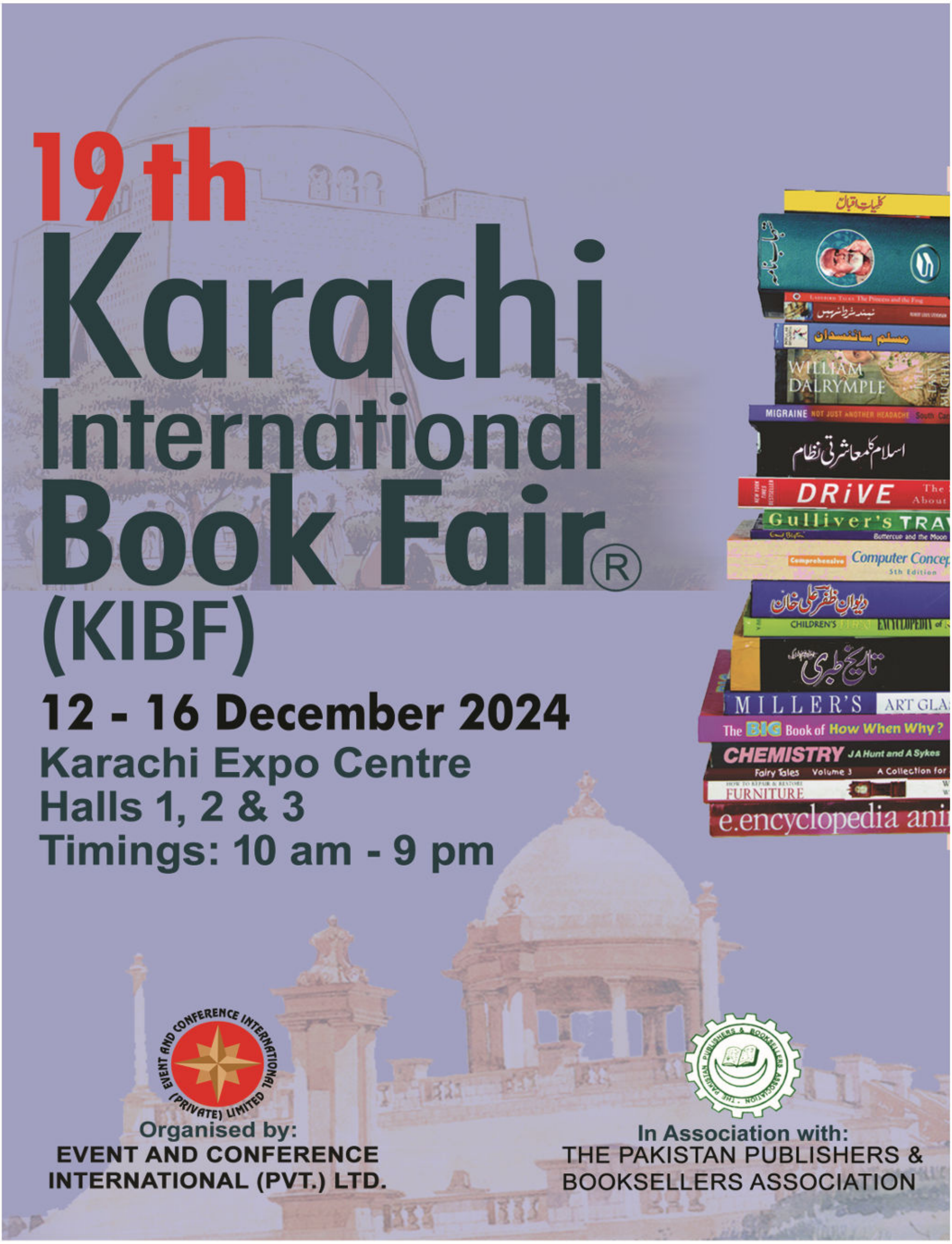
19 th
Karachi
International
Book Fair®
(KIBF)
12 - 16 December 2024
Karachi Expo Centre
Halls 1, 2 & 3
Timings: 10 am - 9 pm
EVENT AND CONFERENCE INTERNATIONAL (PRIVATE) LIMITED
Organised by:
EVENT AND CONFERENCE
INTERNATIONAL (PVT.) LTD.
In Association with:
THE PAKISTAN PUBLISHERS &
BOOKSELLERS ASSOCIATION

زیادہ تر تنگ نظر۔قوم پرست۔قدامت پسند

کیاامریکی آئین ٹرمپ کی مطلق العنانی کوقابو میں رکھ سکے گا

امریکہ میں 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی عاصم متین خان کی انتہائی اہم تجزیاتی رپورٹ

5 نومبر کے امریکی انتخابی نتائج کے بعد سے جس تیزی سے ڈونلڈ ٹرمپ کے وزراء اور مشیروں کے چہرے سامنے آتے جا رہے ہیں اس سے امریکہ کا جمہوری چہرہ بھیانک ہوتا جارہا ہے نہ صرف امریکہ میں خوف بلکہ دنیا بھر کے دارالحکومتوں میں ایک غیر یقینی کی صورتحال ہے۔اس کی وجہ ان عہدوں کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ کے ان وفاداروں کا انتخاب ہے جو تنگ نظر،قوم پرستانہ پالیسی اور قدامت پسندانہ ایجنڈے کے زبردست حامی ہیں اور امریکہ کے لبرل اور جمہوری خیالات سے متصادم ھیں۔ ان وفاداروں کی اکثریت ان سفید فاموں کی ہے جو دوسری قوموں اور مذاہب کے لوگوں کو کمتر بھی سمجھتی ہیں اور اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ امریکی مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جانا جائز ہے۔ان کی اس فکر کی خوفناک جھلک کو 6 جنوری 2021 کو دنیا بھر نے دیکھا تھا جب ٹرمپ کے حامیوں نے واشنگٹن پر دھاوا بول دیا تھا۔ٹرمپ کے ان ناتجربہ کار وفاداروں کے انتخاب پر ریپبلیکن پارٹی کے سینیئر رہنما بھی متفکر ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے حامی دنیا بھر میں نہ صرف امریکہ کا چہرہ بگاڑ دیں گے بلکہ ریپبلیکن پارٹی کا بھی جنازہ نکال دیں گے۔اب 20 جنوری کے بعد نئی امریکی انتظامیہ کے وجود میں آنے کے بعد دنیا امریکہ کا ایک نیا چہرہ دیکھے گی جس کے بارے میں وثوق سے کچھ کہنا ابھی قبل از وقت ہوگا۔

آج رونلڈ ریگن کی گرجتی آواز جس میں انہوں نے گورباچوف سے دیوار برلن کو گرانے کے لیے کہا تھا لگتا ہے وہ آواز آج دیوار برلن کے ملبے تلے کہیں دب چکی ہے اور پتہ نہیں کب تک دبی رہے گی۔امریکہ قومی رہبانیت میں جارہا ہے۔نفرت،تعصب اور نسل پرستانہ نعروں کے زور منتخب ہونے والے ڈونلڈ ٹرمپ کی فتح پر ایک امریکی مبصر کے خیال میں یہ معاشیات کی زبان میں تخلیقی تباہی ہے جس میں نیا آنے والا یہ بتاتا ہے موجودہ نظام عوامی خواہشات کو پورا نہیں کرتا اور ان کو

> **تلسی گیبرڈ 17انٹیلی جنس ایجنسیوں کی نگرانی کریں گی**

ناکامی کی طرف لے جارہا ہے اور نیا آنے والا امریکی جمہوریت کو تباہ کردے گا۔

ٹرمپ کے حامی یہ سمجھتے ہیں کہ آج سے 35 برس قبل سرد جنگ کے کامیاب خاتمے کے بعد آنے والی امریکی لیڈرشپ اور بالخصوص جو بائیڈن امریکہ کو ناکامیوں کی طرف لے گئے۔اور ڈونلڈ ٹرمپ اس ناکام اسٹیبلشمنٹ کے خلاف ہیں تبدیلی کا پیش خیمہ ہیں اور وہ امریکہ میں Radical تبدیلیاں لے کر آئیں گے جو امریکہ کو اس کی عظمت رفتہ پر واپس لے جائینگی۔اگرچہ ڈونلڈ ٹرمپ سے جمہوری اقدامات کی امید کم ہے لیکن امریکہ میں ایک امید ضرور ہے اور وہ یہ کہ امریکی آئین ایک مضبوط دستاویز ہے۔امریکی آئین سازوں کو اندازہ تھا کہ ایک دن امریکہ میں ایک مطلق العنان سربراہ اگر آ گیا تو اس کو کس طرح حکومت کے دوسرے ادارے چیک اینڈ بیلنس میں رکھیں گے اور امریکی آئین کی پہلی شق شہریوں کو قانونی دائرے میں رہتے ہوئے اظہار رائے کا مکمل حق دیتی ہے اور وہ امریکی جمہوریت کا دفاع کریں گے !

ڈونلڈ ٹرمپ جن لوگوں کا انتخاب کررہے ہیں وہ متعصب ذہنیت کے تنگ نظر لوگ ھیں۔ان کی قابلیت بھی کم ہے، تجربہ بھی کم ہے لیکن ایک بہت اہم چیز ہے وہ ان کی ڈونلڈ ٹرمپ سے وفاداری۔اور اکثر وزارتوں کو ان وفاداریوں کے صلے کے طور پر ہی تقسیم کیا جارہا ہے۔

اٹارنی جنرل کے عہدے کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ نے فلوریڈا کے میٹ گائز کا انتخاب کیا ہے جو کہتے ہیں کہ ایف بی آئی سمیت امریکی وزارت انصاف کو ختم کردینا چاہیے اگر وہ ٹرمپ کے خلاف اپنی تحقیقات بند نہیں کرتے۔2020 کے انتخابی نتائج کے خلاف میٹ گائز نے سب سے زیادہ شور مچایا۔اور انتخابات کے بعد جب ٹرمپ کے حامیوں کے جس جتھے نے واشنگٹن پر دھاوا بولا وہ اس جتھے کو فخر سے حب الوطن امریکیوں کا جتھہ کہتے ہیں۔اور وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی ڈونلڈ ٹرمپ کے خلاف کچھ کرے گا تو ہم دیکھ لیں گے۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے حامی کہتے ہیں کہ میٹ گائز وزارت انصاف کو قابو میں کرلیں گے جس نے ڈونلڈ ٹرمپ کو تنگ کر کے رکھا۔

وزیر دفاع کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ نے پیٹ ھیگسٹ کا انتخاب کیا ہے۔

مارکو روبیو

تلسی گیبرڈز

مائیک ہکابی

ٹرمپ انتظامیہ میں کون، کیا کیا؟

یہ اس فوکس نیوز پر ایک اینکر رہے ہیں جو ہمیشہ ٹرمپ کا حامی رہا ہے۔ ھیگسیٹ افغانستان اور عراق میں لڑ چکے ہیں لیکن ان کی قابلیت پینٹا گون کے لئے بالکل نہیں ہے۔ ان کے انتہا پسندانہ خیالات کی وجہ سے 2021 میں صدر جو بائیڈن کی تقریب حلف برداری سے ان کو ہٹا دیا گیا تھا۔ انہوں نے اپنے جسم پر سفید فام اکثریت کا نشان بھی کھدار کھا ہے۔ جو ان کی نسلی منافرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔
ڈائریکٹر نیشنل انٹیلیجنس کے لئے ریاست ہوائی سے تعلق رکھنے والی تلسی گیبرڈ کو ڈونلڈ ٹرمپ نے منتخب کیا ہے۔ وہ 17 مختلف انٹیلیجنس

سوزی وائلز

ایجنسیوں کے کام کی نگرانی کریں گی۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے تلسی گیبرڈ کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا کہ وہ طاقت کے ذریعے امن قائم کریں گی۔ ڈونلڈ ٹرمپ کے اعلان سے پہلے تلسی گیبرڈ کی کوشش تھی کہ ان کو وزیر دفاع کا عہدہ مل جائے۔ تلسی گیبرڈ ناتجربہ کار تھی ھیں اور کئی مواقع پر وہ امریکہ کی خارجہ پالیسی کے خلاف بھی خیالات کا اظہار کرتی رہی ہیں جس میں انہوں نے روسی صدر پیوٹن اور شام کے بشر الاسد کی حمایت کی۔ لیکن ڈونلڈ ٹرمپ سمجھتے ہیں کہ تلسی گیبرڈ اس سیاسی کھیل کو ختم کر دیں گی جس میں انٹیلیجنس ایجنسیز کو ڈونلڈ ٹرمپ کے خلاف استعمال کیا جاتا رہا ہے۔
ڈپٹی چیف اُف اسٹاف کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے پہلے دور حکومت کے مشیر، ان کی تقریر لکھنے والے اسٹیفن ملر ڈپٹی چیف اف اسٹاف کے عہدے کے لئے منتخب کیا ہے جو خاص طور پر امیگریشن سے متعلق معاملات پر نظر رکھیں گے۔ اسٹیفن ملر کے ساتھ تھامس ہومان بھی کام کریں گے تا کہ امریکی سرحدوں سے غیر قانونی تارکین وطن کے داخلے کو روکا جائے۔ ان دونوں کا سب سے بڑا کام یہ ہوگا کہ امریکہ میں مقیم غیر قانونی تارکین وطن کو امریکہ سے بڑے پیمانے پر نکالا جائے گا اور اس سلسلے میں اسٹیفن ملر نے دو سال سے ایک پلان بنا رکھا ہے کہ وہ کس طرح سے غیر قانونی تارکین وطن کی بے دخلی کریں گے۔ غیر قانونی تارکین وطن کو چھاپے مار کر کیمپوں میں رکھا جائے گا اس کے بعد انہیں ملک بدر کیا جائے گا۔ اور ان چھاپوں کا آغاز 20 جنوری کو ڈونلڈ ٹرمپ کے صدر کے عہدہ سنبھالتے ہی شروع کیا جائے گا۔
مشیر قومی سلامتی کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ نے ساؤتھ ڈکوٹا کی گورنر 52 سالہ کرسٹی نوم کو منتخب کیا ہے۔ یہ دیگر ایجنسیوں کے ساتھ مل کر غیر قانونی تارکین وطن کے خلاف کام کریں گی اور امیگریشن کے قوانین کو سخت کرنے پر توجہ دیں گی 2021 میں انہوں نے افغانستان سے آنے والے تارکین وطن کو اپنی ریاست میں جگہ دینے سے انکار کر دیا تھا اور ان کو روکنے کے لیے اپنی ریاست کے نیشنل گارڈز کو ٹیکساس کے بارڈر پر لگا دیا تھا جس کا خرچہ سرکاری طور پر نہیں بلکہ پرائیویٹ ڈونرز نے دیا تھا۔ کرونا وائرس کی وباء کے دوران انہوں نے اپنی سیاست میں کم سے کم پابندیاں لگائی تھیں۔
مستقل مندوب برائے اقوام متحدہ کے لئے ریاست نیو یارک سے تعلق رکھنے والی ہارورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل 40 سالہ ایلیس اسٹیفنک کو ڈونلڈ ٹرمپ نے منتخب کیا ہے۔ وہ 30 سال کی عمر میں کم عمر ترین خاتون ممبر کانگریس منتخب ہوئی تھیں۔ وہ جارج بش جونیئر کی انتظامیہ میں داخلہ پالیسی کی معاون کے طور پر کام کر چکی ہیں۔ یہ

> **غیر ملکی تارکین وطن پر کڑا وقت آنے والا ہے**

ڈونلڈ ٹرمپ کے مواخذے کے وقت ان کی زبردست حامی تھیں۔ تاہم ان کو خارجہ پالیسی کے معاملات میں کوئی تجربہ نہیں۔ لیکن یہ اسرائیل کی زبردست حامی ھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ اقوام متحدہ میں یہودی مخالفت کرنے والے لوگوں کا جمگھٹا ہے اور ہمیں اقوام متحدہ کے فنڈز کو روکنا چاہیے جو فلسطینیوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انہوں نے امریکی تعلیمی اداروں میں اسرائیل مخالف مظاہروں کی سخت مخالفت کی اور ہارورڈ، کولمبیا اور پینسلوانیا یونیورسٹی کے صدور کو ان کی نوکریوں سے نکلوا دیا کہ وہ ان مظاہروں کو کنٹرول کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مئی میں اسرائیلی دورے کے دوران وہ پارلیمنٹ سے بھی خطاب کر چکی ہیں۔ ٹرمپ کے ہم خیالوں کی طرح یہ بھی چین کی سخت مخالف ھیں۔ اور یوکرین کی جنگ سے امریکی امداد کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ ان کے انتخاب پر یہودی لابی بہت خوش ہے اور ان کا کہنا ہے کہ اسٹیفنک کے انتخاب کی خبر سے اقوام متحدہ میں موجود سفارت کاروں کی خوف سے چیخیں نکل گئیں۔ اسٹیفک کا خیال ہے کہ اقوام متحدہ میں چینیوں نے اپنے مفاد کے لیے جال بچھا رکھا ہے جس کو وہ ختم کریں گی۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سلامتی کونسل میں ویٹو پاور کو استعمال کر کے دکھائیں گی جو بائیڈن ایڈمنسٹریشن نہیں کر سکا۔
ریاست آرکنساس کے گورنر مائک حکابی کو ڈونلڈ ٹرمپ نے اسرائیل کے لیے امریکی سفیر منتخب کیا ہے۔ ان کے انتخاب پر اسرائیلی حلقوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ حکابی اسرائیل کے پرزور حمایتی ہیں اور ان کا انتخاب اس بات کا بھی عندیہ دیتا ہے کہ ڈونلڈ ٹرمپ کے آنے کے بعد بھی اسرائیل کی طرف امریکہ کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں ائے گی اور غزہ میں جاری آپریشن نہ صرف جاری رہے گا بلکہ اس میں اور تیزی آئے گی تا کہ اسرائیل کے تمام جارحانہ مقاصد کو حاصل کیا جا سکے۔ ان کا انتخاب اسرائیل کے لیے آرام اور سکون کا باعث بنے گا تاہم مشرق الوسطیٰ کے دیگر ممالک کے لیے ایک پریشانی ہوگی۔ مائک حکابی کہتے ہیں کہ فلسطین کا کوئی وجود نہیں ہے یہ سارا علاقہ اسرائیل کے لیئے ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ اسرائیل اور فلسطینی مسئلے کے حل کا دو قومی نظریہ اب شاید کھٹائی میں پڑ جائے گا۔
نمائندہ برائے مشرق وسطیٰ کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ نے اسٹیون وٹکاف کو اپنا نمائندہ مقرر کیا ہے۔ یہ ڈونلڈ ٹرمپ کے قریب ترین دوست رہے ہیں اور ان کے ساتھ گولف بھی کھیلتے رہے ہیں انہوں نے ڈونلڈ ٹرمپ کی انتخابی مہم کے لیے کئی ملین ڈالر جمع کیے۔
وائٹ ہاؤس نیشنل سیکیورٹی مشیر کے عہدے کے لئے ڈونلڈ ٹرمپ نے مائک والٹز کو منتخب کیا ہے۔ ان کو اس عہدے کے لیے سینٹ سے کنفرمیشن کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ مائک والٹز چین کو امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ امریکہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ چین کی بڑھتی ہوئی پیش قدمی کو ھر صورت میں روکے۔ اور اگر ہم نے چین کو ابھی نہیں روکا تو ہم چین کا ایسا روپ دیکھیں گے جو ہم نے شاید پہلے کبھی نہیں دیکھا ہو۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ فوجی طور پر امریکہ کو چین سے مقابلہ کرنے کی پوزیشن میں ہونا چاہئے۔ یوکرین کی جنگ میں روس کو بھی سبق سکھانا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یوکرین کو دی جانے والی بڑی امداد اگر امریکہ کے مفاد میں نہیں ہے تو اسے روکنا چاہیے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسرائیل کو تمام دہشت گرد گروپوں کو ختم کرنا ہوگا۔
وائٹ ہاؤس چیف آف سٹاف کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ نے سوزی وائلز کو منتخب کیا ہے۔ جو امریکہ کی تاریخ میں وائٹ ہاؤس کی پہلی خاتون

چیف آف سٹاف ہوں گی۔ یہ انتہائی اہم عہدہ ہوتا ہے جو صدر کے تمام رازداری معاملات سے آگاہ ہوتا ہے اور ہر قدم پر صدر کی مشاورت کا کام انجام دیتا ہے کہ کس طرح سے صدر کو اپنے ایجنڈے پر کام کرنا ہے اور کن ذرائع کو استعمال کرنا ہے۔ وائٹ ہاؤس کا چیف آف سٹاف یہ بھی فیصلے کرتا ہے کہ امریکی صدر کو کس سے ملنا ہے کتنی دیر تک ملنا ہے اور کیا بات کرنی ہے اور اگر یوں کہا جائے کہ وائٹ ہاؤس کا چیف آف اسٹاف امریکی صدر کی شخصیت کو بناتا ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ اس عہدے پر فائض شخص امریکی صدر کو یہ بھی بتادیتا ہے کہ میں یہ نہیں سننا چاہتا۔ سوزی وائلز نے ڈونلڈ ٹرمپ کی انتخابی مہم کے دوران ان کے ساتھ کام کیا اور ان کو مستقل گائیڈ کیا اور پانچ نومبر کی رات کو انتخابات جیتنے کے بعد بھی ٹرمپ نے سوزی وائلز اسٹیج پر خاص طور پر بلایا تھا۔ سوزی وائلز نے ڈونلڈ ٹرمپ کو یہ بھی مشورہ دیا ہے کہ وہ ایک نرم عوامی امیج رکھیں تاکہ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔ اس کے علاوہ انہوں نے یہ بھی عندیہ دیا کہ ٹرمپ اپنے اس دور اقتدار میں کوشش کریں گے کہ امریکی صدر کے عہدے کے لیے قائم دو مدت کے قانون کا خاتمہ کیا جائے تاکہ وہ تیسری بار بھی صدر کے عہدے کے لیے کھڑے ہوسکیں۔ ساتھ میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ مشی گن میں ہونے والی ڈونلڈ ٹرمپ کی ریلی آخری انتخابی ریلی نہیں تھی۔ سوزی وائلز نے پچھلے 40 سال میں واشنگٹن سے باہر ہی کام کیا ہے اور شاید انہیں واشنگٹن کے سیاسی مزاج کو سمجھنے میں وقت لگے لیکن وہ ٹرمپ کے مزاج سے بخوبی واقف ہیں۔

سوزی وائلز نے 5 نومبر کے بعد ڈونلڈ ٹرمپ کے انتخابی فنڈ میں امداد دینے والے بڑے ڈونرز کو ایک پرائیویٹ پارٹی میں یقین دہانی کرائی کہ ٹرمپ اپنا صدارتی حلف اٹھانے کے فوراً بعد چند ایگزیکٹو آرڈرز کو دوبارہ نافذ کردیں گے جن کو صدر بائیڈن نے مؤخر کردیا تھا۔ یاد رہے کہ صدر بائیڈن نے ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن اور معاہدہ پیرس میں دوبارہ شمولیت اور اور مسلمان ممالک سے آنے والے تارکین وطن پر ڈونلڈ ٹرمپ کی عائد کردہ پابندی کو ختم کیا تھا۔ سوزی وائلز نے یہ بھی کہا کہ جو کام ڈونلڈ ٹرمپ کو اس صدارتی دور میں چار سال میں کرنے ہیں وہ ان کو سرعت کے ساتھ پہلے دو سال میں کریں گے۔

وائٹ ہاؤس پریس سیکرٹری کے لیے ڈونلڈ ٹرمپ نے کم عمر ترین 27 سالہ کیرولین لیوٹ کو منتخب کیا ہے۔ وہ ٹرمپ کی انتخابی مہم کے درمیان ٹرمپ کی پریس سیکرٹری بھی رہی ہیں۔

مشیر برائے حکومتی کارکردگی جنوبی افریقہ کی نسل پرست زمین سے تعلق رکھنے والے ایلون مسک اور انتہائی تنگ نظر سابق صدارتی امیدوار بھارتی نژاد ویوک رامسوامی کو حکومتی کارکردگی کو بہتر بنانے کے لیے ایک نئے سرکاری شعبے کا انچارج بنایا جائے گا، اس شعبے کا بنیادی مقصد غیر ضروری حکومتی اخراجات اور بڑھتی ہوئی بیوروکریسی کو کنٹرول کرنا، اور غیر ضروری قواعد وضوابط کو ختم کر کے سرکاری ایجنسیوں کی افعالیت کو بڑھانا ہے۔ اگرچہ سرکاری طور پر اس شعبے کی کوئی منظوری نہیں لی گئی ہے تاہم 20 جنوری کے بعد معلوم ہوگا کہ اس شعبے کے خدوخال کیسے ہیں اور یہ کس طرح سے کام کرے گا اور اس کے باقاعدہ قیام سے قبل سے اس کی منظوری بھی لینا ہوگی تاہم اس شعبے کی ساخت کچھ ایسی ہوگی کہ ایلون مسک اور رام سوامی اپنی

ایلیس اسٹیفنک

ذاتی کاروباری ذمہ داریوں پر بھی توجہ دے سکیں گے۔ ایلون مسک نے ڈونلڈ ٹرمپ کو انتخابی مہم کے اخراجات کے لیے 100 ارب ڈالر سے زیادہ کا فنڈ دیا۔ سوامی اگرچہ ہارورڈ اور Yale یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہیں لیکن ان کے نظریات انتہائی قدامت پسندانہ ہے۔

فلوریڈا سے تعلق رکھنے والے کیوبن نژاد سینیٹر مارکو روبیو کو وزارت خارجہ کے عہدے کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ وہ سینیٹ کی انٹیلی جنس کمیٹی کے نائب سربراہ کے طور پر کام کرتے رہے ہیں اور وہ خارجہ

چین دشمن، ایران مخالف
اسرائیل دوست کابینہ

تعلقات کی کمیٹی کے بھی رکن رہے ہیں۔ وہ بھی ٹرمپ کے دیگر ہم خیال وفاداروں کی طرح چین اور ایران کو امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔ بلکہ وہ چین کو روس سے بھی زیادہ بڑا خطرہ سمجھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چین کے مقابلے کے لیے ہمیں اپنی تمام تر صنعتی قوت کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔ مارکو روبیو اسرائیل کے بڑے حامی مسلمان دشمن نظریات کے حامل ہیں۔ انکا جھکاؤ بھارت کی طرف زیادہ ہے جس کی وجہ سے ان کی طرف سے پاکستان کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھنے کا کوئی امکان نہیں۔ طاقت کے ذریعے امن قائم کرنے پر یقین رکھنے والے نئے امریکی سیکریٹری خارجہ ایران اور چین سے متعلق سخت موقف اپنانے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ روبیو چین کو امریکا کا سب سے بڑا ترقی یافتہ مخالف سمجھتے ہیں۔

رواں برس جولائی میں سینیٹر مارکو روبیو اس وقت بھی خبروں میں آئے تھے جب انہوں نے امریکی سینیٹ میں انڈیا کی حمایت اور پاکستان کی مخالفت میں ایک بل متعارف کروایا تھا، اس بل میں کہا گیا تھا کہ انڈیا کیخلاف بڑھتی ہوئی جارحیت کو روکا جائے۔ ان کے خیالات خارجہ پالیسی سے متعلق ڈونلڈ ٹرمپ کے 'سب سے پہلے امریکا' سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ وہ امریکی مفادات کے لئے اسرائیل کو نہایت اہم دوست سمجھتے ہیں وہ کہہ چکے ہیں کہ امریکا کا کردار اسرائیل کو کام ختم کرنے کے لیے درکار فوجی سامان فراہم کرنے کا ہونا چاہئے۔

چین کے صدر شی نے بھی امریکہ میں آنے والی تبدیلیوں کو سمجھتے ہوئے پیرو میں صدر بائیڈن سے ہونے والی ملاقات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نئی امریکی انتظامیہ کو یہ پیغام دیا کہ عقلمندانہ فیصلے کیجئے وہ راستہ اختیار کیجیے جو دو بڑی طاقتوں کو ایک ساتھ چلنے کے لیے صحیح ہو۔ یاد رہے کہ پچھلے چار سالوں میں صدر بائیڈن نے نرمی کے ساتھ چین کے ساتھ تعلقات کو بڑھانے پر توجہ دی ہے لیکن ٹرمپ شاید ایسا نہ کرسکیں۔

چین اور امریکہ کے درمیان شروع ہونے والی متوقع معاشی جنگ نہ صرف چین اور امریکہ کو متاثر کرے گی بلکہ اس کا نقصان دنیا بھر میں محسوس کیا جائے گا۔ معاشی مصرین کا خیال ہے کہ اگر ٹرمپ صدر منتخب نہ بھی ہوتے تو بھی چین کے ساتھ امریکہ کی معاشی جنگ کی شروعات ہونی ہی تھی کیونکہ چین ایک ذمہ دار معاشی سپر پاور کا رول ادا کرنے میں ناکام رہا ہے لیکن اس معاشی جنگ میں چین کے ساتھ معاملات کو طے کرنے کے لیے ٹرمپ انتہائی غیر مناسب شخصیت ہیں۔ ٹرمپ کی خام خیالی ہے کہ چین کی مصنوعات پر ٹیرف کا اضافہ کرنے سے صارفین کو کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اس معاشی جنگ سے امریکہ کا ہر گھر متاثر ہوگا کیونکہ امریکہ میں مہنگائی بڑھ جائے گی۔ اور امریکی کمپنیوں نے تو ممکنہ ٹیرف کے اضافے کے پیش نظر اپنی مصنوعات کی قیمتوں میں اضافہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یورپ میں بھی اس ممکنہ معاشی جنگ کے پیش نظر اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ یوکرین میں جاری روس کی جنگ سے جرمنی پہلے ہی پچھلے دو سال سے سخت معاشی پریشانی میں مبتلا ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ نے اس بات کا بھی عندیہ دیا ہے کہ وہ یورپی مصنوعات پر بھی 10 سے 20 فیصد تک ٹیرف میں اضافہ کریں گے کیونکہ یورپی ممالک امریکی مصنوعات کو نہیں خریدتے اس سے تجارتی بیلنس متاثر ہوتا ہے۔

آنے والے چند مہینے نہایت اہم ہوں گے جہاں نئی امریکی انتظامیہ کی پالیسیوں کے نتیجے میں معاشی بھونچال بھی آئیں گے اور مختلف محاذوں پر جاری جنگوں میں بھی تیزی آئے گی۔ بڑی طاقتوں کی جنگ لڑنے والے چھوٹے ممالک کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔ اگلے چار سال تک ہر میدان میں امریکی انتظامیہ کا ہر فیصلہ وسیع تر امریکی مفادات سے جڑا ہوگا، نئے اتحادات اور الحاقات بنیں گے، چھوٹے ممالک کو اپنے دوست اور دشمن کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ شائد ایک نئی سرد اور گرم جنگ شروع ہونے کو ہے ہر ملک کو اپنے قومی مفادات کا ازسرنو جائزہ لیکر مشکل فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ اس نئی جنگ میں کس طرف ہیں!

نند کون ہے بھاوج کون؟

اَن کہی کی مصنّفہ غزالہ خالد کی
'اطراف' کے لیے شگفتہ شگفتہ سطور

اللہ کی شان دیکھئے کہ جو خود ووٹ نہیں ڈال سکتے تھے وہ صدر بن چکے ہیں اب چاہے کسی کو اچھا لگے یا برا لیکن نومبر کی سب سے خاص بات یہ ہی تھی کہ" ٹرمپ امریکہ کے صدر بن گئے ہیں" بھئی ابھی تک کی تو یہی اطلاع ہے اب اگر امریکہ میں بھی فارم 47 ہوتے ہوں تو ہمیں نہیں معلوم !!لیکن سنا ہے ٹرمپ نے تو Feel like صدر امریکہ" شروع بھی کر دیا ہے اس لئے ہمیں قوی امید ہے کہ وہاں فارم 47 نہیں ہوتے ہونگے۔ پاکستان میں ان کے صدر بننے پر Feel like۔" کہیں خوشی کہیں غم" یعنی متضاد کیفیات ہیں لوگوں کا خیال ہے کہ ٹرمپ چین اور پاکستان میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں اس لئے پاکستانی سیاست پر بھی ان کے صدر بننے کے اہم اثرات ضرور دیکھنے کو ملیں گے۔ اب ہمیں" انتظار کرو اور دیکھو" پر عمل کرتے ہوئے انتظار ہی کرنا ہے کہ دیکھتے ہیں ان کا صدر بننا پاکستان کے حق میں کیسا ثابت ہوتا ہے سو ہم بھی Feel like خوش گمانی کرتے ہوئے بے چینی سے ان کے حلف اٹھانے کا انتظار کر رہے ہیں۔

موسم پر بات کریں تو نومبر کا مہینہ ہمیشہ سے سردیوں کو خوش آمدید کہنے والا مہینہ کہلاتا تھا۔ پنجاب میں تو سردی آ ہی جاتی تھی لیکن کراچی والے بھی بدلتے موسم کی ٹھنڈی ہوتی ہوئی ہواؤں سے خوش ہو جاتے تھے لیکن اس بار تو حد ہی ہو گئی یعنی نومبر نے آسانی کر دی کہ ہمارے اس کالم کے عنوان کو استعمال کرنے میں لفظوں کا کم از کم ہیر پھیر کرنا پڑے اس لئے 2024 کا نومبر کراچی میں تو Feel like جون جولائی ہی رہا تپتی دھوپ اور آگ برساتے سورج کے بعد کراچی کی نمی سے پسینہ بھی برقرار رہتا البتہ نومبر کے آخر تک آتے آتے فجر کے وقت کچھ خنکی محسوس ہوئی اس لئے امید ہے کہ سردی بھی شاید آ ہی جائے گی۔

رہا لاہور اور گرد و پیش تو ان کا تو پوچھیں ہی نہیں۔

زمیں سے آسماں تک کیا کہوں یار
دھوئیں سے ہو گیا عالم دھواں دار

اسموگ نے شہریوں کی زندگی اجیرن کر دی سفر کرنا تو مشکل ہوا ہی تھا سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ اسپتال مریضوں سے بھر گئے سانس کے مریضوں کی تعداد میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا۔

ہمیں تو حیرت یہ ہوتی ہے کہ یہ اسموگ پہلے کیوں نہیں ہوتی تھی؟

حکومت کا کہنا ہے کہ یہ سب چاول کی فصل کی کارستانی ہے کہ جس کی باقیات جلانے سے اسموگ میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ہمارے ایک وزیر با تدبیر نے ہی اس کی نفی کر دی ان کا کہنا تھا کہ چاول کی فصل کی باقیات تو ہمیشہ سے جلائی جاتی ہیں ہمارے ہاں تو عوام کو ٹرک کی بتی کے پیچھے لگا دیا جاتا ہے"

اس بیان کے بعد ٹرک کی بتی کے پیچھے لگے عوام فوراً رک گئے اور Feel like" حیران پریشان" ہو گئے کہ اس بات سے کیا مطلب نکالا جائے۔ حکومت کی اسموگ پر قابو پانے کی کوششیں بھی خوب رہیں ان پر بھی عوام ایکدوسرے کی شکلیں دیکھتے رہے یعنی بار بی کیو پر پابندی لگانے کی باتیں شروع کر کے اہل لاہور کا دل توڑا گیا شاید اسی لئے لوگ باگ ایکدوسرے

سیاسی شخصیات بیمار بیمار پکارنا کیوں شروع کر دیتی ہیں؟

سے کہتے ہوئے پائے جا رہے ہیں کہ یہ" اسموگ" انڈیا کی ڈبل سازش ہے جس کے ذریعے ایک تو وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم گوشت کم از کم کھائیں، دوسرے بیمار الگ پڑیں سانس کے مریض بنیں، آوازیں بھرا جائیں، دل کمزور ہو جائیں اور" دلی پہ لہرائے گا جھنڈا پاکستان کا" جیسے بھولے بھٹکے نعرے بھی ہمارے مونہہ سے نہ نکل سکیں حالانکہ جس کے اپنے ملک کی سلامتی کے لالے پڑے ہوں وہاں کے عوام تو اس قسم کے نعرے کب کے بھول بھال بھی چکے ہیں انہیں تو اب صرف تین وقت کی روٹی یاد ہے۔ سنا ہے کہ بارش کا انتظار ہے کہ جس کے ہوتے ہی یہ اسموگ وسموگ سب پلک جھپکتے غائب ہو جائے گی مصنوعی بارش برسانے کی خبریں بھی سننے کو مل رہی ہیں اہل لاہور سے گذارش ہے کہ اگر بارش ہو جائے تو Feel like" ساون" کر کے مستانے کی ضرورت نہیں یہ بارش بھی ہر چیز کی طرح نقلی ہو گی۔

عوام حاکموں کی باتوں سے کچھ بھی Feel Like کر سکتے ہیں

ادھر لاہور والے دھند سے پریشان تھے اور ادھر کراچی میں دفاعی نمائش 2024 کی تیاریاں عروج پر تھیں جو 19 سے 22 نومبر تک جاری رہی اور جس کی وجہ سے کراچی والے باؤلے بنے ہوئے تھے سفر کرنے والوں کو فلائٹ سے چار چار گھنٹے پہلے ایئر پورٹ پہنچنے کی ہدایات تھیں اور شہر میں سفر کرنے والے ہر وقت اسی فکر میں ڈوبے رہتے تھے کہ کون سا راستہ بند ہے اور کونسا کھلا اب ہم پھر کہیں گے کہ کراچی والے Feel like" قیدی" کر رہے تھے تو آپ لوگ پھر قیدی نمبر پوچھنا شروع کر دیں گے اس لئے اس بات کو یہیں روک دیا جائے تو بہتر ہو گا دعا ہی کر سکتے ہیں کہ کاش ایسی نمائشیں شہر سے باہر ہوا کریں تو عوام پریشانی سے بچ جائیں۔

ارے ہاں! وہ مسئلہ بھی تو حل ہو گیا جو دو تین ماہ سے چل رہا تھا یعنی ووٹنگ ہو گئی اور اپنے مطلب کے فیصلے آ گئے اب دیکھنے میں یہ آیا کہ اس کے بعد سب بڑی بڑی سیاسی شخصیات نے Feel like" بیمار بیمار" شروع کر دیا اور لائن سے سب ایک ایک کر کے ڈاکٹر کو دکھانے ملک سے باہر جانے لگے، جو بیمار نہیں تھے وہ ایئر پورٹ پر پہنچ کر بیمار ہو گئے اور پھر ان کے" بچہ لوگ" ان کی عیادت کو ان کے پاس پہنچ گئے یوں نومبر کا مہینہ سیاسی چھٹیوں کا مہینہ بن گیا ترس تو ان پر آیا جو بیچارے اپنی بھاری ذمے داریوں کے سبب Feel like بیمار بیمار تو کرتے رہے لیکن ملک چھوڑ کر بھاگ نہیں سکے کیونکہ آخر ملک بھی تو چلانا تھا ناں۔

اب خود سوچیں احتجاج کی سیاست عروج پر ہے اگر سب ہی بیمار ہو جاتے تو ان سر پھروں کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا جو ہر ماہ باہر نکل کر شور مچانے کو تیار ہوتے ہیں اب اس کے لئے کسی کو تو رکنا ہی تھا۔

ہماری وزیر اطلاعات نے بڑے مزے کی بات کہہ دی۔ انہوں نے کہا کہ احتجاج کرنے والوں کی حکومت سے لڑائی ایسی لڑائی ہے جیسی کہ" نند بھاوج" کی لڑائی ہوتی ہے۔

پہلے تو ہم نے شکر ادا کیا کہ" نند بھاوج" سے ہی تشبیہہ دی خدانخواستہ" ساس بہو" نہیں کہہ دیا کیونکہ تازہ ترین دلخراش خبر کے مطابق تو ساس نے بہو کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے میں ذرا دیر نہیں لگائی تھی بہرحال" نند بھاوج" سے تشبیہہ پر بھی بات سادہ ہونے کے باوجود ہمیں تو گمبھیر ہی لگی یعنی ہم Feel like" کنفیوز کنفیوز" ہو گئے وہ اس لئے کہ اس بیان کے بعد ہمارے ذہن میں نت نئے سوالات آ گئے۔

پہلی بات تو یہ کہ ہماری سمجھ میں نہیں آ سکا کہ نند کون ہے اور بھاوج کون؟

بھائی اگر وہی ہے جو جیل میں ہے تو بھاوج ہی کیوں چاہ رہی ہے کہ وہ آزاد ہو نند کیوں نہیں چاہتی کہ اس کا بھائی جیل سے نکلے؟

بھائی کو پکڑنے والے کون لوگ ہیں؟

اور وہ کیوں نہیں چاہتے کہ بھائی جیل سے نکلے؟

وہ کون سے خطرات تھے کہ جن کی وجہ سے بھائی کو جیل میں ڈالا گیا؟

اور وہ کونسے خدشات ہیں کہ جن کی وجہ سے بھائی کو نہیں نکالا جا رہا؟

یعنی کہ اس بیان کے بعد سوالات ہی سوالات ہیں جو دماغ میں آ گئے ہیں اسی لئے تو کہتے ہیں کہ بھئی سوچ سمجھ کر بولنا چاہیئے ہم" عوام" ہیں جو آپ کی باتوں سے Feel like" کچھ بھی" کر سکتے ہیں۔

ملک کے حالات وہی ہیں احتجاج کی تاریخیں آتی رہتی ہیں اب بھی آ رہی ہیں حکومت کا کام یقیناً اسے روکنا ہے اس لئے اس کے بھی نت نئے طریقے آ رہے ہیں لیکن ہماری ناقص رائے میں اب ارباب اختیار کو اس کا کوئی مستقل حل سوچ لینا چاہیئے ہم معصوم Feel like" خوفزدہ خوفزدہ" ہو کر خبردار کر رہے ہیں کہ بھائیوں ایک بار پھر دیکھ لو، سوچ لو اور سمجھ لو کہ

راستے بند کئے دیتے ہو" ایوانوں" کے
ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے

اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کو برے حالات وواقعات سے محفوظ رکھے اور اسے ترقی کی شاہراہ پر گامزن فرمائے آمین۔ ❁

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا

حالیہ امریکی انتخابات میں یہ خدشہ رہا ہے کہ کیا امریکہ اب عالمی طاقت نہیں رہے گا۔ کیا اب وہ عالمی قیادت نہیں کر سکے گا۔ 'اطراف' کو فخر ہے کہ وہ اہم عالمی کتابوں کے اُردو ترجمے کے ذریعے قارئین 'اطراف' کو آنے والے خطرات، حالات اور تجربات سے باخبر رکھتا ہے۔ یونیورسٹیوں میں ایسی تحریریں بہت پسند کی جا رہی ہیں۔ فرید ذکریا بھارتی نژاد ہیں۔ مگر ان کی تصنیفات معروضی عالمی حیثیت رکھتی ہیں۔ عرفان علی یوسف بہت ذمہ داری سے ان کی فکر کو ہماری زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔

پیسے کے بڑھتے ہوئے ڈھیر۔ کریڈٹ سستا۔ اثاثے مہنگے

چوتھی قسط

تحریر: فرید ذکریا   تلخیص و ترجمہ: سید عرفان علی یوسف

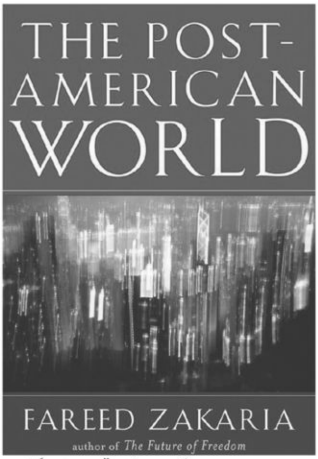

کافی مسائل:

پچھلی دو دہائیوں سے، ہم نے بہت زیادہ وقت، توانائی اور توجہ عالمی معیشت میں بحرانوں اور خرابی اور دہشت گردی، جوہری بلیک میلنگ، اور جغرافیائی سیاست میں جنگ کے بارے میں فکر کرنے میں صرف کی۔ یہ فطری ہے۔ بدترین کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری اسے روکنے میں مدد کر سکتی ہے۔ افریقہ، دنیا بھر میں دہشت گردی، مشرقی ایشیا،

مہنگائی 200 سال کی بلند ترین سطح پر

روس، اور سب سے خطرناک امریکہ کے معاشی بحرانوں کا مقابلہ ممکن ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم مطابقت پذیر عالمی ترقی کی دنیا میں رہ رہے ہیں۔

عالمی ترقی ہمارے دور کی بڑی کہانی ہے۔ اس میں لیکویڈیٹی میں اضافے کی وضاحت ہے جو دنیا بھر میں پیسے کے بڑھتے ہوئے ڈھیر ہیں۔ اس نے کریڈٹ کو سستا اور اثاثوں (بشمول رئیل اسٹیٹ، اسٹاک اور بانڈز) کو مہنگا کر دیا ہے۔ اس وقت، کم اجرت والے ممالک میں تیزی نے افراط زر کو بہت زیادہ بڑھنے سے روک دیا ہے۔ ہندوستان اور چین کے بارے میں سوچنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ دو عظیم عالمی تنزلی مشینیں، سامان (چین) اور خدمات (انڈیا) کو باہر نکالتی ہیں جو مغرب میں پیداواری خدمات کے لیے لاگت کا ایک حصہ ہیں۔ مرکزی بنکوں کو افراط زر کے بارے میں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں اور وہ تقریباً دو دہائیوں سے کم مفادات کو برقرار رکھنے میں کامیاب رہے ہیں، یہ ایک غیر معمولی طویل وقت ہے۔ بلاشبہ، کم شرح سود اور سستا کریڈٹ بھی لوگوں کو بے وقوفانہ یا لالچ سے کام کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ٹیکنالوجی اسٹاکس، ہاؤسنگ، سب پرائم مارگیجز، یا ابھرتی ہوئی مارکیٹ ایکویٹی کے بلبلوں کو بڑھاتے ہیں جو آخر کار پھوٹ جاتے ہیں۔ دنیا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہے، اور مالیاتی آلات زیادہ غیر ملکی ہوتے جا رہے ہیں۔ بہت سے مبصرین کو خدشہ ہے کہ ترقی اور اعتماد کا نیا چکر خوف و ہراس اور افسردگی میں بدل سکتا ہے۔ لیکن بحرانوں کا خاتمہ انتہائی تکلیف دہ ہے، ترقی کے متنوع نئے ذرائع اور نئے سرمائے کی بڑی

دبئی مشرقِ وسطیٰ کا سنگاپور بن گیا ہے

مقدار نے عالمی اقتصادی نظام کو مجموعی طور پر زیادہ لچک فراہم کی ہے۔ تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں پر غور کریں۔ تیل کا جھٹکا (2000 سے 2010 کی دہائی تک کیسے بیان کیا جائے؟) پچھلے زمانوں سے مختلف رہا ہے۔ ماضی میں قیمتوں میں اضافہ ہوا کیونکہ تیل پیدا کرنے والے ممالک OPEC نے سپلائی کو مصنوعی طور پر محدود کر دیا تھا اور اس طرح پٹرول کی قیمت میں اضافہ ہوا تھا۔ حالیہ برسوں میں، اس کے برعکس، چین، بھارت اور دیگر ابھرتی ہوئی منڈیوں کی مانگ کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ دنیا میں مسلسل، بڑے پیمانے پر مانگ کی وجہ سے قیمتیں بڑھی ہیں۔ قیمتیں اس لیے بڑھ رہی ہیں کیونکہ معیشتیں بڑھ رہی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ معیشتوں میں پیداواری صلاحیت کو بہتر بنا کر (اور ایک حد تک، صارفین تک پہنچانا) بڑھتی ہوئی لاگت کو سنبھالنے

کینیڈا بڑی سمجھداری سے بڑی طاقت بن رہا ہے

کی طاقت اور لچک ہے۔ نتیجتاً قیمتوں میں اضافہ آسانی سے ہضم ہو گیا ہے۔ اگر ہم نے 2001 میں پیشنگوئیاں کرنے والے سے تیل کی قیمتوں میں چار گنا اضافے کے اثرات پر بات کی ہوتی تو وہ عالمی کساد بازاری کی پیش گوئی کرتا۔

یہ صرف تیل ہی نہیں ہے جو مزید مہنگا ہو گیا ہے۔ اشیاء کی قیمتیں بھی 200 سال کی بلند ترین سطح پر ہیں۔ ہر قسم کا خام مال تیزی سے مہنگا ہو رہا ہے۔ زرعی پیداوار اب اتنی مہنگی ہو گئی ہے کہ ترقی پذیر ممالک کو بڑھتے ہوئے سیاسی مسئلے کا سامنا ہے کہ خوراک کی افراط زر کا جواب کیسے دیا جائے؟ تعمیراتی لاگت نیویارک سے، دبئی سے، شنگھائی تک بڑھ کر انتہا پر پہنچ گئی ہے۔ یہاں تک کہ ہلکی گیس، ہیلیم، جو نا صرف پارٹی غباروں میں استعمال ہوتی ہے بلکہ ایم آر آئی مشینوں اور مائیکرو چپ فیکٹریوں میں بھی استعمال ہوتی ہے، عالمی سطح پر اس کی فراہمی بہت کم ہے اور یہ کائنات میں دوسرا سب سے زیادہ موثر عنصر ہے۔ یہ دباؤ یقیناً کسی وقت کم مہنگائی کے دور کو ختم کر دے گا جس نے عالمی خوشحالی کو زیر دست کر رکھا ہے۔ دریں اثنا، مستحکم ترقی نے کئی بے ضابطگیوں کو بھی پیدا کیا ہے۔ بڑھتی ہوئی عالمگیریت اور نظم و ضبط کی حامل دنیا کے اندر، بعض ممالک جن کے پاس وافر قدرتی وسائل ہیں، خاص طور پر پیٹرولیم اور قدرتی گیس تقریباً مفت ہے۔ وہ عالمی نمو کی لہر پر سرفنگ کر رہے ہیں اور

جب امریکہ عالمی طاقت نہیں رہے گا

عالمی سطح پر حکمرانی کرنے والے زیادہ تر قوانین کی پابندی کیے بغیر امیر ہو رہے ہیں۔

امریکہ اور بین الاقوامی نظام کے مغربی نظریات کے لیے بنیادی سیاسی چیلنجوں پر غور کریں۔ یہ چیلنج مشرق وسطیٰ میں ایران سے، لاطینی امریکہ میں وینزویلا سے اور یوریشیا میں روس سے آتے ہیں۔ سب کے پاس تیل پر قائم نئی طاقت ہے۔ سوڈان کی دارفور پر دنیا کو شکست دینے کی صلاحیت کا اس کے تیل کے ذخائر کی عدم موجودگی میں تصور کرنا مشکل ہے۔ 2006 میں ایران کا تیل 50 ارب ڈالر تھا جو مفاد پرست گروہوں کی سرپرستی کرنے، فوج کو رشوت دینے اور اقتدار میں رہنے کے لیے کافی تھا جب کہ بیرون ملک پریشانیوں کو ہوا دینے کے لیے وسائل باقی تھے۔ اس صورتحال میں تبدیلی کا امکان نہیں۔ وسائل سے مالا مال ممالک اس وقت ترقی کر رہے ہیں۔ یہ سب آج کی عالمگیریت کے 'ین اور یانگ' کی وجہ سے ہے۔

اچھے معاشی انتظام پر مبنی ماحول نے کچھ لوگوں کو اپنی دولت کو پہلے سے زیادہ سمجھداری سے استعمال کرنے پر مجبور کیا ہے۔ کنیڈا ایک بڑی طاقت بن رہا ہے، اور انتہائی ذمہ داری سے کام کر رہا ہے۔ خلیج فارس میں، جہاں تیل کی بہت زیادہ آمدنی ہوتی ہے، سوئس بنک اکاؤنٹس اور مونٹی کارلو کیسینو کے بجائے انفراسٹرکچر اور صنعت میں زیادہ منافع کمانے کے لیے سرمایہ کاری ہو رہی ہے۔ دبئی مؤثر طریقے سے چلنے والے، دوستانہ کاروبار کو فروغ دے رہا ہے اور، مشرق وسطیٰ کا سنگاپور بن گیا ہے۔ دیگر خلیجی ریاستیں اب اس کی تقلید کر رہی ہیں۔ سعودی عرب، جس نے کئی دہائیوں سے اپنی وسیع دولت کا غلط استعمال کیا ہے، نئے پیٹروکیمیکل پراجیکٹس میں 70 ارب ڈالر کی سرمایہ کاری کا ارادہ رکھتا ہے، جس کا مقصد پیٹروکیمیکل بنانے والا ایک سرکردہ ملک بننا ہے۔ خلیجی ریاستوں نے پچھلے پانچ سالوں میں 1 ٹریلین ڈالر کی سرمایہ کاری کی ہے، اور میک کینسی اور کمپنی کا اندازہ ہے کہ وہ مزید 2 ٹریلین ڈالر کی سرمایہ کاری کر سکتی ہیں۔

اگلی دہائی میں یہ سرمایہ کاری ایک ریاست کی طرف سے ہدایت کی شکل میں ہوگی، جس کے نتیجے میں ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی۔ (یورپی اور مشرقی ایشیائی سرمایہ کاری میں بھی مضبوط ریاستی ہدایت والے عناصر موجود ہیں)۔ لیکن یہ روس سے سعودی عرب تک ان ممالک کے معاشی نظام کے مقابلے میں عالمی سرمایہ دارانہ اصول کے بہت قریب ہے۔

قدرتی وسائل اور ماحولیات پر عالمی نمو کا گہرا اثر ہے۔ یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں کہ دنیا میں صاف ہوا، پینے کا صاف پانی، زرعی پیداوار اور بہت سی اہم اجناس ختم ہو رہی ہیں۔ ان میں سے کچھ مسائل کو کارکردگی بہتر بنا کر اور سپلائی کے نئے ذرائع تیار کر کے حل کیا جا سکتا ہے، لیکن پیش رفت بہت سست ہے۔ مثال کے طور پر زرعی پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن آٹھ ارب کی عالمی آبادی کو کھانا کھلانے کے لیے، فصل کی پیداوار کو آج کے تین ٹن سے چار ٹن فی ہیکٹر تک پہنچانے کی ضرورت ہوگی، یہ ہدف ہم 2025 تک حاصل کر لیں گے۔ اسی طرح، پانی کو سنبھالنے اور اسے محفوظ کرنے کی ہماری صلاحیت اتنی تیزی سے نہیں بڑھ رہی جتنی تیزی سے ہماری کھپت بڑھ رہی ہے۔ بیسویں صدی میں دنیا کی آبادی میں تین گنا اضافہ ہوا، لیکن پانی کی کھپت چھ گنا بڑھ گئی۔ امریکی روزانہ چار سو لیٹر سے زیادہ پانی پینے، کھانا پکانے اور نہانے دھونے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

> **انسان کی پانی سنبھالنے کی صلاحیت تیزی سے نہیں بڑھ رہی**

آج غریب ممالک میں لوگ خوش قسمت ہیں کہ وہ چالیس کی عمر تک پہنچ جائیں، لیکن جیسے جیسے وہ امیر ہوتے جائیں گے، ان کے بڑھتے ہوئے مطالبات زیادہ تناؤ کا باعث بنیں گے۔ تاریخی طور پر، غریب ملکوں میں آبادی پانی کی تلاش کے لیے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتی ہے۔ اگر مستقبل میں پانی کے ذرائع خشک ہو گئے تو لاکھوں لوگ نقل مکانی پر مجبور ہو جائیں گے۔

پچھلی دہائی کے دوران، موسمیاتی تبدیلی کے اثرات کے بارے میں

بہت سی پیشین گوئیاں تخمینوں کے تحت درست ثابت ہوئی ہیں کیونکہ عالمی ترقی تمام تخمینوں سے تجاوز کر گئی۔ تازہ ترین موسمیاتی تبدیلی پر بین الحکومتی پینل کا جائزہ 2007 کے وسط میں جاری کیا گیا تھا۔ سال کے آخر تک، سائنس دانوں نے ظاہر کیا تھا کہ

> **معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ قوم پرستی بھی بڑھتی ہے**

قطبی برف کے ڈھکن اس رپورٹ کی توقع سے دوگنا تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ بجلی، کاروں، اور ہوائی جہازوں کی اس سے زیادہ مانگ ہے جتنا پندرہ سال پہلے کسی نے سوچا تھا اور یہ تناسب بڑھتا رہتا ہے۔ McKinsey Global Institute کا منصوبہ ہے کہ 2003 سے 2020 تک چین میں گاڑیوں کی تعداد 2.6 کروڑ سے بڑھ کر 12 کروڑ ہو جائے گی۔ اور پھر ہندوستان، روس، اور مشرق وسطیٰ میں بھی یہی تناسب ہے۔

کئی دہائیوں تک بجلی کی طلب میں سالانہ 4 فیصد سے زیادہ اضافے کا امکان ہے اور یہ بجلی زیادہ تر گندے ایندھن یعنی دستیاب کوئلے سے بنے گی۔ کوئلہ سستا اور وافر مقدار میں ہے، اس لیے دنیا اپنی زیادہ تر بجلی پیدا کرنے کے لیے اس پر انحصار کرتی ہے۔ گلوبل وارمنگ کے اثرات کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت پر غور کریں۔ 2006 اور 2012 کے درمیان، چین اور بھارت کوئلے سے چلنے والے آٹھ سو نئے پاور پلانٹس تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ کاربن ڈائی آکسائڈ کے اخراج کے ساتھ کیوٹو معاہدے کی کل بچت سے پانچ گنا زیادہ ہے۔

قوم پرستی کا عروج:

گلوبلائزڈ دنیا میں، تقریباً تمام مسائل سرحدوں پر پھیلتے ہیں۔ چاہے وہ دہشت گردی ہو، جوہری پھیلاؤ، بیماری، ماحولیاتی انحطاط، اقتصادی بحران یا پانی کی کمی ہو، کوئی بھی مسئلہ بہت سے ممالک کے درمیان ہم آہنگی اور تعاون کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن جب معاشیات، معلومات اور یہاں تک کہ ثقافت بھی گلوبلائز ہو چکے ہیں، رسمی سیاسی طاقت مضبوطی سے قومی ریاست سے جڑی ہوئی ہے، یہاں تک کہ قومی ریاست ان میں سے زیادہ تر مسائل کو یکطرفہ طور پر حل کرنے کے قابل نہیں ہے۔ اور تیزی سے، قومی ریاستیں ہی مسائل حل کرنے کے لیے اکٹھے ہونے پر تیار نہیں۔

عام مسائل:

. جیسے جیسے سرکاری اور غیر سرکاری کھلاڑیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا ہے اور ہر ایک کی طاقت اور اعتماد بڑھتا ہے تو معاہدے اور مشترکہ کارروائی کے امکانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ یہ باقیوں کے عروج کا مرکزی چیلنج ہے۔ عالمی ترقی کی قوتوں کو عالمی انتشار اور انحطاط کی قوتوں میں تبدیل ہونے سے روکنا ضروری ہے۔

دوسری قوموں کے درمیان فخر اور اعتماد کا عروج، خاص طور پر سب سے بڑی اور کامیاب قوموں میں، آسانی سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ چند سال پہلے شنگھائی کے ایک انٹرنیٹ کیفے میں یہ واضح طور پر دکھایا گیا تھا، جہاں میں ایک نوجوان چینی ایگزیکٹو کے ساتھ بات چیت کر رہا تھا۔ وہ اپنے ملک میں ہونے والی غیر معمولی ترقی اور ایک ایسے مستقبل کو بیان کر رہے تھے جس میں چین جدید اور خوشحال ہوگا۔ وہ لباس اور برتاؤ میں پوری طرح مغربی تھا، بہترین انگریزی بولتا تھا، اور امریکی پاپ کلچر کے بارے میں تازہ ترین کاروباری رجحانات یا گپ شپ پر آرام سے بات کر سکتا تھا۔ وہ عالمگیریت کی مکمل پیداوار لگ رہا تھا۔ وہ ایسا شخص ہے جو ثقافتوں کو جوڑتا ہے اور دنیا کو ایک چھوٹی، زیادہ کاسموپولیٹن جگہ بناتا ہے۔ لیکن جب ہم نے تائیوان، جاپان اور ریاستہائے متحدہ کے بارے میں بات کرنا شروع کی تو اس کے جوابات پتھروں سے بھر گئے۔ انہوں نے برہم لہجے میں وضاحت کی کہ اگر تائیوان نے آزادی کا اعلان کرنے کی جسارت کی تو چین فوری طور پر اس پر حملہ کر سکتا ہے۔ چینیوں نے کہا کہ جاپان ایک جارح ملک ہے جس پر کبھی بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے یقین تھا کہ 1999 میں کوسوو جنگ کے دوران امریکہ نے جان بوجھ کر چینی سفارت خانے پر بمباری کی، تاکہ چینی عوام کو اپنی فوجی طاقت سے خوفزدہ کیا جا سکے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مجھے ایسا لگا جیسے

سعودی عرب کی بادشاہت کی امریکی حمایت کیا منافقت نہیں ہے

میں برلن میں تھا، اور ایک نوجوان جرمن پیشہ ور سے بات کر رہا تھا، جو ان دنوں مکمل طور پر ماڈرن اور قوم پرست بھی تھا۔

جیسے جیسے معاشی ترقی ہوتی ہے، ویسے ہی قوم پرستی بھی بڑھتی ہے۔ یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ تصور کریں کہ آپ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جو صدیوں سے غریب اور غیر مستحکم رہا ہے۔ اور پھر، آخرکار، حالات بدل جاتے ہیں اور آپ کی قوم عروج پر ہے۔ آپ کو دیکھ کر فخر اور بے چینی ہوگی۔ پہچان اور احترام کی یہ خواہش پوری دنیا میں بڑھ رہی ہے۔ یہ بات متضاد لگ سکتی ہے کہ عالمگیریت اور معاشی جدیدیت سیاسی قوم پرستی کو جنم دے رہی ہے۔ ایسا صرف اس صورت میں ہے جب ہم قوم پرستی کو ایک پسماندہ نظریے کے طور پر دیکھیں، جو یقینی طور پر ترقی کے آگے بڑھنے سے مٹ جائے گا۔

قوم پرستی نے ہمیشہ امریکیوں کو پریشان کیا ہے۔ جب ریاستہائے متحدہ خود کو بیرون ممالک میں شامل کرتا ہے، تو وہ ہمیشہ یہ مانتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر دوسرے ممالک کی مدد کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ فلپائن اور ہیٹی سے لے کر ویت نام اور عراق تک، امریکی کوششوں پر مقامی باشندوں کے ردعمل نے امریکیوں کو حیران کر دیا ہے۔ امریکی اپنے ہی ملک پر اپنی جائز حب الوطنی پر فخر کرتے ہیں۔ جب دوسرے لوگ اپنی حب الوطنی پر فخر کرتے ہیں تو امریکی چونک جاتے ہیں۔ (انہیں جو چیز اپنے لیے پسند ہے وہ دوسروں کے لیے پسند نہیں)۔

ہندوستان میں برطانیہ کی حکمرانی کے زوال کے دنوں میں، آخری وائسرائے لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستانی رہنما مہاتما گاندھی سے کہا، ''اگر ہم صرف یہاں سے چلے گئے تو افراتفری پھیل جائے گی۔'' گاندھی نے جواب دیا، "ہاں، لیکن یہ ہماری افراتفری ہوگی۔" مداخلت کے بغیر کسی کے "اپنی" کے ذریعہ حکومت کرنے کا یہ احساس ابھرتے ہوئے ممالک میں ایک طاقتور احساس ہے، خاص طور پر وہ جو کبھی مغرب کی کالونیاں یا نیم کالونیاں تھے۔

Zbigniew Brzezinski نے حال ہی میں اس طرف توجہ دلائی جسے وہ ''عالمی سیاسی بیداری'' کہتے ہیں۔ انہوں نے بڑھتے ہوئے عوامی جذبوں کی طرف اشارہ کیا، جو کہ مختلف قوتوں کی وجہ سے ہوا، اقتصادی کامیابی، قومی فخر، تعلیم کی اعلیٰ سطح، زیادہ سے زیادہ معلومات اور شفافیت، اور ماضی کی یادیں۔ بریزینسکی نے اس نئی طاقت کے خلل

انگیز پہلوؤں کو نوٹ کیا۔ "زیادہ تر ترقی پذیر دنیا کی آبادی میں سیاسی طور پر ہلچل ہے۔"

بہت سی جگہیں بدامنی کا شکار ہیں، "انہوں نے لکھا، "ہم سماجی ناانصافی کے بارے میں بے مثال حد تک آگاہ ہیں ... یہ توانائیاں خود مختار سرحدوں کو عبور کرتی ہیں اور موجودہ ریاستوں کے ساتھ ساتھ موجودہ عالمی تنظیمی ڈھانچے کے لیے بھی ایک چیلنج کا باعث بنتی ہیں، جس کے اوپر امریکہ اب بھی موجود ہے۔"

مغربی دنیا سے باہر بہت سے ممالک میں مایوسی پھیلی ہوئی ہے کہ انہیں عالمی تاریخ کے ایک مکمل مغربی یا امریکی بیانیے کو قبول کرنا پڑا جو غلط تھا۔ روسیوں نے طویل عرصے سے دوسری جنگ عظیم کے بارے میں معیاری بیانیہ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جسے برطانیہ اور ریاستہائے متحدہ، فاشسٹ جرمنی اور جاپان کی نسلیں پسند نہیں کرتیں۔ اسٹیفن ایمبروز سے لے کر کین برنز تک کے مرکزی دھارے میں شامل امریکی تاریخی اکاؤنٹس کو دیکھتے ہوئے، امریکیوں کو یہ یقین دلایا جا سکتا ہے کہ روس نے ہٹلر اور توجو کے خلاف فیصلہ کن لڑائیوں میں معمولی کردار ادا کیا۔ (حالانکہ ایسا نہیں تھا) درحقیقت مشرقی محاذ دوسری جنگ عظیم کا مرکزی میدان تھا۔ اس میں جنگ کے دیگر تمام تھیٹروں سے زیادہ زمینی لڑائی شامل تھی اور اس کے نتیجے میں تین کروڑ اموات ہوئیں۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں تمام جرمن افواج کا تین چوتھائی حصہ لڑا اور جہاں جرمنی نے اپنی 70 فیصد ہلاکتیں برداشت کیں۔ یورپی محاذ کئی لحاظ سے ایک سائیڈ شو تھا، لیکن مغرب میں اسے مرکزی تقریب کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ مصنف بینجمن شوارز نے اشارہ کیا ہے، اسٹیفن امبروز نے سسلی پر امریکی-برطانوی حملے پر بہت زیادہ توجہ دلائی، جس نے 60,000 جرمنوں کو جزیرے سے نکال دیا، لیکن کرسک کو تاریخ کی سب سے بڑی جنگ کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیا، جس میں کم از کم ڈیڑھ کروڑ سوویت یونین اور جرمن لڑے، اور جو بالکل ایک ہی وقت میں پیش آیا۔ نازی جرمنی کے خلاف جنگ مشرقی محاذ پر لڑی گئی۔ عظیم فوجی مورخ جان ایرکسن نے اسے 'اسٹالن کی جنگ' کہا۔ یا نقشے پر کسی اور جگہ سے اسی جنگ کے تناظر پر غور کریں۔ ایک ہندوستانی دوست نے مجھے سمجھایا، ''برطانیہ اور امریکہ کے لیے، دوسری جنگ عظیم ایک بہادرانہ جدوجہد تھی جس میں برائی پر فتح پائی۔ ہمارے لیے، یہ ایک ایسی جنگ تھی جس کے لیے برطانیہ نے ہم سے مشورہ کیے بغیر ہندوستان اور اس کی مسلح افواج کو استعمال کیا۔ ''لندن ہمیں آزادی دینے کے خیال سے مرنے کے لیے کہتا تھا اور بے دردی سے ہمیں آزادی دینے سے انکار کر رہا تھا۔"

اس طرح کے مختلف قومی نقطہ ہائے نظر ہمیشہ سے موجود رہے ہیں، لیکن زیادہ تعلیم، معلومات اور اعتماد کی بدولت، ابھرتی ہوئی دنیا کے نئے نیوز نیٹ ورکس، کیبل چینلز، اور انٹرنیٹ سائٹس پر بڑے پیمانے پر مختلف

نظریات پھیلا رہے ہیں۔ بہت سے لوگ "باقی "مغرب کے بیانیے، دلائل اور مفروضوں کو الگ الگ کر رہے ہیں اور دنیا کے بارے میں ایک مختلف نقطہ نظر کے ساتھ ان کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ "جب آپ ہمیں کہتے ہیں کہ ہم سوڈان میں تیل تک رسائی کے لیے ایک آمریت کی حمایت کرتے ہیں تو ایک نوجوان چینی اہلکار نے مجھے 2006 میں بتایا، "میں جو کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ قرون وسطیٰ کی بادشاہت کے لیے آپ کی حمایت سے کیسے مختلف ہے؟ سعودی عرب کی حمایت میں ہم آپ کی منافقت دیکھتے ہیں، لیکن کچھ نہیں کہتے۔

ماہرین سیاسیات نازنین برما، ایلی رتنر، اور اسٹیون ویبر بتاتے ہیں، ایسی دنیا میں جہاں ہر کوئی خود کو بااختیار محسوس کرتا ہے، ممالک اس مغربی "مرکز" کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے اور ایک دوسرے کے ساتھ اپنے تعلقات استوار کرنے کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ امریکہ کے بعد کی دنیا میں، ہوسکتا ہے کہ اس میں ضم ہونے کے لیے کوئی مرکز نہ ہو۔ امریکی وزیر خارجہ جیمز بیکر نے 1991 میں کہا تھا کہ دنیا ایک حب اینڈ سپوک سسٹم کی طرف بڑھ رہی ہے، لیکن ہر ملک اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے امریکہ سے گزرتا ہے۔ اکیسویں صدی کی دنیا کو پوائنٹ ٹو پوائنٹ روٹس میں سے ایک کے طور پر بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے، جس میں ہر روز نئے فلائٹ پیٹرن بنائے جاتے ہیں۔ یہ سچ ہے: صرف دس سالوں میں، چین آنے والے روسی سیاحوں کی تعداد میں چار گنا سے زیادہ اضافہ ہوا، (جو 1995 میں 489,000 سے بڑھ کر 2005 میں 2.2 ملین ہو گیا۔) دیگر ممالک اپنے عروج کی کہانی میں دلچسپی لے رہے ہیں اور مغرب اور امریکہ پر کم توجہ دیتے ہیں۔ دنیا غصے سے بے حسی کی طرف بڑھ رہی ہے، یعنی امریکہ دشمنی سے مابعد امریکن ازم کی طرف گامزن ہے۔

یہ حقیقت کہ نئی طاقتیں اپنے مفادات پر زیادہ زور دے رہی ہیں، یہی امریکہ کے بعد کی دنیا کی حقیقت ہے۔ اس سے یہ سیاسی معمہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے اداکاروں، ریاستی اور غیر ریاستی دنیا میں بین الاقوامی مقاصد کو کیسے حاصل کیا جائے؟ اب، تجارتی مذاکرات میں ترقی پذیر دنیا زیادہ طاقت کے ساتھ کام کرتی ہے۔ برازیل اور ہندوستان جیسے ممالک اس وقت تک ہارڈ بال کھیلتے ہیں جب تک انہیں اپنی پسند کا سودا نہیں مل جاتا۔ انہوں نے مغربی سی ای اوز کو یہ وضاحت کرتے ہوئے سنا ہے کہ مستقبل کہاں ہے؟ انہوں نے Goldman Sachs BRIC رپورٹ پڑھی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ طاقت کا توازن بدل گیا ہے۔

کیوٹو معاہدہ (جو صدر بش کی طرف سے مسترد کرنے کی وجہ سے مقدس سمجھا جاتا ہے) درحقیقت ایک ایسا معاہدہ ہے جس کی نشاندہی پرانے عالمی نظریہ پر قائم ہے۔ کیوٹو نے فرض کیا کہ اگر مغرب اکٹھے ہو کر کسی منصوبے پر اتفاق کرلے تو تیسری دنیا نیا فریم ورک اپنائے گی اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔ بین الاقوامی معاملات میں کئی دہائیوں سے ایسا ہوسکتا ہے۔ چین، بھارت، برازیل، اور دیگر ابھرتی ہوئی طاقتیں مغربی قیادت والے عمل کے ساتھ نہیں چلیں گی۔ مزید یہ کہ حکومتیں اپنے طور پر موسمیاتی تبدیلی جیسے مسئلے سے نمٹنے کے لیے بہت کچھ کرسکتی ہیں۔ ایک حقیقی حل کے لیے ایک وسیع تر اتحاد بنانے کی ضرورت ہے جس میں پرائیویٹ سیکٹر، غیر سرکاری گروپس، شہر اور علاقے اور میڈیا شامل ہوں۔ ایک گلوبلائزڈ، ڈیموکریٹائزڈ دنیا میں، ہمیں افراد کے رویے کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

ٹیکس، محصولات اور جنگیں پرانے طریقے ہیں، لیکن ریاستوں کے پاس اب ان محاذوں پر پینترے بازی کی گنجائش کم ہے۔ تبدیلی کو متاثر کرنے کے لیے مزید لطیف اور نفیس طریقوں کی ضرورت ہے۔

بین الاقوامی تعاون کے روایتی طریقہ کار دور کے آثار ہیں۔ اقوام متحدہ کا نظام طاقت کی فرسودہ ترتیب کی نمائندگی کرتا ہے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کے مستقل ارکان ساٹھ سال قبل ختم ہونے والی جنگ کے فاتح ہیں۔ باڈی میں جاپان یا جرمنی، دنیا کی دوسری اور تیسری بڑی معیشتیں (مارکیٹ ایکسچینج ریٹ پر)، یا ہندوستان، دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت، یا کوئی لاطینی امریکی یا افریقی ملک شامل نہیں ہے۔ سلامتی کونسل عالمی گورننس کے قدیم ڈھانچے کی زیادہ وسیع پیمانے پر

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل مستقل ارکان 60 سال پہلے کی جنگ کے فاتح

مثال دیتی ہے۔ G-8 میں چین شامل نہیں ہے، جو پہلے ہی دنیا کی چوتھی بڑی معیشت ہے، بھارت اور جنوبی کوریا، بارہویں اور تیرہویں نمبر پر ہیں۔ روایت کے مطابق، آئی ایم ایف کی سربراہی ہمیشہ ایک یورپی اور ورلڈ بینک کی سربراہی ایک امریکی کے پاس ہوتی ہے۔ یہ "روایت"، ایک پرانے الگ کنٹری کلب کے رواج کی طرح، دلکش اور دل لگی ہوسکتی ہے، لیکن باہر والوں کے لیے یہ متعصب اور اشتعال انگیز ہے۔

ایک اور پیچیدگی:

جب میں قوم پرستی کے عروج کے بارے میں لکھتا ہوں، تو میں شناخت کے دعوے کے ایک وسیع تر رجحان کو بیان کر رہا ہوتا ہوں۔ قومی ریاست نسبتاً ایک نئی ایجاد ہے، جو اکثر سو سال سے زیادہ پرانی نہیں ہوتی۔ بہت سے پرانے مذہبی، نسلی اور لسانی گروہ ہیں جو قومی ریاستوں میں رہتے ہیں۔ اور یہ اتحاد مضبوط ہیں کیونکہ معاشی باہمی انحصار گہرا ہوا ہے۔ یورپ میں، بیلجیم میں فلیمش اور فرانسیسی ہمیشہ کی طرح الگ الگ ہیں۔ برطانیہ میں، اسکاٹس نے ایک حکمران جماعت کو منتخب کیا ہے جو کہ تین سو سال پرانے ایکٹ آف یونین کو ختم کرنے کی تجویز پیش کرتی ہے جس نے برطانیہ، اسکاٹ لینڈ اور ویلز کو بنایا تھا۔ ہندوستان میں قومی پارٹیاں علاقائی پارٹیوں کے سامنے اعتماد کھو رہی ہیں۔

کینیا میں قبائلی امتیازات زیادہ اہم ہوتے جا رہے ہیں۔ دنیا کے بیشتر حصوں میں، یہ بنیادی شناختیں -قومی ریاست سے زیادہ گہری ہیں۔ کھلی عالمی معیشت میں یہ گروہ جانتے ہیں کہ انہیں مرکزی حکومت کی ضرورت کم سے کم ہے۔ اور جمہوری دور میں، اگر وہ ایک گروپ کے طور پر ساتھ رہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرتے ہیں۔ شناخت کے اس دوہرے عروج کا مطلب یہ ہے کہ جب امریکہ یا اقوام متحدہ یا یورپی دنیا سے تعلق ہوتو چینی اور ہندوستانی قوم پرستی پروان چڑھتی ہے۔ لیکن ان کے اپنے ملکوں میں ذیلی قوم پرستی بھی بڑھ رہی ہے۔ عالمی سطح پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ معاشی ترقی کے درمیان شناخت کا عروج مقامی سطح پر بھی ہو رہا ہے۔ یہ بامقصد قومی عمل کو کہیں زیادہ مشکل بنا دیتا ہے۔

جیسے جیسے طاقت متنوع اور پھیلتی جاتی ہے، قانونی حیثیت اور بھی اہم ہو جاتی ہے کیونکہ یہ عالمی سطح پر تمام مختلف اداکاروں کو اپیل کرنے کا واحد طریقہ ہے۔ آج، کوئی بھی حل، چاہے کتنا ہی سمجھدار ہو، پائیدار نہیں ہے اگر اسے ناجائز سمجھا جائے۔ اسے مسلط کرنا کام نہیں آئے گا اگر اسے کسی ایک ملک کی طاقت اور ترجیحات کی پیداوار کے طور پر دیکھا جائے، چاہے وہ ملک امریکہ کی طرح کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر دارفور میں قتل عام ہولناک ہیں، اور پھر بھی وہاں فوجی مداخلت روکنے کا سب سے مؤثر طریقہ صرف اس صورت میں کامیاب ہوگا جب بڑی طاقتوں کے ساتھ ساتھ سوڈان کے افریقی پڑوسیوں کی طرف سے بھی اس کی منظوری دی جائے۔ اگر امریکہ نے اکیلے یا ایک چھوٹے اتحاد کے ساتھ کام کیا یا کسی تیسرے مسلم ملک پر حملہ کیا تو یہ کوشش تقریباً یقینی طور پر ناکام ہو جائے گی۔

انٹیل کے بانی اینڈی گرووی دوٹوک الفاظ میں کہتے ہیں، "امریکہ کو یورپ کے نیچے آنے کا خطرہ ہے،" وہ کہتے ہیں، "خود کو پیٹھ پر تھپتھپاتے ہوئے ٹائٹینک سیدھا آئس برگ کی طرف پوری رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔" تھامس فریڈمین بنگلور میں انفوسس میں رات کی شفٹ میں کام کرنے والے نوجوان ہندوستانی پیشہ ور افراد کی لہروں کو دیکھتے ہوئے بیان کرتے ہیں۔ "اوہ، میرے خدا، یہ بہت سارے ہیں، اور وہ لہروں کے بعد لہروں کی شکل میں آ رہے ہیں، دنیا میں یہ میری بیٹیوں اور لاکھوں دوسرے امریکیوں کے لیے کیسے اچھا ہوسکتا ہے کہ یہ ہندوستانی وہی کام کریں جو ہم کرتے ہیں۔ کیا یہ ہماری اجرت کا حصہ دار بننے کے لیے نہیں آ رہے؟" جرمنی کے معروف نیوز میگزین ڈیر اسپیگل کے ایڈیٹر گیبور سٹین گارٹ اپنی ایک سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب میں لکھتے ہیں۔" اس کے حریف ترقی کر رہے ہیں، وہ دلیل دیتے ہیں، ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اہم صنعتوں کو کھو دیا ہے، اس کے لوگوں نے پیسہ بچانا چھوڑ دیا ہے، اور اس کی حکومت ایشیائی مرکزی بینکوں کی تیزی سے مقروض ہو رہی ہے۔"

حیران کن بات یہ ہے کہ یہ رجحانات کافی عرصے سے موجود ہیں اور انہوں نے حقیقت میں امریکہ کی نچلی لائن میں مدد کی ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں عالمگیریت اور آؤٹ سورسنگ میں ڈرامائی طور پر تیزی آئی ہے، امریکہ کی شرح نمو اوسطاً صرف 3 فیصد سے زیادہ رہی ہے، جو جرمنی اور فرانس کے مقابلے میں پورا ایک فیصد زیادہ ہے۔ (جاری ہے)

پاکستان کی سینئر ترین خاتون صحافی۔ ناول نگار۔ سعیدہ افضل کتنی خوش بخت ہیں کہ 1950 کی دہائی میں پرائمری تعلیم لندن میں حاصل کررہی تھیں۔ اس قسط میں ملاحظہ کیجئے کہ ایک اجنبی ملک میں انجان شہر میں دو چھوٹی بچیاں کتنی آسانی سے اسکول بس میں گھر سے اسکول۔ اسکول سے گھر آتی جاتی ہیں۔ ٹریفک پولیس والے کتنی شفقت سے ان بچیوں کی معاونت کرتے ہیں۔ سعیدہ افضل اس وقت سوچ رہی ہیں کہ برطانیہ نے ایسے ہی تو دنیا پر حکومت نہیں کی ہے۔ ملکوں میں اپنے سسٹم قائم نہیں کیے۔

لندن۔ اچھا علاقہ۔ عمدہ فرنیچر سے آراستہ بالائی حصّہ

تحریر: سعیدہ افضل

میرے والد کو رہائش لندن شہر کے ایک اچھے علاقے میں گھر مل گیا یہ تین بیڈ رومز کا عمدہ فرنیچر سے آراستہ 'اپر پورشن' تھا۔ جس میں ضرورت کی ہر شے موجود تھی، حتیٰ کہ سلائی بکس میں سوئی دھاگے اور بٹن تک مہیا تھے۔

سیڑھیاں اور راہداری کا فرش لکڑی کا تھا تبھی بابا ہم کو آہستہ چلنے کی تلقین کرتے تھے تاکہ ہمارے قدموں کی آواز سے گراؤنڈ فلور والے ڈسٹرب نہ ہوں۔ بھولے سے کبھی ہم بہنیں دوڑ کر راہداری سے واش روم کو جاتیں فوراً فون کی گھنٹی بجتی اور والد صاحب کو گراؤنڈ فلور والے اپنے انگریز پڑوسی سے سوری کہنا پڑتی۔

گھر کا ڈرائنگ روم کشادہ تھا۔ سامنے کی دیوار کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی میں نصب شفاف شیشے سے سڑک پر رواں دواں ٹریفک، موٹر کاریں، فٹ پاتھ پر اورک کوٹ اور رین کوٹ پہنے، ہاتھوں میں چھتریاں تھامے لوگ آتے جاتے نظر آتے تھے، یہ ایک پُررونق جگہ تھی دکانیں اور شورومز تھے۔ دومنزلہ بسیں بھی چلتی تھیں۔ یہ ایک ایسا علاقہ تھا جیسا کہ انگریزوں نے اوائل دنوں میں 'صدر کراچی' کو اپنے رہنے کے لیے تعمیر کرایا ہوگا۔

میں کھڑکی کے شیشے سے ناک چپکائے رکھتی اکثر تو بادل چھائے رہتے۔ کہرا ہوتا تو کھڑکی کا شیشہ دھندلایا رہتا۔ کہر نہ ہوتی بارش برسنے لگتی تب میری ناک ٹھنڈے شیشے سے برف کی قاش بن جاتی۔ ناک بند ہوجاتی تو رات کو سونے میں بہت الجھن آتی۔ ہم بچوں کے کمرے میں جلتے ہوئے ہیٹر سے آتی آواز تب مجھے جنوں بھوتوں کی گفتگو لگتی۔ میں پرندوں کے پروں سے بھری ہوئی رضائی میں منہ چھپالیتی۔

لکڑی کی سیڑھی پر میرون کلر کا قالین بچھا ہوا تھا۔ روزانہ صبح دم۔ دودھ والا۔ دودھ کی بوتلیں اور دھوبی دھلے ہوئے کپڑے ایک بکس میں استری شدہ۔ دروازے پر رکھ جاتا یہ کپڑے ہمارے انگریز پڑوسی کے ہوتے تھے۔ تبھی وہاں ایک خوبصورت گوری میم آجاتی وہ خوش رنگ لباس میں میک اپ سے بنی سنوری جب مسکرا کر مجھ کو 'ہیلو' کہتی تو یہ گوری آنٹی (لیڈی سوپر) مجھے اچھی لگتی۔ یہ سیڑھی پر بچھا قالین صاف کرنے آتی تھی۔

ابھی ہم نے اسکول جانا شروع نہیں کیا تھا بوریت ہوتی، ہم تو بچے تھے سمجھ میں نہ بھی آتا، ہم ٹی وی لگا لیتے۔ انگریزی پروگرام آتے رہتے امی ٹی وی نہیں دیکھتی تھیں کیونکہ ان کے مطلب کا کوئی (اُردو چینل) نہیں آتا تھا۔

یہ 1950-1951 کا زمانہ تھا پاکستان میں تو ٹی وی کا دور بہت بعد میں آیا تھا۔ جہاں لوگ ابھی تک ریڈیو پر گزارہ کرتے تھے۔ اس گھر میں ایک لائبریری بھی تھی۔ شیلفیں میں موٹی موٹی انگریزی کتابیں رکھی

ڈیوٹی پر ٹریفک پولیس والا کارڈ دیکھ کر اسکول بس میں سوار کروادیتا

ہوئی تھیں، میں تصویروں کی خاطر کتابوں کو الٹتی پلٹتی۔ آخر کار ایک کتاب میرے کام کی نکل آئی۔ تصویروں کی مدد سے بچے مختلف چیزیں بناسکتے تھے۔ یہ اخروٹ کے خول سے کشتی بنانے کی ترکیب تھی۔

انہی دنوں میرے والد نے ہم دونوں بہنوں کو اسکول داخل کرادیا۔ یہ ایک بڑا اسکول تھا۔ یہاں بچے کافی تعداد میں تھے۔ والد صاحب ہمیں پہلے روز بس میں چھوڑنے اسکول گئے۔ اس کے بعد ہم خود جانے لگے۔ بابا نے اپنا کارڈ میرے کوٹ کی جیب میں ڈال دیا تھا۔

والد صاحب لندن میں محمد افضل خان اپنے مہمانوں کے ہمراہ۔ 1949

والد صاحب لندن میں۔ 1949

والد صاحب محمد افضل اپنے دوست کے ہمراہ 1949

صبح سویرے ہم گھر سے فٹ پاتھ پر آ جاتی جہاں بس اسٹاپ تھا۔ وہاں کھڑے ہو جاتے تو جو بھی اس وقت ٹریفک پولیس مین ڈیوٹی پر ہوتا میں اس کو کارڈ دکھا دیتی۔ ہماری مطلوبہ بس آتی وہ ہمیں اس میں سوار کرا دیتا اور ہم اسکول پہنچ جاتے۔

لکھنے سے قاصر تھی۔ لیکن کہانی سوچتی ضرور تھی

ہمارے وطن پاکستان میں اسکولوں میں کتابی پڑھائی پر زور دیا جاتا۔ ہوم ورک ملتا ہے اور استانیوں سے ڈانٹ بھی پڑتی ہے۔ لیکن یہاں ڈانٹ اور مار کا کوئی تصور نہیں تھا۔ تعلیم کے ساتھ دوسری ایکٹی ویٹیز (سرگرمیوں) کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔ خاص طور پر پرائمری سیکشن میں بچوں کی دلچسپی اور ان کی ذہنی آسودگی کو بہت اہم سمجھا جاتا۔ مثلاً تعلیم کے ساتھ میوزک کلاسز، ڈانس پیریڈز، آرٹ ورک...... حتیٰ کہ شور مچانے کا بھی پیریڈ ہوتا تھا۔ اس پیریڈ میں 'میک آ نوائس ٹو' 'میک آ نوائس ٹو' Make a Noise Too کی گردان کرتے ہوئے بچے جس قدر چاہتے شور مچاتے جب شور مچا مچا کر تھک جاتے تو کلاس روم میں خاموشی اور سکون سے بیٹھ جاتے۔ شاید کہ شور مچانا بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہوتا ہے۔

دن میں دو بار واش روم بریک ہوتی تب کلاس کے تمام بچوں کو قطار میں واش روم لے جاتے۔ اکثر بچوں کی ناکیں۔ سردی کے سبب بند ہوتیں یا کہ نتھنے بھرے ہوتے وہ کلاس روم میں ہی رومال وغیرہ سے نوزی صاف کرتے اور استعمال شدہ رومال کو جیبوں میں ٹھونس لیتے۔ اسی سبب غالباً بچوں کو واش روم لے جایا جاتا تھا مگر وہ وہاں پانی کا استعمال کرنے کی بجائے منہ پر گیلا ٹشوز پھیر لیتے۔ حالانکہ نلوں میں گرم پانی آتا رہتا۔ مجھ کو ان کی یہ حرکتیں عجیب لگتیں۔

یہاں میں خاص طور پر ایک ایسے ہال کا ذکر کروں گی جس کو میں نے از خود 'ایکٹی ویٹی اینڈ آرٹ ہال' لکھ دیا ہے۔

جب یہ پیریڈ ہوتا اس وقت بچے اس ہال میں دوڑے جاتے جہاں رنگ، کلر پینسل، برش، کینوس بورڈ، آرٹ پیپرز، بلاکس۔ وہ پرزے جن کو جوڑ توڑ کر کھلونے بناتے۔ 'پزلز او بجیکٹ' اور وہ رنگ برنگ کا نرم میٹیریل جس سے کئی طرح کی فیگرز بنتے جیسے ہمارے دیس کی بچے گیلی مٹی سے بوے بناتے تھے۔ پنچھیوں کے خوبصورت پَر۔ جن کو وہ پرندوں کی

پرائمری کلاس میں ایک پیریڈ شور مچانے کا بھی ہوتا

تصویروں پر گم سے چپکاتے۔ اسٹوری بکس جن میں رنگ بھرا جاتا۔ اور موتی کچے ڈبوں میں بھرے رکھے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے سفید سیمنٹ سے بنے بلاک (اینٹیں) اور گتے کی سرخ چھتیں جن سے گھر بنائے جاتے۔ بچوں کی دلچسپی کی اتنی چیزیں ہوتیں کہ گنوا نہیں سکتی۔

ہر بچہ ہال میں جاتے ہی اپنی من پسند اشیا اٹھا لیتا۔ اور کسی تخلیقی کارکردگی میں مشغول ہو جاتا۔ یہ نونہالوں کے پسندیدہ کھیل بھی تھے اور ان کے لیے ذہنی مشقیں بھی تھیں۔ بچوں کی تخلیقی اور ذہنی صلاحیتوں کی جانچ پرکھ کے ساتھ ان کے رجحانات سے واقفیت یہ کھیل Aptitude Test جیسے تھے۔ بچوں کی ذہنی صحت سے ٹیچرز کو آگاہی ملتی رہتی۔ وہ رپورٹس تیار کرتیں ماہر نفسیات ان کی جانچ کرتے اور پھر والدین کو جان کاری بھی دیتے۔

میں ہمیشہ کاغذ اور رنگین پینسلیں ہی اٹھاتی، کہانی سوچتی اس کو لفظوں میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی تھی تو تصویروں سے کہانی کو بیان کرنے کی کوشش کرتی مثلاً ایک تصویر میں 'ریڈ رائڈنگ ہڈ' والی کہانی ہے جو سبھی بچوں نے اسٹوری بک میں پڑھی ہوگی، اگر مجھے اسے تصویری صورت میں لکھنا ہوتا تو ایک تصویر میں لڑکی بناتی جس نے سرخ رنگ کا ہڈ پہنا ہوتا۔ اور وہ جنگل میں درخت کے نیچے پھل چُن کر ٹوکری میں ڈالتی ہے، دوسری تصویر میں اسے بھیڑیا ملتا ہے تیسری میں بھیڑیا اس کی نانی کے گھر نانی کی بستر پر لیٹا ہے۔ اس طرح بغیر الفاظ کے کہانی مکمل ہو جاتی۔ میں ان کرداروں، درختوں اور گھر کو پینسل سے بنا کر انہیں کلر پینسلیں سے رنگتی بھی تھی اس طرح روز ایک کہانی میری سوچ

دو چھوٹی بچیاں۔ انجان شہر۔ اجنبی ملک

میں آتی، تصویروں میں منتقل ہوتی اور یہ تصویریں Thumb Pin سے بورڈ پر لگا دیتی یہ عمل میری اس مجبوری کا عکاس تھا کہ میں الفاظ میں لکھنے سے قاصر تھی لیکن کہانی سوچتی ضرور تھی۔ معلوم نہیں تھا کہ آگے زندگی بھر مجھ کو کہانیاں ہی لکھنی ہوں گی۔

بچے اسی طرح اپنی کارکردگی سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو عیاں کرتے تھے اور اپنی بنائی ہوئی چیزوں پر نام لکھ کر چھوڑ جاتے تھے یہ ایک طرح سے اسٹوڈنٹ کے طبعی میلان اور رجحانات کی جانچ کے ساتھ ذہنی صحت کو پرکھنے کا ٹیسٹ بھی ہوتا تھا۔ اسکول میں عزیزہ نرسری پورشن میں تھی اور میرا داخلہ دوسری کلاس میں ہوا تھا۔ وہ اسکوٹی چلاتی کھلونوں سے کھیلتی اور میں اپنی کلاس میں جا بیٹھتی۔ جہاں دو انگریزی لیڈی ٹیچرز

سعیدہ افضل کے والد محمد افضل خان

ہوتیں۔ کلاس میں بچے شور کرتے۔ شرارتیں اور اودھم مچاتے ایک دوسرے کے ساتھ کھینچا تانی کرتے ٹیچرز خاموشی سے دیکھتی رہتیں۔ وہ ان کو کچھ بھی نہ کہتیں۔ صبر سے انکی اچھل کود برداشت کرتیں۔ جو لڑکے زیادہ شرارتی تھے ان کے پاس جا کر تحمل سے بات کرتیں۔ ہماری کلاس ٹیچر نے اپنی میز کے پاس دو کرسیاں رکھ لی تھیں ایک پر مجھ کو اور دوسری

نگراں انگریز لیڈی مجھے کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش ضرور کرتی

پر مجھ جیسی ایک خاموش طبع بچی کو بٹھا لیتیں تا کہ ہم کلاس کے شرارتی بچوں کی زد سے بچی رہیں۔ کیونکہ ہم کسی سے پنگا نہیں لیتی تھیں۔ انگریز در اصل بچوں کے معاملے میں بہت زیادہ کیئرنگ ہوتے ہیں اور وہاں اسکول میں بچوں کو ڈانٹنے اور مارنے پیٹنے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ جیسا کہ ان دنوں ہمارے وطن پاکستان میں ہوتا تھا۔

دوپہر کو روزانہ کھانے کا وقت ہوتا تھا۔ لنچ ٹائم میں ڈائننگ ہال میں لمبی لمبی میزوں پر کھانوں سے بھری ڈشیں رکھی جاتیں۔ بڑے ڈونگوں میں سوپ، گوشت کا گاڑھے سانولے رنگ کا شوربا۔ مچھلی کے قتلے چاول بریڈ۔ میٹھا۔ سلاد غرض بھرپور کھانا وہ بچوں کے سامنے پروستے تھے۔ اکثر ڈشز پر کرش چیز چھڑکتے۔ جیسے کہ ہم گارنش کے لیے ہرا دھنیا اور پودینے کے پتے ڈال دیتے ہیں، مجھے ان کی چیز (پنیر) کی خوشبو پسند نہیں تھی نہ سوچنا اچھا لگتا، اور نہ گوشت، چاہے شوربے میں ہوتا یا پلیٹ میں قتلے رکھے ہوتے۔ ان کی میٹھی ڈشوں کو بھی میں نہیں چکھتی تھی، یہ مجھے بے سواد لگتیں۔ صرف چاول، مٹر یا پھر فرائی آلو اور کبھی ابلے ہوئے آلو لے لیتی۔

ہم بچوں کی پشت پر نگرانی کو انگریزی لیڈیز کھڑی ہوتیں وہ نوٹ کرتی رہتیں کہ کس بچے نے کیا، کتنا اور کونسا کھانا رغبت سے کھایا ہے، کھانے کی ٹیبل پر بچوں میں بڑا نظم و ضبط پایا جاتا میرے پیچھے کھڑے نگراں انگریز لیڈی بڑی شفقت اور کاوش سے مجھے کچھ نہ کچھ کھلانے کی کوشش کرتی۔ میں منع کرتی تب اس کو بہت تشویش ہوتی، بالآخر میرے والد کو اسکول بلوایا گیا اور اس مسئلے پر ان کے ساتھ میٹنگ ہوئی، ان کو آگاہ کیا گیا۔ آپ کی بچی کھانا ٹھیک سے نہیں کھاتی، اور بہت کم مقدار میں دو چار لقمے

لیتی ہے، آپ بتایئے اس کو کھانے میں کیا پسند ہے۔

والدصاحب نے مجھ سے پوچھا تھا۔تم اسکول میں کھانا کیوں نہیں کھاتی ہو۔ میں نے بتایا، مجھے ان کھانوں کا ذائقہ اچھا نہیں لگتا۔ گوشت اور شوربے میں عجیب سی بو Smell آتی ہے۔ چیز بھی اوپر سے ڈال دیتے ہیں، چیز کا ذائقہ پسند نہیں آتا۔اسی لیے کھانے کو دل نہیں کرتا۔

تم تو سلاد بھی نہیں کھاتی ہو۔؟

بابا۔اس میں کوئی تیل ملا ہوتا ہے اس لیے نہیں کھاتی۔بس چاول اور مٹر لے لیتی ہوں اور آلو بھی کھاتی ہوں۔

اسی طرح روز ایک سا کھانا وہ بھی تھوڑا سا کھانے سے تمہاری صحت خراب ہوجائے گی۔دیکھو تم کتنی دبلی ہوتی جارہی ہو۔بابا نے مجھے سمجھایا۔

گھر سے سیب لے جایا کرو۔کوٹ کی جیب میں رکھ لیا کرو۔ کچھ تو کھانا چاہیئے۔اس طرح تو کمزور ہوجاؤ گی۔اماں نے بھی سمجھایا۔

بولیں۔ دراصل ہم بھون کر پکاتے ہیں اور یہاں لوگ ابال کر کھاتے ہیں اس لیے اسے کھانا اچھا نہیں لگتا۔

بے شک مجھے انگریزی طرز کا پکا ہوا کھانا پسند نہیں تھا لیکن وہ انگریز گوری مہربان خاتون بہت پسند تھی جو اسکول کی چھٹی کے وقت کچن سے باہر ایپرن لگائے کھڑے ہوتی۔وہ میرا نام پوچھتی پیار سے ہیلو کہتی اور مسکرا کر مجھ سے بات کرتی۔رفتہ رفتہ میری اس کے ساتھ دوستی ہوگئی۔جب مجھے نظر آتی میں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی۔چھٹی کے بعد ہم دونوں بہنیں اسکول گیٹ سے نکلتیں تو وہاں موجود گارڈ یا ٹریفک کا کوئی پولیس مین سڑک پار

پڑوسی فیملی کے رہن سہن پر میرا ناول 'انجمن آراء'

کرنے میں ہماری مدد کرتا اور ہم بس میں بیٹھ کر گھر آجاتے۔

دیکھئے تو اس دَور میں۔دو چھوٹی بچیوں کا کسی بالکل اجنبی ملک کے انجان شہر میں اکیلے گھر سے اسکول جانا اور اسکول سے گھر واپس آجانا کس قدر آسان امر تھا۔یہ لندن شہر تھا اس انگریز کا ملک جس نے برسوں ہمارے دیس پر حکمرانی کی تھی۔

جب ہم لندن گئے تھے تب ہمیں آزادی کی نعمت کو ملے تین چار برس ہی ہوئے تھے۔سوچتی تھی تبھی شاید یہ انگریز لوگ ہم برصغیر کے بچوں کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرا کر ملتے تھے اور اپنائیت سے ہیلو کہتے کہ ہم ان کے لیے اجنبی نہیں تھے۔

ہمارے گھر کی بیسمنٹ میں ایک انگریز فیملی رہتی تھی میرے والد کی ان لوگوں سے جان پہچان ہوگئی تھی۔یہ کنبہ چار افراد پر مشتمل تھا۔ایک بیٹا بائیس برس کا جس کا نام پیٹر تھا وہ جاب کرتا تھا۔اور بیٹی سولہ سترہ سال کی پیپٹ Pet نام تھا اسکا اور بوڑھے ان کے ماں باپ تھے۔یہ خوبصورت لوگ تھے اور سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ماں لمبا سا فراک پہنتی تھی اور بیٹی کا لباس بھی عریانی سے پاک ہوتا تھا۔وہ ہمیشہ بدن کو ڈھانپے رکھتی تھی اس کی آستینیں پوری اور فراک گھٹنوں سے دو چار انچ نیچے ہوتی۔یہ خواتین اسکن کلر کی فل جرابوں سے اپنی پنڈلیوں اور ٹانگوں کو ڈھانپے رکھتی تھیں،

ہمارے میزبان کی بیٹی اور میری سہیلی رفعیہ۔بہن عزیزہ۔ فہمیدہ اور اسلم (طفیل کا بھائی)۔1950

یہ سب اکٹھے بالکل اس طرح رہتے تھے جیسے ہمارے وطن میں ماں باپ اور بچے اکٹھے رہتے ہیں ان کا خاندانی سسٹم ہمارے جیسا مشرقی طرز کا تھا۔بوڑھا باپ زیادہ تر اپنے کمرے میں رہتا۔بیٹا آفس جاتا اور بیٹی کالج یا کہ اسکول پڑھنے جاتی تھی۔ماں نے کچن سنبھالا ہوا تھا۔

اس فیملی کے پس منظر میں، میں نے ایک ناولٹ 'انجمن آراء' لکھا ہے اور اس ناولٹ میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ پیپٹ بہت اچھی لڑکی تھی جب میں اور عزیزہ ان کے گھر کی بیل بجاتے وہ دروازہ کھول دیتی ہم کو گھر کے اندر لے جاتی وہ ہمیں سیٹنگ روم میں بٹھاتی، ان کا Sitting Room کافی بڑا تھا۔ صوفوں کے درمیان میں چوکور میز اور دیوار میں آتش دان جس میں نارنجی رنگ کی آگ روشن رہتی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس میں لکڑیوں کے چوکور ٹکڑے ہی جلائے جاتے تھے اور دھواں چمنی سے اوپر نکل جاتا تھا۔

پیپٹ ہم بہنوں کو اس طرح ''اٹینڈ'' کرتی جیسے ہم اس کے لیے خاص ہوں ان کے روم کا ایک دروازہ لان میں کھلتا تھا یہ ہرا بھرا لان مجھے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے نظر آتا تھا۔اس باغ کے کناروں کو چھوٹے چھوٹے گول مول پتھروں سے سجایا گیا تھا۔اگر بارش رکی ہوتی تو پیپٹ ہمیں لان میں لے جاتی اور پھولوں کا گلدستہ بنا کر دیتی کہتی۔ یہ اوپر لے جانا اپنے کمرے کے گلدان میں اسے رکھنا۔ وہاں ہر گھر میں گلدانوں میں پھول سجانے کا رواج تھا۔

پیپٹ عمر میں مجھ سے بڑی تھی لیکن یہ خوبصورت خوش اخلاق لڑکی میرے ساتھ اس طرح پیش آتی جیسے کہ میری ہم عمر دوست ہو۔ لان سے چھوٹے چھوٹے گول مول چکنے پتھر چُن کر دیتی اور ان پر کلر کرنا سکھاتی۔

جب تیز بارش ہو رہی ہوتی پیپٹ کے پاس جا کر آتش دان کے سامنے آگ تاپنے کا من کرتا۔ میں گرم کوٹ پر رین کوٹ اوڑھ لیتی اور برستی بارش میں پیپٹ کے گھر کی بیل بجادیتی وہ ہر بار ہی خندہ پیشانی سے ملتی پیار سے بات کرتی۔ کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر جب میں اوپر اپنے گھر آتی اماں مجھے ڈانٹتیں کہ جب تمہارا دل کرتا ہے تم شام کے وقت ان کا دروازہ بجادیتی ہو یہ بری بات ہے تم پڑوسیوں کو پریشان کرتی ہو۔Pet پریشان نہیں ہوتی ماں۔

وہ بالکل بھی برا نہیں مناتی۔

برا نہیں مناتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہر وقت جب تمہارا دل کرے ان کو ڈسٹرب کرو، بس اماں۔ میں وہاں نہ جاؤں تو کہاں جاؤں۔ میں جواب دیتی۔تبھی اماں خاموش ہوجاتیں۔

ہمیں لندن آئے تقریباً دو سال ہوگئے تھے بابا کو جب وقت ملتا گھمانے پھرانے لے جاتے تھے۔دریا کے کنارے جس روز سورج نکلا ہوتا۔انگریز مختصر کپڑوں میں سن باتھ لے رہے ہوتے، شاپنگ کے لیے پکاڈلی اور 'زو' بھی دیکھا۔دنیا کا ایک بہت بڑا چڑیا گھر۔عجب طرح کے دنیا بھر کے جانور۔اور اتنا چھوٹا بندر جو انسان کی چھنگلی پر بیٹھ جاتا۔

ایک بار شاپنگ مال میں امی غرارہ پہن کر گئیں تو ان کے غرارے کا کنارہ ایکسیلیٹر میں پھنس گیا۔خدا کا شکر والدصاحب نے کھینچا تو پھنسا ہوا ٹکڑا پھٹ کر اماں کے غرارے سے جدا ہوگیا۔ایک بڑے حادثے سے جان بچی۔اور بہت سی جگہیں والدصاحب نے گھمائی تھیں ہر بار اماں کا پردہ ان کے لیے بہت بڑا مسئلہ بن جاتا تھا۔حالانکہ میرے نانا انگریزوں کے دور میں پڑھنے کے لیے انگلستان گئے وہ وہاں سات برس رہے انجینئرنگ پاس کی۔ واپسی میں چیف انجینئر خیر پور تعینات ہوئے تھے لیکن والدہ پرانے خیالات کی تھیں۔انہوں نے ڈیرہ سے پرائمری تعلیم پائی اپنے والد کے پاس لندن بھی نہیں گئیں۔دراصل امی کی تربیت مذہبی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ پانچ وقت نماز پڑھتی تھیں صبح سویرے تلاوت قرآن پاک ان کا معمول تھا میری پھپھیوں اور اپنی

1953۔میری ماں کی خوشی کی خاطر۔ والدصاحب کو لندن کو خیر باد کہنا پڑا

بیٹیوں کو قرآن پاک انہوں نے پڑھایا۔ترجمے سے پڑھتی تھیں۔

جب لندن آگئیں تو ہر وقت کہتیں یہ کیسا ملک ہے جہاں نہ تو کوئی مسجد نظر آتی ہے اور نہ ہی کانوں میں کبھی اذان کی آواز آتی ہے۔اس بات کا ان کو بہت قلق ہوتا تھا۔ کہ یہاں اللہ اکبر کی صدا سنائی نہیں دیتی۔اور وہ اذان سننے کی سعادت سے محروم ہیں۔انہیں گھر سے باہر بغیر نقاب لمبا سا کوٹ پہن کر جانا پڑتا تھا۔

ہم بچے تو اسکول جا کر بہل جاتے مگر میری ماں اداس رہا کرتی تھیں والد کا اپنا حلقہ تھا، والدہ بے حد تنہائی محسوس کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ پیپٹ کے گھر بھی نہیں جاتی تھیں۔ والد سے ان کا ایک ہی مطالبہ تھا۔ واپس پاکستان چلو، اپنے وطن چلو۔اپنے وطن جیسی کوئی جگہ نہیں ہے۔ان کے لبوں پر یہی فقرہ رہتا۔اپنا ملک کشمیر، یعنی کہ اپنی سرزمین بنجر اور بے آب و گیاہ بھی ہو تو اس کے باشندوں کے لیے ملک کشمیر کے جیسی سرسبز اور خوبصورت ہوتی ہے۔

اماں اکثر تنہائی میں روتی بھی تھیں خود کو قیدی محسوس کرتیں بیمار رہنے لگیں تبھی والدصاحب کو میری ماں کی خوشی کی خاطر لوٹ کر پاکستان آنا پڑا اس طرح ایک دن ہم نے لندن کو خیر باد کہہ دیا اور 1953 میں ہم واپس پاکستان آگئے۔(جاری ہے)

ضرورت اور نیت میں فرق

ہڑتال دھرنا تو جڑواں شہروں کے راستے۔ دفاتر۔ مدارس۔ بند کردو

تحریر: طارق محمود، راولپنڈی

آم Mango کھا کر دودھ کی کچی لسی پی جاتی ہے تاکہ راس محبوب پھل کے مابعد اثرات سے محفوظ رہا جا سکے۔ یہ تو انسان کی طبّی ضرورت ٹھہری اور دودھ میں پانی ملا کر استعمال کرنا گناہ نہ ٹھہرا لیکن جب دودھ فروش اس نیت سے پانی ملاتا ہے کہ اس کی مقدار میں اضافہ ہو جائے وہ زیادہ حرام کما سکے تو یہ نیت کا فتور ہے۔

آپ دونوں صورتوں کا موازنہ کریں تو بات واضح ہو جاتی ہے کہ ضرورت و نیت میں کیا فرق ہے اگر کسی عہد کی حزبِ اختلاف احتجاج ہڑتال دھرنا دے تو وہ نقصِ امن ہے۔ لہٰذا راستے مسدود کردو۔ کنٹینرز رکھ دو۔ فول پروف سیکورٹی کے نام پر انتظامیہ اسلام آباد، راولپنڈی کے جڑواں شہروں کو نہ صرف راستوں کو بند کرے بلکہ تمام دفاتر مدارس جامعات بھی بند تو یہ ضرورت ٹھہری۔ پہلی صورت حال منفی اور دوسری مثبت۔ پاکستان میں تین میگا ایونٹ منعقد ہوئے اور وہ بھی اس کی پوری عمر میں۔ اسلامی سربراہی کانفرنس، قیامِ پاکستان کی پچاس سالہ تقریبات اور SCO کانفرنس۔

60 کی دہائی میں ہفتہ واری تعطیل صرف ایک عیدین کی تعطیلات بھی صرف 2

نیویارک، امریکہ جہاں ہر سال ستمبر کے آخری عشرے سے عالمی اجتماعات ہوتے ہیں کیا وہاں بھی اسی شہر کو بند کر دیا جاتا ہے؟ فول پروف سیکورٹی کو یقینی بناتے ہوئے بھی بندش کو جرم رکھا جا سکتا تھا۔ آٹے کے ساتھ گھن بھی پستا ہے مشکلات عوام کو جھیلنا پڑتی ہیں۔ وہ جو فرمایا گیا کہ اک مردِتن آساں۔ تن آسانوں کے کام آیا۔

SCO کے تین ایام سے ملحق اوّلین آخریں دنوں دفاتر والوں کی کارکردگی ضعف کا شکار ہوئی اور وہ بھی وفاقی دارالحکومت میں۔ ترسیلی رکاوٹوں کے باعث اشیائے خورد و نوش کی حصول یابی میں مشکلات اور منافع خوروں کے لیے نرخ بڑھانے کا نادر موقع فراہم کیا گیا۔

بہت مناسب ہوتا اگر دورانِ انعقاد کانفرنس صوبائی حکومت کا Price Control Department متحرک نگہبان اور چوکس رہتے ہوئے موقع پر تاجروں کو مصنوعی مہنگائی کا سبب بننے سے مجتنب رکھنے کا کردار ادا کرتے۔

1960 کی دہائی میں نہ صرف ہفتہ واری تعطیل صرف ایک تھی بلکہ عیدین کی تعطیلات دو سے زائد نہ ہوتی تھیں۔ وجہ اس کی کہ دوران حکمران خود محنتی تھے اور اپنے فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے میں منہمک رہتے۔

پاکستان اپنی Geo-Strategic Position کے باعث مخلصین اور مخالفین کی نگاہوں میں رہتا ہے۔ اعتقاد ایمان ایقان ہے کہ دشمن اگر است، نگہباں تر است! مستقبل میں بھی کانفرنس کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پاکستان نے BRICS کا عضو بننے کی درخواست دے رکھی ہے۔ تو کیا ہر اجتماع کے انعقاد کے موقع پر یقینی حفاظت و سلامتی کی اہمیت پر یقینی حفاظت و سلامتی کی اہمیت کے پیشِ نظر سرکاری و غیر سرکاری دفاتر بند رکھے جائیں گے؟

کووڈ 19 کے ایام میں اہل کاروں نے گھروں سے کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی رجحان کو عام و خاص حالات میں روبہ عمل لایا جانا چاہئے۔ بظاہر معمولی کام، اپنی اہمیت کے اعتبار سے غیر معمولی نوعیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر پورے ملک میں قوانین مرور یہ Traffic Law کی پاسداری پابندی باقاعدگی، کی اور کروائی جائے تو بہ فضل تعالیٰ کبھی امن عامہ کی صورت حال بگڑنے نہ پائے۔

دفاتر کے ساتھ گھروں سے کام کرنے کو ترجیح دی جائے

دفاتر کے ساتھ گھروں سے کام کرنے کے رجحان کو فروغ دیا جائے اور Technology کے اعتبار سے سہولت کاری کی جائے۔ پاکستان پائندہ باد۔ Faith Unity Discipline کے ساتھ قائداعظم زندہ باد۔ ۞

مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟

سید ارتقا احمد زیدی وزارت تجارت کے جائنٹ سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ 'اطراف' کے قلمی سرپرست ہیں۔ غذائیت پر ان کی تحقیق 'اطراف' مطبوعات سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ 'مشرقی پاکستان بنگلہ دیش کیوں بنا؟' بہت دلچسپ انداز میں بنگلہ دیش کی ترقی کے اسباب پر روشنی ڈالتی اقساط اب اپنے اختتام کو پہنچیں۔

پچھلی قسطوں کی سرخیاں

اگست 2023۔ پہلی قسط

بنگلہ دیش کا قیام۔ ایک المیہ۔ ایک سبق

دسمبر 2023۔ دوسری قسط

مجیب کے اعلان نے بنگلہ دیش میں امن قائم کر دیا

جنوری 2024۔ تیسری قسط

غیر بنگالی استاد کلیم صاحب کی جان کیسے بچی

فروری 2024۔ چوتھی قسط

بنگلہ دیش کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ اسلام آباد سیکرٹریٹ میں تیار ہو رہا تھا

مارچ 2024۔ پانچویں قسط

ملک توڑنے کی سازش میں خود ملک کے ارباب اختیار شامل

اپریل 2024۔ چھٹی قسط

جنرل نیازی نے پورا سچ نہیں بتایا

مئی 2024۔ ساتویں قسط

کھلنا میں عمائدین سے مشاورت کی بجائے دھمکیوں میں گفتگو

جون/ جولائی 2024۔ آٹھویں قسط

16 دسمبر۔ جب ٹیلی فون سے مشرقی پاکستان کا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا

اگست 2024۔ نویں قسط

رمنا پارک۔ شوٹنگ بند کر کے ہم نے اپنی تصویریں بنائیں

ستمبر 2024۔ دسویں قسط

ہرے بھرے ڈھاکہ میں آخری دن کی محبتیں

اکتوبر 2024۔ گیارہویں قسط

ڈاکٹر محمد یونس۔ غبن کے مقدمے سے بنگلہ دیش کے سربراہ تک

نومبر 2024۔ بارہویں قسط

بنگالی بھائیوں نے اپنی محنت سے بنگلہ دیش کو خوشحال ملک بنا دیا

دو بجے۔تمام ورکروں نے روبوٹ کی طرح کام شروع کردیا

فیکٹریوں کے سپروائزر کی بھرتی میرٹ پر ہوتی ہے

13 ویں اور آخری قسط

تحریر: سید ارتقا احمد زیدی

ہم ڈائننگ روم میں پہنچے تو دیکھا تمام ورکرز اپنے اپنے پیکن ہول میں رکھے ہوئے ٹفن کیئر (ناشتہ دان) لیکر بڑی سی ڈائننگ ٹیبل کے چاروں طرف بیٹھ کر لنچ کرنے لگے۔ منیجر نے بتایا کہ ہم ورکرز کو کھانا وغیرہ مہیا نہیں کرتے وہ اپنا کھانا خود گھر سے لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی مرضی سے اپنی ضرورت کے مطابق کھانا کھاتے ہیں۔ لنچ کا وقفہ ایک گھنٹے کا ہوتا ہے آدھا گھنٹہ کھانے میں لگ جاتا ہے۔ باقی آدھے گھنٹے میں ظہر کی نماز پڑھ لیتے ہیں۔ ہم منیجر صاحب کے کمرے میں آگئے جہاں انہوں نے چائے سے ہماری تواضع کی۔ میں نے کھڑکی سے دیکھا کہ ٹھیک ایک بج کر 55 منٹ پر تمام ورکر قطار بنا کر اس ہال کی طرف روانہ ہوگئے۔ جہاں وہ لنچ سے پہلے کام کر رہے تھے۔ میں نے منیجر سے کہا کہ میں ہال میں جاکر دوبارہ کام شروع کرتے ہوئے ان ورکرز کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ منیجر اور سپر وائزر بھی میرے ساتھ ہال میں آگئے۔ میں نے دیکھا کہ تمام ورکر اپنی اپنی کرسیوں پر سلائی کی مشینوں کے سامنے بیٹھے ہیں۔ ٹھیک دو بجے جونہی گھنٹی بجی تمام ورکرز نے بالکل روبوٹ کی طرح مشینوں پر کام شروع کردیا۔ ان کا نظم وضبط دیکھ کر میں بے حد متاثر ہوا۔ پاکستان میں کئی فیکٹریوں میں جانے کا موقع ملا لیکن وہاں میں نے ورکرز میں اس قدر نظم و ضبط نہیں دیکھا۔ وہ آپس میں ہنسی مذاق کرتی ہوئے نظر آتے تھے اور کچھ اِدھر اُدھر پھر کر نہ تو خود کام کرتے تھے بلکہ دوسروں کے کام میں بھی مخل ہوتے تھے۔ بنگلہ دیش کی ترقی کا ایک راز یہ بھی معلوم ہوا کہ فیکٹریوں میں تمام ورکرز بہت محنت اور تندہی سے کام کرتے ہیں۔ منیجر نے اس بات کی تصدیق کی کہ بنگلہ دیش میں تمام فیکٹریوں میں کام کرنے کا یہی ماحول ہے چاہے وہ نجی فیکٹریاں ہوں یا سرکاری شعبہ میں۔ وجہ اس کی یہ معلوم ہوئی کہ فیکٹریوں کے سپر وائزر کی بھرتی میرٹ پر ہوتی ہے۔ اور دوران ملازمت ناقص کارکردگی پر فوراً فارغ کردیا جاتا ہے۔ ورکرز کے بچوں کی

> بنگلہ دیشوں کا رہن سہن
> بہت سادہ کفایت والا

تعلیم اور پوری فیملی کا علاج معالجہ بھی فیکٹری کے ذمہ ہوتا ہے۔ ورکر ریٹائر ہونے یا حادثہ میں معذور ہونے یا موت کی صورت میں اس کے بچوں کی کفالت اور کم ازکم ایک بچے کی ملازمت کمپنی کے ذمہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ورکرز دل و جان سے فیکٹری کے

> سب کالی چائے پیتے ہیں۔
> دودھ چینی نہیں ملتی

مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور ہڑتال وغیرہ میں حصہ نہیں لیتے۔
فیکٹری کے منیجر کی زبانی یہ تمام معلومات صحیح معلوم ہوتی تھیں پھر بھی میں نے بنگلہ دیش میں اپنے قیام کے دوران گفتگو کے ذریعے بنگلہ دیشیوں سے بھی منیجر کی باتوں کی تصدیق کی۔

بنگلہ دیشیوں میں رہن سہن بہت سادہ ہے اور ہر چیز میں کفایت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ کئی سال پہلے پاکستان میں ایک اخبار میں خبر پڑھی کہ بنگلہ دیش کی کرکٹ ٹیم کا ایک کپتان سائیکل رکشا میں بیٹھ کر پریکٹس کے لیے کرکٹ اسٹیڈیم جاتے ہوئے ٹریفک حادثہ میں زخمی ہوگیا۔ پاکستانیوں کو ضرور حیرت ہوئی ہوگی یہ خبر پڑھ کر کیونکہ یہاں تو کرکٹ کی قومی ٹیم میں شامل ہوجانے والا کوئی بھی کھلاڑی مہنگی سے مہنگی گاڑی میں سفر کرتا ہے۔

بنگلہ دیش میں 2004 میں اپنے پہلے دورے کے دران جب پہلی مرتبہ ایک جوائنٹ سیکرٹری کے دفتر میں میٹنگ کے دوران چائے آئی تو میرے سامنے چائے کی پیالی رکھ دی گئی۔ جس میں کالی چائے کا قہوہ تھا۔ میں انتظار کرتا رہا کہ اب دودھ اور چینی بھی رکھی جائے گی۔ اگر چہ میں چائے میں چینی نہیں پیتا تھا لیکن دودھ ضرور لیتا تھا۔ تھوڑی دیر انتظار کے بعد میں نے جوائنٹ سیکرٹری سے دودھ کے لیے کہا انہوں نے گھنٹی بجا کر کسی کو بلایا اور اشارے سے قریب آنے کا کہا پھر کان میں کچھ بات کی۔ تھوڑی دیر بعد واپس آ کر اسی شخص نے جوائنٹ سیکرٹری کے کان میں کچھ کہا اور چلا گیا۔ جوائنٹ سیکرٹری نے مجھ سے معذرت کی کہ دودھ اور چینی مہیا نہیں کی جاسکتی کیونکہ بنگلہ دیش میں سب لوگ کالی چائے بغیر دودھ اور چینی کے پیتے ہیں اس لیے دفتر میں یہ دونوں اشیاء موجود نہیں۔ اس واقعے کے بعد بھی مجھے ہمیشہ بنگلہ دیش میں چائے بغیر دودھ اور چینی کے پینی پڑی۔ دوسری بات میں نے یہ بھی نوٹ کی کہ چائے کے ساتھ کہیں بھی بسکٹ وغیرہ نہیں پیش کیے گئے۔ صرف ایک مرتبہ جب ہماری میٹنگ ایڈیشنل سیکرٹری سے ہوئی تو انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ چائے کے ساتھ کٹھل کی چھوٹی چھوٹی پھانکیں ایک پلیٹ میں پیش کیں اور کہا ہم اپنے خاص مہمانوں کی تواضع اس پھل سے کرتے ہیں جو بنگلہ دیش میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ ایڈیشنل سیکرٹری کا دفتر بھی پاکستان میں ایک سیکشن آفیسر کے دفتر سے بڑا نہیں تھا۔ فرنیچر صرف میز اور کرسیوں پر مشتمل تھا جو بہت ہی سادہ اور کم قیمت کی لگ رہی تھیں۔ نہ تو فائلیں رکھنے کے لیے کوئی ریک تھا نہ فائلوں کے لیے لکڑی کی ٹرے۔ تمام دفتروں میں آفیسر کے دائیں ہاتھ پر نئی فائلیں رکھ دی جاتی تھیں جن کو وہ دیکھ کر اور ضروری ہدایات لکھ کر بائیں جانب رکھ دیتا تھا۔ جہاں سے اس کا عملہ فائلیں اٹھا کر لے جاتا تھا۔ میں دفتروں میں اس سادگی کا پاکستان میں دفتروں سے مقابلہ کرکے حیران ہورہا تھا۔ کہ اسلام آباد میں سیکرٹریٹ کی عمارتیں۔ ان میں مختلف آفیسرز کے لیے مختلف سائز کے کمرے۔ ان میں قیمتی فرنیچر اور مختلف سہولتیں۔ جوائنٹ سیکرٹری اور اس سے اوپر کی تمام افسران کے لیے کوٹ ٹانگنے کے لیے قیمتی لکڑی کے اسٹینڈ۔ سیکرٹری کے دفتر میں اٹیچ باتھ روم۔

بیوروکریسی ایماندار۔ ملک سے گہرا لگاؤ

ایڈیشنل سیکرٹری اور سیکرٹری کے کمرے میں رنگین ٹی وی وغیرہ۔ جوائنٹ سیکرٹری اور اس سے اوپر کے افسران کے لیے سرکاری گاڑی اور ڈرائیور۔ غرض ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔

اکثر پاکستان میں یہ موضوع زیر بحث رہتا ہے کہ آخر بنگلہ دیش نے اتنی ترقی کیسے کرلی؟ ان کی برآمدات اور دوسرے ترقی کے

اشاریے پاکستان سے بہتر کیوں ہیں۔ میں نے بھی اس بات پر بحیثیت ایک معاشیات کے طالب علم کے بہت غور کیا میری دانست میں بنگلہ دیش کی ترقی کی وجوہ یہ ہیں۔

1۔ عوام بہت محنتی۔ محب وطن اور سادگی پسند ہیں۔

آبادی کی شرح میں خاطر خواہ کمی

2۔ بیوروکریسی ایماندار ہے اور ملک کے بہترین مفاد میں فیصلے کرتی ہے۔ سیاست دانوں کے ناجائز دباؤ سے آزاد ہے۔

3۔ ملک میں حالیہ تبدیلی سے پہلے سیاسی استحکام تھا اس لیے سرکاری اور نجی اداروں میں دوررس پالیسیوں کو اپنانے کی وجہ سے غیر ملکی سرمایہ کاری کو فروغ ملا۔

4۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے بنگلہ دیش کی سستی افرادی قوت کو استعمال کرنے کے لیے اپنے دفاتر اور فیکٹریاں بنگلہ دیش میں منتقل کردیں۔ پاکستان کے بین الاقوامی شہرت کے حامل ڈاکٹر محبوب الحق نے تیس سال پہلے ایک شہرہ آفاق جملہ کہا تھا کہ ترقی پذیر ممالک اپنی سستی افرادی قوت کو ترقی حاصل کرنے کے لیے بطور ہتھیار استعمال کریں۔ ان کی اس ہدایت پر سوائے پاکستان کے تمام ترقی پذیر ممالک نے عمل کیا اور خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ بدقسمتی سے پاکستان کا مزدور نہ تو سستا ہے اور نہ ہی کارکردگی میں دوسرے ترقی پذیر ممالک سے بہتر ہے مزدور عید۔ بقرعید اور دوسرے مذہبی تہواروں پر کئی کئی ہفتے چھٹیاں کرتے ہیں۔ اس لیے پاکستان میں ترقی کی رفتار بنگلہ دیش کے مقابلے میں کم ہے۔

5۔ بنگلہ دیش نے اپنے قیام کے فوراً بعد فیملی پلاننگ پر توجہ دی اور آبادی کی شرح میں خاطر خواہ کمی آ گئی۔

6۔ تعلیم کے شعبے پر سرمایہ کاری کی۔ غیر تربیت یافتہ مزدوروں کے لیے تربیتی ادارے قائم کیے اس طرح ان کی صلاحیتوں میں اضافہ سے نہ صرف ان کے معاشی حالات بہتر ہوئے بلکہ ملکی پیداوار میں بھی اضافہ ہوا۔ خواتین کو ہر شعبے میں ترجیحی بنیاد پر ملازمت دی گئی۔ یہ سب کام ہم پاکستانی کیوں نہیں کرسکتے؟ سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں کو اوپر دیے گئے نکات پر عمل کرنا چاہئے۔ اگر بنگلہ دیش یہ سب کچھ کرسکتا ہے تو پاکستان میں کس چیز کی کمی ہے۔ ہمیں سوچنا چاہئے۔ (ختم شد)

کتاب صحیح اور غلط کے درمیان فرق واضح کرتی ہے

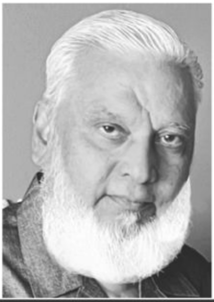

اشفاق بدایونی۔جدہ

ویسے تو کتاب ایک عام فہم سا لفظ ہے اور ہر کس و ناکس کتاب کی اگر معنویت نہیں تو اسکی ماہیت سے ضرور واقف ہے کچھ قدرے تفصیل میں جانے سے قبل ایک کمال کی بات بتا تا چلوں کہ مصنف پہلے کتاب لکھتا ہے پھر وہ پڑھی جاتی ہے مگر کائنات کی اس پہلی اور آخری کتاب کو ذہن میں لائیں جو پہلے پڑھی گئی پھر مجلد کتابی شکل میں لائی گئی ہے وہ ہے کتاب اللہ قرآن مجید۔

کتاب کہانی کوئی چونکا دینے والی کہانی تو نہیں ہے ہاں مگر آپ کے ذہن میں سوئے ہوئے معلوماتی خزانے کو ضرور روشن کردیگی۔

کتاب کہانی شروع کرنے سے پہلے کتاب کی اصل تعریف اور اصل معنویت پر ایک نظر ڈال لیتے ہیں۔

مختلف لغت میں کتاب کے معنی

1۔لکھی ہوئی چیز جو مجلد ہو(فیروز للغات، اظہر للغات،لغات کشوری)

2۔خط، پیغام،لکھائی مگر مجلد(القاموس الفرید) (عربی اردو لغت)

3۔نوشت نامہ،مکتوب،لکھت،تحریر،نسخہ(فرہنگ آصفیہ)

4۔مُجلّد لکھے ہوئے الفاظ کے اوراق(فرہنگ فارسی) (فارسی اردو لغت)

ان لغاتی حوالوں کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی بھی تخلیقی تحریر کو چاہے وہ نثر ہو یا نظم بہ اسم خاص مُجلّد کیا جائے تا کہ وہ تحریر محفوظ ہوجائے تو اسے کتاب کہتے ہیں۔

کتاب کی تعریف:-

کتاب اپنی جامع معنویت پانے کے بعد ایک اپنی صفت خاص کے جوہر دکھانے کیلئے بے چین رہتی ہے اور وہ یہ کہ کتاب نصاب زندگی کو پڑھانے کیلئے ایک خاموش اتالیق کا کردار ادا کرتی ہے اور وہ پڑھنے والے کے ذہن کو اتنا کشادہ اور روشن کردیتی ہے کہ وہ صحیح اور غلط کے درمیان خط تفریق کو واضح طور پر دیکھنے لگتا ہے اور یہ شعور صرف اور صرف کتاب دیتی ہے۔

تحقیقی مقالوں کے مطالعے اور تاریخی حوالوں کے تناظر میں اس بات کو مصدقہ طور پر بیان کیا جاسکتا ہے کہ آج سے قریباً پانچ ہزار قبل جنوبی عراق کے علاقوں میں بسنے والے لوگوں نے جنکو ''سومیر'' کہا جاتا تھا انہوں نے الفاظ کو لکھنے کا طریقہ ایجاد کیا۔اس سے قبل الفاظ کی کندہ کاری کی جاتی تھی۔ اس سے پہلے لفظی صوت کیلئے کچھ پرندوں اور جانوروں کی اشکال کو استعمال کیا جاتا تھا۔ الغرض سومیرین لوگوں نے مٹی کی پختہ تختیوں Baked Clay

> جس گھر میں کتاب
> نہ ہو ویرانہ ہے

Tablets لکھنے کا عمل شروع کیا اور ان ہی مٹی کی تختیوں پر Baked Clay Tablets پر پہلی کتاب تحریر کی گئی اور ان تختیوں کو کتاب کا نام دیا جبکہ کتاب نے اپنی اصلی شکل پر پہنچنے کیلئے کئی مراحل طے کیئے۔اولاً Tablets پر لکھائی کیلئے ایک نوکدار قلم استعمال کیا جاتا تھا جسے Stylus کہتے تھے آج اکیسویں صدی میں تحریر کیلئے Tablets کے مختلف متبادل سامنے آئے جو اچھے بھی تھے اور سستے اور محفوظ بھی۔پھر بھی یہ طریقہ تقریباً 5 صدیوں تک زیر استعمال رہا لیکن اتنی ترقی ضرور ہوگئی تھی کہ ان Tablets کو اوپر نیچے رکھ کر ایسی شکل میں لے آتے تھے جو آج کی کتاب کی شکل کے مشابہہ تھی صفحات کی بندھائی کا سلسلہ دوسری صدی سے لے کر آج تک ترقی کے منازل طے کرتا ہوا ساتھ چلا آرہا ہے۔ Tablets کی پہلی بائنڈنگ شدہ شکل کو ہی پہلی کتاب مانا جاتا ہے۔

مختصراً یوں سمجھ لیا جائے کہ 105 عیسوی میں جب چین نے کاغذ

ایجاد کیا۔ پھر تقریباً 500 سال بعد کاغذ بنانے کا طریقہ جاپان کے ہاتھ آیا پھر 600 سال سے زائد عرصے کے بعد پہلی مرتبہ اٹلی نے کاغذ تیار کیا نویں صدی عیسوی میں چین نے ہی پرنٹنگ مشین ایجاد کی اور لکڑی کے ابھرے حروف سے چھپائی کا کام شروع ہوا۔اس طرح چھپنے والی پہلی کتاب کو Diamond Sutra کہا جاتا ہے۔اور اب تک کی تحقیق کے مطابق 868 میں چھاپی گئی۔

کتاب چھاپنے کے تین مقاصد ہوتے ہیں جن میں ایک مقصد خفی ہوتا ہے اور دو مقاصد ظاہری ہوتے اور خفی مقصد اتنا اہم نہیں ہوتا جتنے دو ظاہری مقاصد۔

1۔مصنف کا تحریر کردہ مسودہ محفوظ ہوجائے۔

2۔کتاب قاری کے ہاتھ میں پہنچ جائے اور علم کے ابلاغ کا کام کرے۔

3۔ تیسرا مقصد جو ان کہا ہوتا ہے وہ ہے کتاب سے آمدنی کا حصول۔

کتاب سے بڑا دوست آج تک دنیا میں پیدا نہیں ہوا۔جس گھر میں کتاب نہ ہو۔ وہ گھر نہیں ویرانہ ہے۔ کتابوں سے دوستی کرلو الفاظ تمہارے اوپر نثار ہونے کو بے چین رہینگے۔

سرور علم ہے کیف شراب سے بہتر
کوئی رفیق نہیں ہے کتاب سے بہتر

کتاب پڑھیں۔ کتاب خریدیں۔ کتاب اپنے ساتھ رکھیں۔ یہ ہی کتاب کہانی ہے۔ ❀

ٹی وی ڈراموں کے موضوعات

’اطراف‘ نے ٹی وی ڈراما مافیا کا پیشہ ورانہ تجزیہ شروع کردیا ہے۔ ٹی وی ڈراما اب ایک بہت نفع بخش صنعت ہے۔ اربوں ڈالر کا کاروبار ہے۔ ملک کی بڑی آبادی خصوصا خواتین بہت متاثر ہو رہی ہیں۔ اس لیے ان کا غیر جانبدارانہ تجزیہ ناگزیر ہے۔ ہم جماعت اسلامی کے میڈیا مانیٹرنگ سیل کے شکریے سے یہ تحریریں شائع کر رہے ہیں۔ دوسری سیاسی پارٹیوں کو بھی یہ فریضہ انجام دینا چاہئے۔

ڈراموں میں ’عدت‘ کو زندگیوں سے ختم کرنے کی کوشش

جماعت اسلامی کے میڈیا مانیٹرنگ سیل کی تحقیق

’’جفا‘‘۔ ’’ایک چبھن سی‘‘۔ شعائر کے خلاف

تحریر: نصرت یوسف

طلاق ہو یا خلع تکلیف دہ ہوتے ہیں، چاہے وجہ کچھ بھی ہو۔ عورت بہ نسبت مرد کے رب کی نازک مخلوق ہے سوائے افسوس، جرم یا پریشانی زیادہ محسوس ہوسکتی ہے۔ اسے تکلیف اور مسترد کیے جانے کا خیال

توڑتا پھوڑتا زیادہ ہے ۔ حتیٰ کہ اگر زوجین کے درمیان جدائی باہمی رضامندی سے بھی ہو، تب بھی کچھ وقت کے لیے غصہ یا افسردگی جیسے مشکل جذبات کا سامنا کرنا قدرتی بات ہے۔ یہ فریقین کو ہوسکتا ہے لیکن خالق جانتا ہے کہ اسکی بنائی حوا کو اس سے نمٹنے اور صحتمند طور پر آگے بڑھنے کے لیے دنیا سے کنارہ کرتے کچھ وقت گزارنا ہوگا.. اس وقت کو وہ عدت کا نام دیتا ہے۔

> عورت کو سکھا رہے ہیں۔ ماں بننا چھوڑ دے

یہ وقت کنارے پر رہنے کا عورت کے لیے مخصوص ہے، چاہے اسکو طلاق ہوئی ہو یا اسنے خلع لی ہو یا اسکے زوج کو قضا لے گئی ہو۔ اسنے بہرحال عدت کا وقت ان تینوں صورتوں میں گزارنا ہے۔ اس دوران اسکی حفاظت ونگہداشت اسکے قریبی ترین رشتے داروں کے فرائض میں ہے۔

عدت کوئی ٹارچر یا سزا نہیں بلکہ یہ جذباتی ٹوٹ پھوٹ اور زندگی کے تجربوں سے سیکھ کر نئی پلاننگ بہتر طور پر، سوچ سمجھ کر کرنے کا وقفہ ہے، جس میں متاثرہ عورت کو بہت سی ذمہ داریوں سے آزاد کرتے رب آنے والی زندگی کے لیے منفیت سے دور رکھنا چاہتا ہے لیکن کیا المیہ ہے کہ اسی عدت اور اسکی پابندیوں کو ہمارے میڈیا اوتاروں نے ایک ناپسندیدہ اور پھر اس سے بھی بڑھ کر گم گشتہ تصور بنانے کی بھرپور کوشش مختلف ڈراموں کے ذریعہ کررہے ہیں۔ کہیں عدت کو سرے سے غائب کر کے اور کہیں منفی اور فتنہ پرور عورتوں کا اختیار کردہ طریقہ دکھا کر میڈیا انسانوں کو درست سمت کی جانب سے بھرپور زور لگاتے گمراہی جانب دھکیل رہا ہے۔

عدت اللہ کا حکم ہے، اور حکم کی بجا آوری مسلمانوں پر لازم ہے، میڈیا اسلامی جمہوریہ پاکستان کا چوتھا ستون ہونے کی ذمہ داری نبھائے نا کہ ملک خداداد کی نظریاتی بنیادوں پر تیشہ چلاتے اسکے لوگوں کو رب کی رحمت بھری آسانیوں سے دور کرے۔

ڈرامہ ”جفا“ اور ڈرامہ ”ایک چبھن سی“ میں طلاق کے بعد فوراً ہی لڑکیوں کو ’’نیو نارمل‘‘ کیفیت میں دکھانے کے لیے گھر سے باہر کی سرگرمیوں اور افراد کے ساتھ مصروف دکھایا جارہا ہے۔

انکی ذہنی جذباتی، جسمانی اور معاشرتی ضروریات، اور تحفظات کو نظرانداز کرتے عدت کو زندگیوں سے اکھاڑنے کی سعی کی جارہی ہے۔ اگر شوہر سے علیحدگی ہوجائے چاہے وہ زندگی کے مسائل کی صورت میں طلاق، خلع ہو یا موت کی بنا پر عدت مسلمان عورت پر رب العالمین کی طرف سے واجب ہے۔

عدت اس اینٹی وائرس ایپلی کیشن کی مانند ہے جو متاثرہ عورت کو معاشرے، فرد، گروہ، قبیلے کے ممکنہ منفی افکار، الزامات، نظریات یا استہزا سے ڈھال مہیا کرتا ہے۔ عورت کو ہر نامحرم رشتے سے دور کر کے اسکے محرم رشتے داروں کے دائرہ میں محدود کر کے ہر ہر فتنہ سے پناہ دیتا ہے۔ اس پناہ میں نہ آنے والی عورت شوہر سے علیحدگی کے مشکل وقت میں عدت بنا اپنی مشکلات میں خود طوفان پیدا کرتی ہے جیسے ڈرامہ ایک زرا سی چبھن میں نائلہ نے عدت سے انحراف کیا، بیرونی سرگرمیاں جاری رہیں اور احکامات کی پابندی بھی نہ کی تو کردار پر انگلیاں اٹھانے کا جواز ہوگئی۔ ناکردہ کی صفائیاں دینا آسان نہیں ہوتا جو عدت نہ کرنے سے چسپاں ہوگیا۔

> بیٹیوں کی ماؤں کو داماد اور بیٹی دونوں کو سمجھانا ہوتا ہے

انٹرٹینمنٹ انڈسٹری سے تعلق رکھنے والے افراد سے خصوصی گزارش ہے کہ عورت کے حقیقی ہمدرد بنیں اس پر رحم کریں اسے اسکے وہ حقوق دلوانے کی کوشش کریں جو اسکی ساخت اور ضروریات کے حساب سے اسکے خالق نے اسے دیے ہیں۔

’’زرد پتوں کا بن‘‘ اختتام کو پہنچا

تحریر: منیبہ راشد

زرد پتوں کا بن اپنے اختتام کو پہنچا۔۔۔

مقصدیت پہ مبنی ڈرامہ جسے لکھا تھا مصطفیٰ آفریدی نے جبکہ یہ پیشکش تھی کشف فاؤنڈیشن اور مومنہ درید کی۔

اس ڈرامہ کی خاص بات اس کا کردار "مینو" جسے پرفارم کیا سجل علی نے۔
سجل علی اس وقت پاکستان فلم اور ٹی وی انڈسٹری کی مہنگی اداکاراؤں میں سے ہیں۔

اپنی خوبصورتی اور چہرے کی معصومیت کے باعث ناظرین سجل کو بے حد پسند کرتے ہیں۔
سجل علی اس سے پہلے بھی مختلف بولڈ موضوعات پہ مبنی فلموں، ڈراموں اور ویب سیریز میں کام کر چکی ہیں۔ انہوں نے "دھوپ کی دیوار" نامی ویب سیریز میں پاکستان اور بھارت کے درمیان برسوں سے جاری چپقلش کے موضوع پہ کام کیا۔
ڈرامہ سیریز "زرد پتوں کا بن" جسے گزشتہ سہ ماہی میں "ہم ٹی وی" سے نشر کیا گیا ایسا ہی ایک ڈرامہ تھا جس میں بظاہر دیہات کے مسائل کو اجاگر کیا گیا جہاں لڑکیوں کی اعلیٰ تعلیم، ان کی صحت کے مسائل اور بچوں کی پیدائش کے وقت ماؤں کے ساتھ ہونے والے ناروا سلوک و معاشرتی ناہمواریاں۔ یہ سب وہ سلگتے ہوئے موضوعات ہیں جن کے لیے پاکستان کے ہر طبقے کو آواز اٹھانی چاہئے۔ ہر فورم پہ بات ہونی چاہیے۔
آخری قسط میں مینو تمام تر مشکلات و مخالفتوں کے باوجود گاؤں کی پہلی خاتون ڈاکٹر بننے میں کامیاب

ہو جاتی ہے۔۔۔
مینو کا کردار اور اس سے جڑے دیگر کردار جیسے کہ اس کے باپ کی مستقل سر پرستی، پھر مولوی صاحب اور دیگر کا کردار بلاشبہ انتہائی مثبت رہا۔
لیکن!!! ڈرامہ زرد پتوں کا بن جس خوبصورتی سے فلمایا گیا اس کی اسی خوبصورتی کے اندر وہ پیغام چھپا تھا جس کے ذریعے معاشرے کی ذہن سازی کی جا رہی ہے کہ گویا ماں بننا کوئی جرم ٹھہرا ہو!!!
ماناماں بننے کا عمل بلاشبہ مشکل ہے اور ہمارے رویے اور معاشرتی ناہمواریوں نے اس عظیم ذمہ داری کو مزید جاں گسل بنا دیا ہے لیکن کیا اس سب کے باوجود ہم اب عورت کو یہ سکھائیں گے کہ وہ ماں بننا چھوڑ دے یا وہ اب شادی سے پہلے شرطیں رکھے گی کہ جب مجھے بہتر لگے گا میں بچہ پیدا کروں گی اور ذہنی و جسمانی صحت نے اجازت نہ دی تو سرے سے بچہ پیدا ہی نہیں کروں گی بلکہ کسی اور کا بچہ گود لے لوں گی۔
کیا ہم نے بہت خاموشی سے اب یہ ذہن سازی شروع کر دی ہے کہ ہمیں فطرت کے اصولوں سے لڑنا ہے؟
کیا ہم نکاح کے بنیادی مقاصد کو فراموش کرنا چاہتے ہیں جس میں نسل نو کی افزائش نہ صرف ایک فطری عمل ہے بلکہ میاں اور بیوی کے رشتے کی مضبوطی کا بھی باعث بنتا ہے۔۔
عورت کا اگر ماں بننا مشکل عمل ہے تو اللہ نے اس کے لیے اجر اور انعام بھی تو کتنا رکھا ہے۔۔
اس کا درجہ باپ کے درجے سے تین گنا زیادہ رکھا ہے۔
کیا ہم اس دنیا میں اپنے مقصد وجود کو بالکل ہی فراموش کرنا چاہتے ہیں؟۔
کاش ڈرامہ بنانے والوں کے مقاصد نیک ہوتے تو وہ اس کے ذریعے عورت کو اس کے جائز حقوق دلوانے کی کوشش کرتے لیکن یہاں تو سارا زور اس بات پہ رہا کہ "میرا جسم میری مرضی"

"کبھی میں کبھی تم" شرجینہ کی والدہ کا کردار

تحریر: منیبہ راشد

لڑکپن میں ایک افسانہ پڑھا تھا لڑکی کی شادی ویسے ہی ہیرو سے ہو جاتی ہے جس کے نہ کوئی آگے ہوتا ہے نہ پیچھے۔ اور وہی ہیروئن شوخ چنچل ہیرو سنجیدہ مزاج۔۔
ابھی کہانی شروع ہی ہوتی ہے کہ کہیں صاحب کی الماری سے ریشمی دوپٹے میں لپٹی ڈائری برامد ہو جاتی ہے اور ہیروئین صاحبہ روتی دھوتی میکے پہنچ جاتی ہیں ادھر اماں جان ڈانٹ لگا کے بھگا دیتی ہیں خبردار جو آئندہ یوں شوہر سے ناراض ہو کے آئیں ہیروئین پھر روتے دھوتے گھر چلی جاتی ہے، گلے شکوے دور ہوتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے یہ تو بیگم صاحبہ کا ہی گمشدہ دوپٹہ ہے اور جب شہزادہ شہزادی ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں تو بیٹی ماں سے کہتی ہے اس روز آپ مجھے دشمن ہی تو لگی تھیں جب مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔
شرجینہ کی والدہ کا کردار بھی ایسا ہی ہے دھیما سا، پیار بھرا، بیٹی داماد کے رشتے کی نزاکت کو سمجھتا ہوا، شوہر صاحب جو بات بے بات داماد پہ چڑھ دوڑتے ہیں انہیں سمجھاتا ہوا۔ بیٹیوں کی ماؤں کو ایسا ہی ہونا چاہئیے وہ جانتی ہیں زندگی کے کس موڑ پہ عمر کے کس حصے میں مرد و عورت جو اب میاں اور بیوی کے خوبصورت رشتے میں بندھ چکے ہیں جو کل تک "میں" تھے اب "ہم" ہو چکے ہیں انہیں کیسے اپنے معاملات سے نمٹنا ہے۔۔۔۔ کیونکہ بیٹی کی ماں ہی وہ عورت ہوتی ہے جو کل خود بھی اس مقام پہ کھڑی تھی جہاں آج اس کی اپنی بیٹی کھڑی ہے اس کے بھی ویسے ہی نازک احساسات تھے کبھی وہ بھی حساس تھی وہ بھی کبھی تتلیاں پکڑنا چاہتی تھی لیکن کیونکہ وہ جان چکی ہوتی ہے کہ میاں اور بیوی کے رشتے میں عورت اگر نازک ہوتی ہے تو مرد پہاڑ کی مانند مضبوط اگر دونوں ہی مضبوط ہوتے تو ٹکرا کے ٹوٹ نہ جاتے رب نے کیسی خوبصورت بانڈنگ رکھی کیسی خوبصورت کمپوزیشن بنائی، بیٹی کی ماں جانتی ہے مرد جو اب اس کی لاڈلی کا شوہر ہے بظاہر لاپرواہ ہے نازک جذبوں کا خیال نہیں رکھ پاتا لیکن ذمہ دار تو وہ بھی ہے۔
اندر دل میں کہیں اس کی بیٹی کے لیے محبت بھی رکھتا ہے بس اظہار میں کنجوسی کر جاتا ہے، معاشی بوجھ نے اسے اس قابل ہی نہ چھوڑا کہ وہ اس وقت کو محسوس کر سکے جو تیزی سے ہاتھوں سے نکلے چلا جا رہا ہے۔ وہ جانتی ہے کل جب یہ دونوں زندگی میں چلنے والی آندھیوں سے نکل کے کھڑے ہوں گے اپنی آنکھوں سے دھول صاف کریں گے تو سامنے نظر آنے والا منظر کتنا شفاف ہوگا۔ اس لیے ایسی امیاں حوصلہ چھوڑتے داماد کو بھی سمجھاتی ہیں کہ بیٹا یہ شیطان کے وسوسے ہیں جو تمہارے رشتے کو خراب کر رہے ہیں۔ اور شاک میں چلی جانے والی بیٹی کو بھی بتاتی ہیں کہ وہ بچہ بس اتنی ہی زندگی لایا تھا دیکھو مصطفیٰ کتنا پریشان ہے تمہارے لیے۔
بیٹیوں کی ماؤں کو ایسا ہی ہونا چاہئے گھروں کو بسانے والی، سمجھانے والی، دور تلک دیکھنے والی۔۔۔ ورنہ امی تو مصطفیٰ کی بھی دیکھ رکھی ہیں آپ نے۔ ❁

60 سال سے زیادہ پرانی 3 کتابیں

ماہنامہ 'اطراف' کی خوش قسمتی ہے کہ فیس بک پر اس کی فریاد سننے والی بہت سے علم دوست ہیں۔ کتابوں کے عشاق ہیں۔ جناب غفور اسد ان میں سے ہی ایک ہیں۔ کراچی میں انہیں کتاب کے حوالے سے بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ ان کا کرم ہے کہ انہوں نے تین انتہائی اہم کتابوں کا تعارف اور ان کے سرورق کی تصاویر ڈاک سے ارسال کی ہیں۔ اس سے 'اطراف' کے کتاب نمبر کی وقعت دو چند ہو گئی ہے۔ ہم غفور اسد کے شکریے کے ساتھ یہ نادر سطور اور سرورق قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

1814۔ محمد بخش مہجور کی نورتن

تعارف: غفور اسد

نورتن

اردو ادب میں کلاسک کے حوالے سے ''نورتن'' جتنی مشہور ہے حسن اتفاق دیکھئے کہ اس کے مصنّف محمد بخش مہجور کے حالات زندگی اتنے ہی پوشیدہ ہیں۔ اس کتاب کی تصنیف کو ڈیڑھ سو سال سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے۔ ان ڈیڑھ سو سالوں میں اردو شعرا اور نثر نگاروں کے حالات زندگی پر کم و بیش 50 سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ لیکن ''نورتن'' کے مصنّف محمد بخش مہجور کا تذکرہ بمشکل 5 یا 6 کتب میں ملتا ہے اور یہ تذکرہ بھی بس برائے نام ہی ہے۔ یہاں ہم خود مصنّف کی زبانی ان کا تذکرہ کرتے چلیں جو فاضل مصنّف نے خود اپنی کتاب کے دیباچے میں کیا ہے۔

'احوال خود۔ سخن دان عیسیٰ نقی اور منشیان ''سخن رس''' پر مخفی و پوشیدہ نہ رہے کہ یہ ہیچ دان' دل پریشان محمد بخش نام متخلص نقل ہائے عجیب و قصہ ہائے غریب سے شوق رکھتا تھا۔ (نورتن۔ مطبوعہ' مفید عام پریس۔ لاہور)

کتاب نورتن کی تصنیف کا سال 1230 ہجری بمطابق 1814 ہے۔ محمد بخش مہجور نے نورتن کے علاوہ چار چمن' مثنوی ''موسیٰ باغ کی تعریف میں'' بھی تصنیف کیں جبکہ ان کا ایک دیوان بھی ہے۔

وہ 1240 ہجری میں بیت اللہ شریف گئے اور مدینے میں جا کر فوت ہوئے۔ شاعر اور نثر نگار ہونے کے ساتھ ہی وہ (محمد بخش مہجور) حکیم بھی تھے۔

وہ میاں جرات کے علاوہ مرزا خانی نوازش سے بھی اصلاح لیا کرتے تھے۔ (واضح رہے کہ لکھنو کے اس عہد میں سب سے ممتاز اور صاحب طرز تحریر نگار ''رجب علی بیگ سرور'' بھی مرزا خانی نوازش کے شاگرد تھے۔

کتاب نورتن کا زیادہ تر حصّہ خود انکا تصنیف کردہ ہے جبکہ کچھ حصّہ خصوصاً ''بدکار عورتوں کے چرتروں میں''۔ یقینا دوسری کتابوں سے ماخوذ ہے۔ ایسا ہی جیسا کہ ہمیں حیدر بخش حیدری کی ''طوطا کہانی'' کی دسویں داستان میں نظر آتا ہے۔

نورتن اگرچہ نثر کی کتاب ہے تاہم اس میں جا بجا اشعار بھی نظر آتے ہیں اور جو کہ خود مصنّف کی کتاب یعنی محمد بخش مہجور کے ہیں۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ 1267ھ بمطابق 1851 میں طبع ہوئی اس کے بعد اسے کئی مرتبہ شائع کیا گیا آخری مرتبہ اسے نول کشور نے 1919 میں شائع کیا اور یہ اس کا آٹھواں ایڈیشن تھا۔

کتاب کا موجودہ ایڈیشن خلیل الرحمن داؤدی نے مرتب کیا ہے جبکہ اسے ''مجلس ترقی ادب۔ لاہور'' نے سید امتیاز علی تاج (مرحوم) جو اس وقت ناظم ''مجلس ترقی ادب'' تھے کے زیر اہتمام شائع کیا ہے۔ سن اشاعت 1962 ہے۔

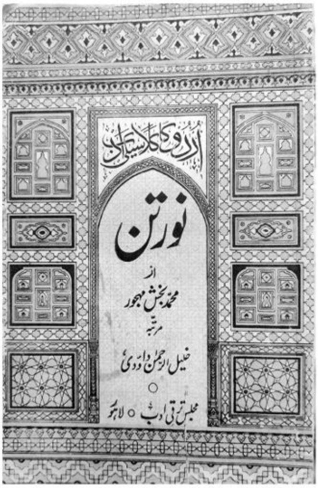

1944۔ جوش کا مجموعہ ''نقش و نگار''

نقش و نگار

شاعر انقلاب' جوش ملیح آبادی کے اس مجموعہ کلام کو کئی معنوں میں یادگار قرار دیا جا سکتا ہے۔ نظموں' غزلوں' گیتوں اور قطعات کی جو سوغات ان کے اس مجموعہ کلام میں نظر آتی ہے اس کی نظیر شاید ان کے دیگر مجموعہ کلام میں نظر نہ آئے۔ ان کی یہ تمام شاعری 1921 سے لے کر 1932 تک پھیلی ہوئی ہے۔ کتاب میں نظموں کے حوالے سے مختلف عنوانات بھی منتخب کیے گئے ہیں مثلا نگارخانہ، خمریات، تاثرات، مطالعہ و نظر (قطعات) وغیرہ۔

جوش ملیح آبادی کے اس مجموعہ کلام میں شامل چند نظموں کے عنوانات ملاحظہ فرمائیں۔ ''یہ کون اٹھا ہے شرماتا، جوانی کی آمد،

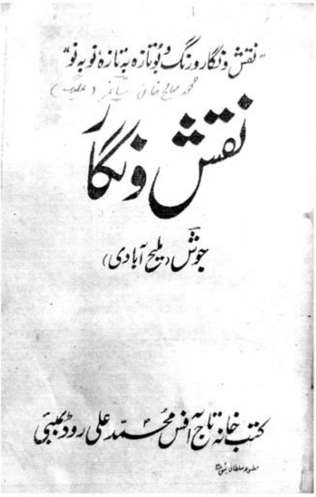

افشائے راز، نیچی نگاہیں، جمنا کے کنارے، مالن، اشک اوّلین، جنگل کی شہزادی، دکن کی عورتیں، حسن بیمار، جوانی کا تقاضا، یوم بہار، شب نشاط، آج کی رات، رقاصہ میکدہ، پیام کیف، پروگرام، وقت مروت، جوانی کی رات، یہ کھلونا، مفلسوں کی عید، غریب الوطن کا پیام، بہن کی یاد، خدا سے ایک سوال، عقیدہ لاینحل، تجاہل عارفانہ، شادی مرگ، نا قابل تسخیر، التجائے مرگ، گواہ رہنا، وغیرہ۔

1944 میں شائع کی جانے والی اس کتاب کے پبلشرز۔ کتب خانہ، تاج آفس، محمد علی روڈ، بمبئی (بھارت) ہیں۔

وادی قاف

اُردو ادب میں جب بھی اسرار و تحیر کی کہانیوں کے حوالے سے ذکر کیا جائے گا تو ناممکن ہے کہ مسز عبدالقادر کا ذکر نہ کیا جائے۔

1952۔ مسز عبدالقادر کی ''وادیٔ قاف''

اپنے دامن میں بے پناہ پُراسراریت لیے مسز عبدالقادر کی تحریر کردہ یہ کہانیاں ان کو اپنے ہم عصر ادیبوں سے ممتاز کرتی ہیں۔

اُردو میں اسرار و تحیر سے آراستہ کہانیاں لکھنے کا آغاز انہوں نے ہی کیا اور بلاشبہ انہیں اُردو کی پہلی تحیر خیز کہانی کار کے حوالے سے یاد کیا جاسکتا ہے۔ ان کی تحریر کردہ کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی منظر کشی ہے۔

مسز عبدالقادر اپنی کہانیوں کے ذریعے قاری کو ایک ایسی دنیا میں لے جاتی ہیں جہاں پُراسرار ماحول کے ساتھ حسین و دلکش مناظر بھی اسے مبہوت کردیتے ہیں۔

''وادی قاف'' ان کی تحریر کردہ کہانیوں کی چوتھی کتاب ہے جس میں چار کہانیوں کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔

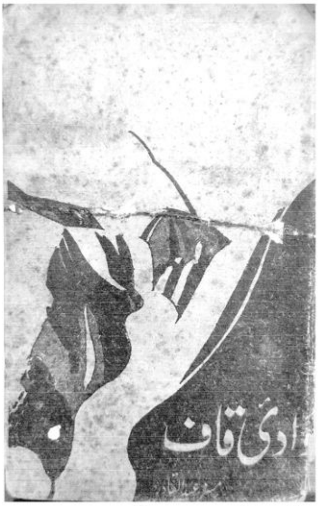

ان کہانیوں کے عنوانات ربابہ۔ ناگ دیوتا۔ وادی قاف اور رسیلا' ابتدا ہی میں قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرادیتے ہیں۔

اپریل 1952 میں شائع کی جانے والی اس کتاب کے پبلشرز ''اردو بک اسٹال'' لوہاری گیٹ۔ لاہور ہیں اور اسکی قیمت 8 آنے ہے۔ ❀

میر پور آزاد کشمیر میں کتابوں کی دکانیں

تحریر: جویریہ یاسمین

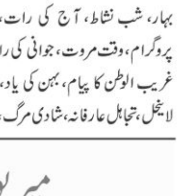

ہم 1976 میں میر پور آئے تو یہاں کتابوں کی چند ایک دکانیں تھیں مکتبہ رضوان جو ممتاز ہاشمی ایڈووکیٹ نے کھولی تھی ہاشمی صاحب خود بھی صاحب مطالعہ تھے اور دکان میں بھی علمی ادبی تاریخی اور دینی کتب کا معتدبہ ذخیرہ ہوتا تھا ادبی وسیاسی رسائل اور ڈائجسٹ بھی مل جاتے تھے اس کے علاوہ چائنہ بک ڈپو نیا مکتبہ شاردا بک ڈپو کے نام سے بھی کتب کی دکانیں موجود تھیں جن میں زیادہ تر نصابی کتب اور کسی حد تک ادبی و تاریخی کتب دستیاب تھیں۔

البتہ شاردا بک ڈپو والوں نے بعد میں ویری ناگ بک ڈپو اور یونیک کارڈز اینڈ بکس کے نام سے بھی دکانیں کھولیں جن میں ہر قسم کی کتب دستیاب تھیں۔

بعد کے سالوں میں ارشد بک سیلرز الفضل کتاب گھر کشمیر کتاب گھر آئیڈیل بک ڈپو کے نام سے بڑی دکانیں وجود میں آئیں لیکن یہ زیادہ تر نصابی کتب ہی فراہم کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ گلی محلے میں بھی کتب کی چھوٹی دکانیں ہیں جو نصابی کتب اور ان سے متعلقہ اسٹیشنری آئٹمز فروخت کرتی ہیں۔

بلوچستان کے سرحدی شہر چمن میں کتابوں کی دکانیں

تحریر: حفیظ اللہ خان

چمن اپنے محل وقوع کے لحاظ مشہور اور تجارتی شہر ہے ضلع چمن کی کل آبادی چار لاکھ چھیاسٹھ ہزار نفوس پر مشتمل ہے دینی وعصری علوم کے کافی سرکاری ونجی تعلیمی ادارے موجود ہیں یہاں مندرجہ ذیل کتب خانے ہیں

1۔ مکتبہ عزیزیہ
2۔ اسلامی کتب خانہ
3۔ مکتبہ علوم اشرفیہ
4۔ مکتبہ حقانیہ
5۔ مکتبہ دار العلم
6۔ عدیل سٹیشنری
7۔ گلوبل سٹیشنری
8۔ حافظ سٹیشنری
9۔ اقراء سٹیشنری
10۔ درویش سٹیشنری

سالانہ دو بڑے کتاب میلے۔ زیادہ کتابیں انگلش میں

تحریر: حافظ نعمان ساجد، ملائشیا

قوموں کے ادبی، اخلاقی، ابلاغی اور سماجی شعور میں کتاب کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے اس ضمن میں کتاب میلے جہاں تشنگان علم کو سیراب کرتے ہیں وہیں کسی معاشرہ کی زبان کو توانا رکھنے اور لوگوں کے ادبی ذوق جمالیاتی اور اخلاقی پہلوؤں کو بھی اجاگر کرتے ہیں ملائیشیا میں کتب بینی کا گو اتنا رجحان نہیں ہے جتنا پاکستان میں ہے مگر پھر بھی ملائیشیا میں ہونے والے اکا دکا بک فیئر کتابوں کی اہمیت کو دوچند کرتے ہیں۔ ملائیشیا میں سالانہ دو بڑے کتاب میلے منعقد ہوتے ہیں اول الذکر سرکاری سرپرستی میں ہونے والا کوالالمپور انٹرنیشنل بک فیئر ہے جس کا انعقاد پترا ورلڈ ٹریڈ سنٹر (پی ڈبلیو ٹی سی) میں کیا جاتا ہے اس بک فیئر کو ملائیشیا کی وزارت تعلیم اور نیشنل بک کونسل آف ملائیشیا آرگنائز کرتی ہیں کوالالمپور انٹرنیشنل بک فیئر کو ملے زبان میں پستا بوکوانتارابنگسا کہتے ہیں یہ کتاب میلہ 1981 سے منسٹری آف ایجوکیشن ملائیشیا کے تحت مسلسل منعقد ہو رہا ہے اس کتاب میلہ میں کافی گہما گہمی ہوتی ہے اور ملے عوام کی کثیر تعداد اس میلہ میں شرکت کرتی ہے ملائیشیا کے قومی ادب کے فروغ میں کوالالمپور انٹرنیشنل بک فیئر کو بہت اہم تصور کیا جاتا ہے تقریباً سات سو کے لگ بھگ بک سٹالز اس کتاب میلہ میں لگتے ہیں ملے زبان میں دو رسم الخط رائج ہیں جن میں ایک عربی رسم الخط جاوی کے نام سے رائج ہے جبکہ دوسرا ملے رسم الخط انگلش زبان میں رائج ہے زیادہ تر ملے کتابیں ملے انگلش رسم الخط میں شائع ہوتی ہیں جبکہ جاوی رسم الخط کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے زیادہ تر ملے اسلامی مذہبی کتب جاوی رسم الخط میں شائع ہوتی ہیں کوالالمپور انٹرنیشنل بک فیئر میں زیادہ تر ملے ادب اور ملے زبان کی کتابیں فروخت کے لئے رکھی جاتی ہیں اس کتاب میلہ کا بنیادی مقصد ملے زبان و ادب کو فروغ دینا ہے۔ ملائیشیا میں دوسرا کتاب میلہ big bad wolf book fair ہے جس میں صرف انگلش زبان کی فکشن نان فکشن ناولز بچوں بڑوں کے لئے کتابیں فروخت کے لئے پیش کی جاتی ہیں ملائیشیا میں ملے کے بعد انگلش زبان کو وسیع پیمانے پر بولا اور سمجھا جاتا ہے انگلش دان طبقہ میں بگ بیڈ وولف بک فیئر کو زیادہ پذیرائی ملتی ہے ایک بار ایک تامل ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے بتایا کہ ہمیں ٹیکسی کا لائسنس ملنے سے پہلے انگلش بول چال پر مبنی چھ ماہ کا کورس کرایا جاتا ہے ویسے بھی ایشیائی ممالک میں ملائیشیا میں شرح تعلیم بہت بلند ہے۔

ملک بھر میں 8 ہزار کے لگ بھگ بک اسٹورز

2014 میں تائی پی چائینیز سنٹر کے اشتراک سے ملائیشین اور تائیوان کی مختصر کہانیوں پر مبنی کتاب میلہ منعقد کیا گیا ملائیشیا میں بک سٹورز ایک انڈسٹری کی صورت اختیار کر گئے ہیں ملائیشیا میں تقریباً آٹھ ہزار کے لگ بھگ بک سٹورز ہیں جو ہر سٹریٹ کارنر اور شاپنگ مالز میں موجود ہیں علاوہ ازیں ملائیشیا میں اکثر دکانوں، فرنچائز چھوٹے بڑے سٹوروں میں بھی الگ سے فیشن اور لائف سٹائل سے متعلق میگزینز، رسالوں اور بچوں کی کامکس بکس وغیرہ کا کارنر موجود ہوتا ہے۔ سیون الیون سٹور میں تو بک کارنر کے علاوہ مقامی اخبارات بھی سیل ہوتے ہیں ملائیشیا میں خصوصاً اسلامی کتب اور مافوق الفطرت قصے کہانیوں پر مبنی کتابوں کو بہت پسند کیا جاتا ہے ابھی حال ہی میں میری قریبی جامع مسجد تنکو امپوآن جماع میں سالانہ میلاد رسول کی محفل کا انعقاد کیا گیا جس میں حضرت شیخ عبد القادر جیلانی غوث پاک رحمۃ اللہ علیہ کی آل سے 34 ویں خلیفہ بھی مہمان خصوصی تھے اس روحانی محفل میں ہر دوسرے تیسرے سٹال پر اسلامی کتب بھی فروخت کے لئے رکھی گئی تھیں اسلامی کتب سے یاد آیا کہ ایک بار میرے والد ساجد صدیق انصاری صاحب نے اسلامیہ ہائی اسکول وہاڑی کے گراؤنڈ میں ہونے والے تبلیغی جماعت کے اجتماع میں دینی و اسلامی کتب کا سٹال لگایا اور راقم نے بھی اس سٹال میں اپنے والد کا ہاتھ بٹایا تھا۔ ملائیشیا میں گو کہ کتب بینی کا رجحان نارمل ہے مگر ملائیشیا کے تقریباً ہر سرکاری و غیر سرکاری ادارے تنظیمیں اپنے اپنے مجلّے، کتابچے میگزین وغیرہ تواتر سے شائع کرتے ہیں یعنی یہاں پرنٹنگ پریس کا اچھا خاصا کام ہے میری بیٹیوں کے گرین ویو انٹرنیشنل سکول کا میگزین باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے جو اساتذہ سکول کی کارکردگی بچوں کی نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں پر مبنی رپورٹس اور تصاویر پر مشتمل ہوتا ہے اس سے آپ خود اندازہ لگالیں کہ ملائیشیا میں کتابوں کے علاوہ بھی مختلف اداروں کے اپنی کارکردگی، تشہیر اور سرگرمیوں پر مشتمل اپنے اپنے میگزینز اور کتابچوں وغیرہ کا متوازی سسٹم بھی فعال ہے قارئین اطراف کی خدمت میں ملائیشیا کے مشہور بک سٹورز کے نام پیش کر رہا ہوں۔ مونا لیزا اک سٹور، MPH، سوتایا بکس، کینوکونیا، book Xcess اور پاپولر بک سٹور شامل ہیں پاپولر بک سٹور پر میں اپنی فیملی کے ہمراہ دو تین بار بچوں کے لئے کتابیں اور اسٹیشنری اشیاء خرید چکا ہوں آج کل پاپولر بک والوں نے روایتی نرخوں پر Aeon mall میں بک فیئر بھی لگایا ہے۔ ستیا عالم میں دی نیوز کے نام سے ایک شاندار بک سٹور کھلا ہے جس میں لوگوں خصوصاً بچوں میں کتب بینی کا ذوق پیدا کرنے کے لئے وہاں دو تین گھنٹے بیٹھ کر مفت میں کتابیں پڑھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ ملائیشیا میں بک سٹورز کے علاوہ آن لائن پلیٹ فارمز شاپی اور لزادا وغیرہ کے ذریعے بھی گھر بیٹھے بک منگوائی جاسکتی ہیں بک سٹورز والوں نے بھی خود کو آن لائن پلیٹ فارمز اور آن لائن کاروبار سے منسلک کرلیا ہے۔

دی نیوز اسٹور میں دو تین گھنٹے مفت کتابیں پڑھنے کی ترغیب

موضوعات قرآن انسائیکلوپیڈیا۔ قرآن فہمی کے فروغ کا سبب

عالمی شہرت یافتہ اسکالر ڈاکٹر محمد خالد مسعود کے تاثرات

تحقیق و تالیف : جناب سعید الظفر صدیقی، طابع : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور۔ کراچی میں ویلکم بک پورٹ، اردو بازار اور لاہور میں ماورا بکس ، شاہراہ قائداعظم سے اور دیگر تمام مشہور بک سیلرز کے ہاں دستیاب ہے۔ مولف سے براہ راست رابطہ کے لئے 0322-2211686

دورجدید میں دنیا کی اکثر زبانوں میں قرآن کریم کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ آج کل قرآن کریم کی تلاوت کے ساتھ ساتھ قرآن کریم کے موضوعات مطالعہ کا شوق بھی بڑھ رہا ہے۔ چنانچہ قرآنی موضوعات پر الگ سے کتابیں بھی دستیاب ہیں اور موضوعات قرآن کے متعدد اشاریے بھی لکھے جا چکے ہیں۔ ایک عرصے سے ایک ایسے تفصیلی اور جامع اشاریے کی ضرورت محسوس کی جارہی تھی جس میں قرآنی موضوعات کو حروف تہجی کے حساب سے ترتیب دیا گیا ہو اور جس میں بنیادی موضوعات کے ساتھ ذیلی مضامین کو شامل کرتے ہوئے قرآن کی جامعیت کو اجاگر کیا گیا ہو۔ جناب سعید الظفر صدیقی صاحب نے موضوعات قرآن انسائیکلوپیڈیا کے عنوان سے یہ تفصیلی اشاریہ ترتیب دے کر اس دیرینہ ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

یہ انسائیکلوپیڈیا ۶۸۹۲ صفحات کی سات ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔ جس میں ۲۱۰۲ اردو اور ۲۰۵۰ انگریزی موضوعات پر قرآنی آیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

انسائیکلوپیڈیا میں یہ اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ قارئین کی سہولت کے لئے ہر جلد کے شروع میں انسائیکلوپیڈیا کی ساتوں جلدوں کے موضوعات کی مکمل فہرست اردو اور انگریزی میں دے دی گئی ہے۔ اور ہر موضوع پر متعلقہ قرآنی آیات کو عربی میں اور ان کا اردو اور انگریزی مستند ترجمہ بھی ساتھ دیا گیا ہے۔

مولف نے جس محنت اور لگن سے یہ کام سرانجام دیا ہے وہ اس شرف پر ہم سب کی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ امید ہے کہ یہ کتاب جہاں ہر گھر میں قرآن فہمی کے فروغ کا سبب بنے گی، وہاں یہ انسائیکلوپیڈیا علما، مفتیان، اساتذہ اور طلبا اور تحقیق و تصنیف سے تعلق رکھنے والے اہل علم کے لئے بھی مشعل راہ ثابت ہوگا۔

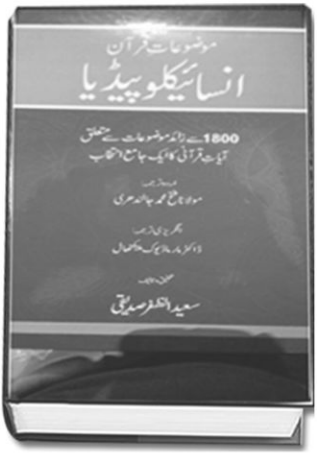

کوریا کی ہان کانگ نوبل انعام کی حقدار کیسے ٹھہریں

تحریر: اسداللہ میر الحسنی

ہانگ کانگ کے ادبی سفر میں ان کی انگریزی مترجمہ، ڈیبورا اسمتھ کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے، جنہوں نے ان کے معروف ناول ''The Vegetarian'' کو انگریزی زبان میں منتقل کیا۔ یہ ترجمہ برطانیہ کی مشہور پبلشنگ ہاؤس، پورٹو بیلو بکس کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ ان دونوں خواتین کا نام اُس وقت عالمی ادبی حلقوں میں گونج اٹھا جب انہیں مشترکہ طور پر 2016 میں مین بکر انٹرنیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا۔

آج جب ہان کانگ کو نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا، تو ان کی خوشی دیدنی تھی۔ یہ کامیابی نہ صرف ہان کانگ کی ذہنی گہرائیوں کی عکاسی ہے، بلکہ ڈیبورا اسمتھ کی ماہرانہ ترجمانی کا بھی کمال ہے، جس نے ہان کانگ کے تخلیقی الفاظ کو عالمی سطح پر وہ مقام دلایا جس کی وہ حق دار تھیں۔

مترجم کا کردار کسی بھی ادبی تخلیق کو ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے میں کلیدی ہوتا ہے۔ مترجم نہ صرف زبان کے الفاظ بلکہ اس کی روح، تہذیب اور مصنف کی فکر کو بھی اپنے قارئین تک پہنچاتا ہے۔

ڈیبورا اسمتھ کی طرح کے مترجمین کے بغیر، ادب کے بہت سے اعلیٰ شاہکار محدود زبانوں تک قید رہ جاتے۔

درحقیقت، کسی بھی مصنف کو عالمی سطح پر پہچان دلانے اور انعامات تک پہنچانے میں مترجم کا حصہ اتنا ہی اہم ہوتا ہے جتنا خود مصنف کا، کیونکہ وہ ایک پل کی مانند دونوں ثقافتوں کو جوڑتا ہے اور ایک نئے قاری کے دل میں مصنف کے خیالات کا بیج بوتا ہے۔

تمام مترجمین اور کورین ادب کو مبارک ۞

21 ویں صدی کا ہندوستان اور کتاب

”کول کتہ یونیورسٹی میں شعبہ اُردو کی سابق صدر۔اقبال چیئر پروفیسر۔ڈاکٹر شہناز نبی 'اطراف' کی قلمی سرپرستی کرتی ہیں۔نظم کی صف اوّل کی شاعرہ ہیں۔'جنگ' کے 'امن کی آشا' کے سلسلے میں کراچی آچکی ہیں۔'کتاب نمبر' کے لیے اسے درخواست کی گئی تھی۔تو انتہائی مصروفیت کے باوجود انہوں نے ہندوستان اور بالخصوص بنگال میں اُردو ہندی۔انگریزی بنگلہ کتابوں کے بارے میں اعداد و شُمار کے ساتھ بہت ہی معیاری تحریر سے نوازا ہے۔ہم ان کے ممنون ہیں کہ انہوں نے گرانقدر تعاون کیا ہے۔اس سے 'اطراف' کے کتاب نمبر کی وقعت دو چند ہو گئی ہے۔“

کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان 7 ویں نمبر پر

پروفیسر شہناز نبی۔ کول کتہ (انڈیا)

ہندوستان میں انٹرنیٹ سے بڑھتی ہوئی دل چسپی کے باوجود کتابیں خریدنے، پڑھنے اور لائبریری جانے کا ذوق وشوق

علاقائی زبانوں میں بنگلہ سب سے آگے

ہمیشہ کی طرح قائم ہے۔ عالمی سطح پہ کتابوں کی اشاعت میں ہندوستان ساتویں نمبر پر آتا ہے۔ کتابیں نہ صرف مختلف زبانوں میں بلکہ مختلف موضوعات پر سال بھر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بڑی زبانوں کو بڑے بڑے پبلشرز مل ہی جاتے ہیں لیکن علاقائی زبانوں میں عموماً مصنف اپنی جمع پونجی لگاتا ہے۔ یوں تو زیادہ تر کتابیں انگریزی اور ہندی میں ہی شائع ہوتی ہیں لیکن علاقائی

اُردو کتابیں مصنف کی مدد اُردو اکادمیاں کرتی ہیں

زبانوں میں بنگلہ زبان کو کافی سرخروئی حاصل ہے۔ کلکتہ (موجودہ کولکاتا) میں ہر سال کتابوں کا عالمی میلہ لگتا ہے جہاں دنیا بھر سے ناشرین کولکاتا آتے ہیں اور اسٹال خرید کر اپنی طباعت کی نمائش اور فروخت کا انتظام و انصرام کرتے ہیں۔ اس کی شروعات 1976ء میں ہوئی تھی۔ آج تک یہ میلہ اسی جوش وخروش سے لگایا جاتا ہے اور آنے والے بھی اسی جوش وخروش سے آتے اور کتابیں خریدتے ہیں ۔ بنگال کے گاؤں بھی امڈ پڑتے ہیں اور اس طرح یہ میلہ دس دن تک لوگوں کو روحانی غذا فراہم کرتا رہتا ہے۔ ہندوستان بھر سے مختلف ریاستی اکیڈیمیاں بھی شامل ہوتی ہیں اور مقامی پبلشرز بھی۔ میلے میں کتابوں کی خرید وفروخت کے ساتھ ساتھ تہذیبی وثقافتی پروگرام اور علمی و ادبی مباحثے بھی ہوتے رہتے ہیں۔ اس میلے کو تجارتی مقصد کے تحت نہیں لگایا جاتا بلکہ اس کا مقصد عوام میں کتابوں سے دلچسپی کو فروغ دینا ہے۔ کولکاتا کا کتابی میلہ عام انسانوں کی شمولیت کے اعتبار سے فرینکفرٹ اور لندن کے کتابی میلے کے بعد تیسرے نمبر پر آتا ہے۔ اس میں بچوں کے ادب کا اسٹال الگ ہوتا جہاں بچے نہ صرف اپنی پسندیدہ کتابیں خریدتے ہیں بلکہ دوسرے علمی و ادبی دلچسپیوں کے سامان بھی خریدتے ہیں۔ اب ویڈیو بکس (Video Books) بھی آنے لگی ہیں۔ پبلشنگ اور بک سیلرز گلڈ کے جنرل سیکرٹری تری دیب چٹرجی کی اطلاع کے مطابق کولکاتا کے انٹرنیشنل بک فیئر نے 2023ء میں تقریباً 26 کروڑ روپے کا بزنس کیا۔ کتابوں کے شائقین کی تعداد کم وبیش 26 لاکھ تھی۔ کتابی میلہ 21 جنوری سے 12 / جنوری تک چلتا رہا۔

کول کتہ کتابی میلہ۔فرینکفرٹ اور لندن کے کتاب میلوں کے بعد تیسرے نمبر پر

ہندوستان میں اعلیٰ پائے کے بڑے بڑے پبلشرز کی اچھی خاصی تعداد ہے۔ جو مختلف زبانوں اور مختلف موضوعات پر کتابیں چھاپتے رہتے ہیں مثلاً فکشن، سائنس فکشن ، فنٹاسی ، رومانس، ایجوکیشن ،سوانح ، یاداشتیں، سیر و سیاحت کھیل کود، صحت ، جرائم وغیرہ۔ان میں سے زیادہ تر پبلشرز دہلی ، بنگلور اور ممبئی کے ہیں اور ان کے پبلشنگ ہاؤس بھی ان ہی شہروں میں ہیں۔ علاقائی

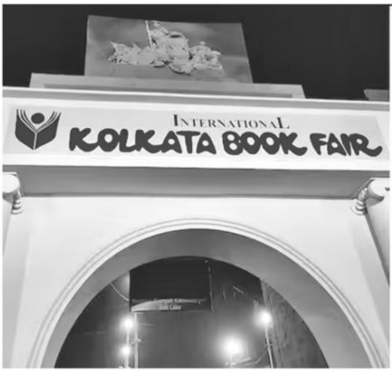

زبانوں میں بنگلہ زبان میں خوب کتابیں چھپتی ہیں۔کلکتہ یونیورسٹی ،کالج اسٹریٹ میں واقع ہے۔آس پاس کئی کالج ہیں۔ یہاں نہ

ریاستوں میں قائم اُردو اکادمیاں ۔ اردو میں ترجمہ۔ کتاب کی اشاعت کی ذمہ دار ہیں

صرف انگریزی اور بنگلہ میں چھپنے والی نئی کتابیں خوب فروخت ہوتی ہیں بلکہ پرانی کتابوں کا بھی بہت بڑا بازار ہے۔شائقین پرانی کتابوں کے انبار سے بھی اپنی ضرورت کی کتابیں خریدتے رہتے ہیں ۔کلکتہ کے پبلشروں میں 'دے پبلشرز' سستے داموں کتابیں چھاپنے اور بیچنے کے لئے مشہور ہے۔ کالج اسٹریٹ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز ہے اس لئے یہاں کچھ دکانیں سیاسی موضوعات پر کتابوں کا اچھا ذخیرہ رکھتی ہیں۔کولکاتا میں ساہتیہ اکادمی، نیشنل بک ٹرسٹ وغیرہ کی شاخیں ہیں اس لئے ان انجمنوں کی کتابیں بھی ان کے مقامی کاؤنٹر پہ دستیاب ہو جاتی ہیں۔

جہاں تک اردو کا سوال ہے تو دوسری علاقائی زبانوں کے مصنفین کی طرح اردو کے مصنفین بھی اپنی کتابیں خود شائع کرواتے ہیں ورنہ مالی تعاون کا ذریعہ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں قائم کردہ اردو اکیڈیمیاں بھی ہیں۔1970ء میں ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اُس وقت کی سرکار نے اردو

ملک گیر سطح پر قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان بھی کتاب کی اشاعت، خریداری میں تعاون کرتی ہے

اکیڈمیوں کی بنیاد ڈالنے کا سلسلہ شروع کیا۔مقصد تھا اقلیت کی زبان یعنی اردو کا فروغ۔اگرچہ یہ اکیڈیمیاں اب کسی کسی ریاست میں فعال ہیں اور کسی میں نیم مردہ۔ یہ اکیڈیمیاں ریاستی سرکار کے مختص کردہ سالانہ فنڈ سے چلتی ہیں۔ان میں اردو مصنفین کی کتابوں کی اشاعت کے لئے جزوی طور پہ مالی معاونت کی جاتی ہے۔علاوہ ازیں اکیڈمی سے چھپی ہوئی اردو کتابوں کا سیلز کاؤنٹر بھی ہے جہاں سے کتابیں بالخصوص نصابی کتابیں فروخت ہوتی ہیں۔کلکتہ کے عالمی کتاب میلہ میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا اسٹال تو لگتا ہی ہے اس کے علاوہ چند سرکاری ،نیم سرکاری اداروں کا اسٹال بھی لگتا ہے۔کلکتہ کتابی میلہ میں دہلی، ممبئی اور دوسرے شہروں سے اردو کتابیں فروخت کرنے کے لئے کچھ پرائیوٹ پبلشنگ ہاؤس کے نمائندے بھی آتے ہیں جو اردو کتابوں کی اشاعت اور فروخت میں سرگرم ہیں۔ جہاں تک پرائیوٹ پبلشرز کا سوال ہے تو ان کے اور مصنفین کے درمیان معاہدے کے مطابق کام ہوتا ہے۔ اردو مصنفین کی شائع شدہ کتابوں کی کچھ کاپیاں بھی مختلف اکیڈمیاں ضابطے کے مطابق خریدا کرتی ہیں۔ یہ کتابیں مختلف لائبریریوں کو تحفہ دی جاتی ہیں۔ ہندوستان کی ریاستی اکیڈمیاں اگر فعال ہوں تو ممکن ہے کہ ہر کام وقت پہ ہوتا رہے۔ کچھ تو اردو اکیڈمیز کے تعلق سے ریاستی حکومت کا متعصّبانہ رویہ بھی ذمہ دار ہوا کرتا ہے۔یعنی اگر فنڈ میسر نہ آئے تو کام کاج ٹھپ ہو جاتا ہے۔کسی کسی ریاست میں اردو داں طبقے کے ووٹ بینک کو مدنظر رکھتے ہوئے فنڈ میں کمی نہیں کی جاتی بلکہ سالانہ بجٹ میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔اب یہ الگ بات ہے کہ اکیڈمیوں کا نظم ونسق سنبھالنے والے ممبران کو

بعض اردو اکادمیوں کی زیادہ توجہ مذہبی کتابوں پر

کتابوں کی اشاعت میں دلچسپی رہتی ہے یا سالانہ تقریبات میں منعقد ہونے والے قوالیوں کے پروگرام، مشاعرہ، بیت بازی وغیرہ میں۔اگر تقریبات میں زیادہ دلچسپی رہی تو ان پہ زیادہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ ہر ریاست میں، جہاں حکومت نے اکیڈمیاں قائم کی تھیں وہاں ریاستی زبان کے ادب کو اردو میں ترجمہ کروانا اور پھر کتابی شکل میں شائع کروانا، اردو اکیڈمی کی اہم ذمہ داریوں میں شامل ہوتا ہے۔ تاہم اکثر اردو داں حضرات مقامی زبان سے نابلد ہوتے ہیں۔اگر مقامی زبان کی تھوڑی سی شد بد ہوئی بھی تو وہ ادبی ترجمہ کرنے کے لئے ناکافی ہوتی ہے۔ترجمہ کا کام اتنا آسان نہیں کہ دو زبانوں کی واجبی معلومات کافی ثابت ہو سکے۔ کچھ اکادمیاں مذہبی رسائل پہ زیادہ توجہ دیتی ہیں اور اسی طور پر کتابوں کی تیاری اور خریداری کا معاملہ طے پاتا ہے۔اکثر اردو اکادمیاں حج کمیٹی اور اقلیتی امور کے وزیر کو سونپ دی جاتی ہیں چاہے وزیر اردو زبان اور اردو داں طبقے کے مسائل سے کتنا ہی نابلد کیوں نہ ہو۔

ہندوستان گیر پیمانے پر اردو کو فروغ دینے کے لئے 1996ء

امیزون۔فلپ کارٹ چڑیاں بیچنے کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی بیچ رہے ہیں

میں قومی کاؤنسل برائے فروغ اردو زبان کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا دفتر دہلی میں ہے۔لگ بھگ اٹھائیس سالوں سے کاؤنسل مسلسل کام کر رہی تھی ۔ مسودوں پہ مالی اعانت، رسالوں وکتابوں کی اشاعت، کتابوں کی خریداری کئی زبانوں کی درس و تدریس کا انتظام، کمپیوٹر کلاسیس، سیمینار، لیکچرز وغیرہ۔ تاہم پچھلے دو سالوں سے قومی کاؤنسل میں اردو کتابوں کی خریداری اور لائبریریوں کو خریدی ہوئی کتابیں تحفہ دینے کا سلسلہ رکا پڑا ہے۔ اس سے اردو مصنفین کا ایک بڑا طبقہ خاصہ متاثر ہوا ہے۔ اردو کتب و رسائل کی نکاسی اپنے آپ میں ایک مسئلہ تھی ۔ اب حالات زیادہ سنگین ہو گئے ہیں۔ بدنصیبی یہ ہے کہ اردو داں طبقہ اردو کے فروغ اور بقا کے لئے حکومت وقت کا منہ تکتا رہتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہندوستان میں مٹھی بھر اردو کتابوں کی نکاسی کوئی بہت بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ سارا مسئلہ اردو والوں کی بے حسی اور جیب سے پیسے خرچ کر کے کتابیں خریدنے اور پھر پڑھنے کا ہے۔اکثر اردو داں خواتین وحضرات کو اگر آپ مروتا کوئی کاپی مفت میں دے دیں تو یہ شرط نہیں کہ وہ اسے پڑھیں گے بھی۔کولکاتا میں اردو کتابوں کی دوکانیں ہیں لیکن زیادہ تر ذاتی ہیں۔ جو پیشہ ور دوکاندار ہیں وہ کتابیں بیچ کر پیسے کھا جاتے ہیں۔لیکن کولکاتا کے اردو داں طبقے میں ایسے لوگ بھی ہیں جو کتابیں شوق سے خریدتے اور پڑھتے ہیں۔افسوس کہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے۔ اب اردو اخبارات بھی کم سے کم شائع ہوتے ہیں کہ ای۔اخبار کا دور چل نکلا ہے۔آپ کو اخبار پسند ہو یا نہ ہو، آپ کو اس کے مواد اور نظریے میں دلچسپی ہو نہ ہو، وہ آپ کے وائس۔ ایپ میں ہر صبح گھس پڑے گا اور آپ کے موبائل کا اسپیس کھا جائے گا۔

اب تو اردو کتابوں کو دیوناگری میں لکھوا کر شائع کرنے کا کاروبار چل پڑا ہے۔ یہ ترجمہ نہیں بلکہ اردو کے رسم الخط کو نقصان پہنچانے کا کام ہے۔جن کتابوں کی کاپی رائٹ ختم ہو گئی ہے، ان کی بھی لوٹ مار مچی ہے۔ اب امیزون اور فلپ کارٹ بھی ملبوسات، زیورات، فرنیچر، الیکٹرونک گڈس، عورتوں مردوں، بچوں کی چڈیاں بیچنے کے ساتھ ساتھ کتابیں بھی بیچنے لگے ہیں۔ بیچنے کا ہنر ہو تو ہر چیز بک جاتی ہے۔

کولکاتا میں ہندی کتابیں شائع ہوتی ہیں لیکن محدود طور پر۔ انگریزی میڈیم اسکولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے سبب ہندی کی درسی کتابوں کی اشاعت کو بھی دھکا لگا ہے۔ رہی پرائمری اسکولوں کی بات تو پرائمری کی کتابیں سرکار تیار کرواتی ہے، شائع کرواتی ہے اور مفت فراہم کرتی ہے۔ ہندی ادبا وشعرا اپنی تخلیقات کبھی ذاتی طور پہ چھپواتے ہیں اور کبھی سرکاری اداروں کی مالی معاونت سے۔ ہندی سرکاری زبان ہے، اس کے بڑے بڑے ادارے ہیں، اس لئے طباعت واشاعت کے ساتھ ساتھ کتابوں کو بیچنا بھی مشکل نہیں۔

راقم الحروف نے کتابوں کی نکاسی سے متعلق ایک مختصر سی تحریر بلا کم و کاست پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں ساری تفصیلات کو سمونا ممکن نہیں تھا اور مناسب بھی نہیں۔ البتہ جن حقائق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کی روشنی میں کتابوں کی نکاسی کے راستے تلاش کئے جاسکتے۔ ❁

بھارت میں اُردو کتب کی اشاعت کی صورتِ حال

”'اطراف' دسمبر 2024 کا کتاب نمبر۔ جامعہ ملیہ دہلی کے قابل احترام استاد۔ مولانا ازاد یونیورسٹی جودھپور کے وائس چانسلر پروفیسر اختر الواسع کے گرانقدر۔ مخلصانہ تعاون سے ایک منفرد خصوصیت حاصل کرگیا ہے کہ ہماری درخواست پر انہوں نے اپنا قیمتی وقت صَرف کرکے صرف دہلی ہی نہیں۔ حیدر آباد دکن۔ بھوپال۔ مہاراشٹر۔ بنگال۔ راجستھان سے بھی اپنے احباب۔ شاگردوں سے رابطے کیے ہیں۔ اداروں اور افراد کے تعاون سے نوازا ہے۔ جس سے ایک مجموعی صورتِ حال سامنے آتی ہے کہ بھارت میں اُردو کتابیں اب بھی بڑی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں۔ فروخت ہو رہی ہیں۔ گیسوئے اُردو تابدار ہے۔ مزید تابدار ہو رہا ہے۔ پروفیسر اختر الواسع کے اس بھرپور تعاون پر شکریے کے الفاظ ہمارے پاس نہیں ہیں۔ کراچی کتاب میلے میں 'اطراف' کے کتاب نمبر کے ذریعے بھارت کے پبلشرز اور بک سیلرز بھی شریک ہو رہے ہیں۔“

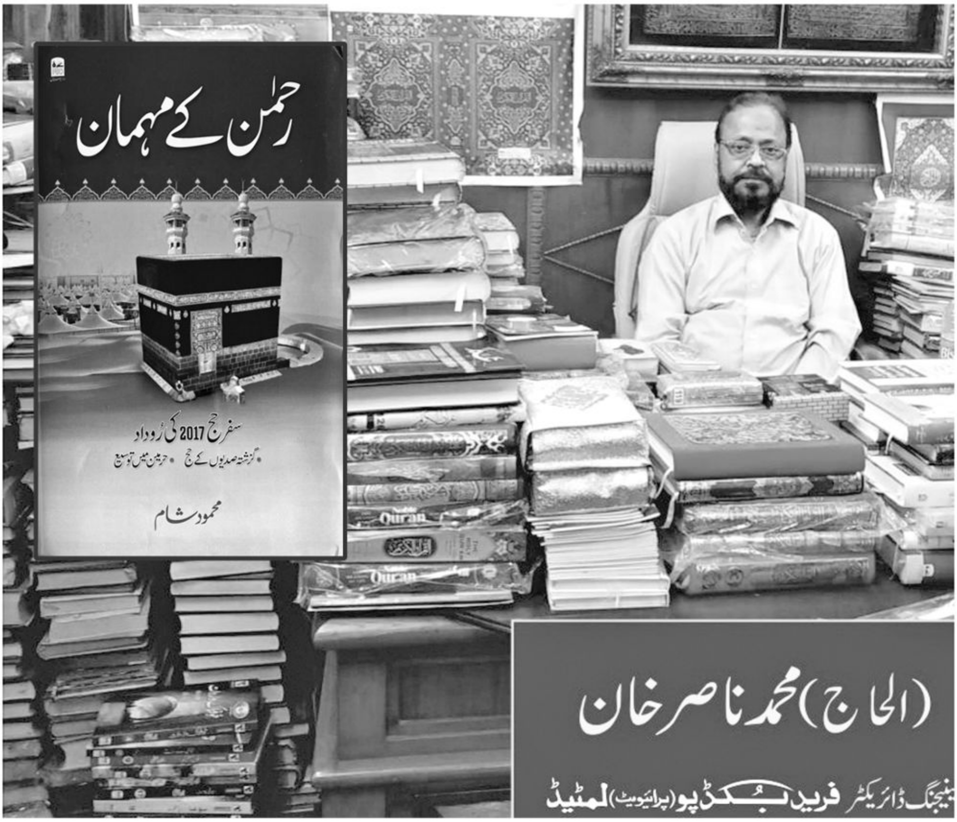

حرف حق۔ سر سید احمد خان کی مذہبی فکر

پروفیسر اخترالواسع، نئی دہلی

سرسید احمد خان (1817۔1898) اپنے خاندانی ماحوال اور اپنی تعلیم و تربیت کے لحاظ سے مذہبی شخصیت تھے، ان کے خاندان میں علمی و مذہبی روایت قائم تھی اور وہ خود عالم دین تھے، اس لیے شروع میں ان کے نام کے ساتھ مولوی لکھا جاتا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انہوں نے تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا اور برطانوی حکومت میں ملازمت اختیار کی، شروع میں سر سید بڑے روایت پسند عالم تھے، جو قدیم مذہبی روایت تھی اس پر پوری طرح کاربند اور عمل پیرا تھے لیکن احوال وظروف کے دباؤ اور برطانوی لوگوں کے ساتھ رہتے رہتے ان کے اندر ایسے داعیے پیدا ہوئے کہ انھوں نے روایتی مذہبی افکار ونظریات پر تنقیدی نظر ڈالنی شروع کی اور آہستہ آہستہ ان کے اندر پوری مذہبی روایت پر نظر ثانی کرنے کا داعیہ پیدا ہوا اور انھوں نے پوری اسلامی روایت کی تشریح نو کی۔

سرسید کے مذہبی افکار اس کے اپنے ہیں۔ ان میں سے بعض افکار ایسے ہیں جن سے پوری طرح اختلاف کیا جاتا ہے اور اختلاف حق بجانب ہے، اصل اسلامی روایت اور عقائد وہ ہیں جن کو سواد امت نے قبول کیا ہے۔ سرسید کے تفردات ان کے اپنے ہیں ان کی جو باتیں غلط ہیں ان پر تنقید بھی کرنی چاہیے لیکن سرسید کی مذہبی فکر کے حوالے سے دو پہلو ایسے ہیں جن کا ذکر ضروری ہے۔ پہلا پہلو یہ ہے کہ اگرچہ سرسید کے اپنے مخصوص مذہبی نظریات تھے لیکن سرسید نے ان کو اپنی ذات کی حد تک ہی رکھا۔ انھوں نے کالج میں ان افکار کی تعلیم وتدریس شروع نہیں کی بلکہ کالج کے لیے اس دور کے ایک راسخ العقیدہ خاندان یعنی مولانا محمد قاسم نانوتوی کے داماد کو دینیات کا استاد مقرر کیا اور کالج کی مذہبی تعلیم کو ان کی نگرانی میں دیا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس زمانے میں مستشرقین اور اسلام دشمن طاقتیں اسلام پر جو اعتراضات کر رہے تھے، ان کے جواب میں اپنے بہترین وسائل استعمال کیے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو سرسید احمد خاں وہ پہلی شخصیت ہیں جنھوں نے مستشرقین کا جواب دیا۔ بلکہ پوری دنیا میں یہ عظیم خدمت سب سے پہلے سرسید نے ہی انجام دی۔ خاص طور پر سیرت کے حوالے سے ان کی خدمت پائیدار اہمیت کی حامل ہے۔

خطبات احمد یہ:

سرولیم میور نے رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ پر ایک کتاب لکھی اور اس میں سیرت کے حوالے سے کئی غلط فہمیاں پیدا کیں اور متعدد ناروا اعتراضات کیے۔ سرسید احمد خان نے اس کتاب کا جواب دینے کا بیڑا اٹھایا اور خطبات احمدیہ کے نام سے اس کتاب کے اعتراضات کے جواب دیے۔

تفسیر القران العظیم:

سیرت کے علاوہ سرسید احمد خان نے قرآن مجید کی تفسیر بھی لکھی، سرسید کی یہ تفسیر کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ ایک تو یہ ہے کہ سرسید نے اس تفسیر میں ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو دہریت کے زیر اثر مذہب کا انکار کرتے تھے، اس لیے اس میں قرآن مجید کے تمام حقائق اور تعلیمات کو اس طرح پیش کیا ہے وہ عقل وفطرت کے مطابق سمجھ میں آئیں اس لیے انھوں نے معجزات کو خرق عادت تسلیم نہیں کیا ہے بلکہ ان کی اس طرح تاویل کی ہے کہ وہ بالکل فطری واقعات محسوس ہوں۔

دوسری بات یہ ہے کہ سرسید نے اس تفسیر میں یہ اصول پیش کیا ہے کہ یہ کائنات اللہ کا عمل ہے اور قرآن کریم اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے کلام اور اللہ کے عمل میں تضاد نہیں ہوسکتا، اس لیے نظام فطرت کے قوانین اور قرآن مجید کے بیانات میں مکمل ہم آہنگی ہے اگر کہیں اختلاف ہے تو انسانی فہم کا اختلاف ہے۔ اس لیے تاویل کی گنجائش ہے۔

سرسید نے اس اصول کے تحت تفسیر کی ہے، بلاشبہ اس میں کئی مقامات ایسے ہیں جہاں سواد امت کو ان سے اختلاف ہوسکتا ہے اور اس اختلاف میں امت حق بجانب ہے لیکن دیکھا جائے تو سرسید کی نیت پر شک نہیں کیا جا سکتا انھوں نے اپنے زمانے کے الحاد زدہ نوجوانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے یہ تفسیر لکھی تھی۔ اس بات کا ذکر خود سرسید نے کئی مواقع پر کیا ہے۔

سرسید نے تفسیر کے ساتھ ایک کتاب اصول تفسیر میں بھی لکھی تھی اس کا نام 'تحریر فی اصول التفسیر' ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے اصول تفسیر الگ سے بھی بیان کیے ہیں۔

تبیین الکلام:

تبیین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علیہ ملۃ الاسلام کے نام سے سرسید احمد خان نے توراۃ اور انجیل کی تفسیر لکھی ہے، سرسید نے اس کتاب کی تالیف کے لیے بڑا اہتمام کیا تھا، باضابطہ عبرانی زبان سیکھی اور اصل عبرانی میں ان کتابوں کو پڑھا، گارساں دتاسی کے بقول سرسید نے ان کتابوں پر عبور حاصل کیا۔ توراۃ اور انجیل کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد انھوں نے ان کی تفسیر لکھی، یہ تفسیر کوئی تقابلی کتاب نہیں تھی بلکہ انھوں نے اس انداز میں یہ تفسیر لکھی کہ ان کے ذریعے قرآن مجید کی کہاں کہاں تصدیق ہوتی ہے۔ یقیناً اس کام میں سرسید نے ایسے دعوے بھی پیش کیے جن پر لوگوں نے تنقید کی اور جوامت مسلمہ کی اکثریت کے خلاف تھے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ اسلامی میں اس انداز کی کتابیں شاذ و نادر ہی ہیں۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان اختلافات کم کرنے میں مدد کی۔

رسالہ طعام اہل کتاب:

رسالہ طعام اہل کتاب سرسید کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے۔ انھوں نے اس رسالے میں ایک ایسے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے جو صدیوں کے اسلامی فقہ کے غلبے کے نتیجے میں زیر بحث ہی نہیں رہا اور اس کے بارے میں لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اہل کتاب کا وہی ذبیحہ جائز ہوگا جو مذہبی طریقے کے مطابق ہوگا، اہل کتاب میں اگر کوئی گروہ یا جماعت ذبح کے صحیح طریقے کو اختیار نہ کرے تو ان کا ذبیحہ استعمال کرنا درست نہیں، اس کتاب کا سب سے اہم اور بڑا کردار ہے کہ اس کتاب کے ذریعے روایتی فقہ کے اندر نئے انداز سے سوچنے

کی طرح پڑی۔

سرسید احمد خان نے ان اہم کاموں کے علاوہ اور بھی متعدد تحریریں لکھی ہیں۔ جن کی مذہبی نوعیت ہے جیسے انھوں نے اپنے شروع کے زمانے میں سیرت پر ایک مختصر کتاب لکھی تھی، اس طرح ان کے متعدد اہم مقالات ہیں جن میں بہت اہم مذہبی اہمیت کے مسائل زیر بحث آئے ہیں۔ جو مقالات سرسید میں شامل ہیں۔ تہذیب الاخلاق میں بھی انھوں نے مذہبی تحقیقات پیش کیں اور ان کے علاوہ ان کی دیگر علمی، ادبی اور تحقیقی کتابوں جیسے آثار الصنادید اور دیگر کتابوں میں بھی سوانحی اور دینی نوعیت کے اہم مقالات ومضامین شامل ہیں۔

سرسید کی مذہبی فکر کے حوالے سے پھر عرض ہے کہ اس میں بہت کچھ ایسا ہے جس سے سواد امت کو بجا اختلاف ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سرسید نے صدیوں سے جمود وتعطّل کا شکار معاشرے میں آزادانہ فکر اور غور وخوض کا دروازہ کھولا، حقیقت یہ ہے کہ بعد کے لوگوں پر باوجود اختلاف کے سر سید کی فکر کے اثرات ہیں۔

(مضمون نگار جامعہ ملیہ اسلامیہ میں پروفیسر ایمریٹس اسلامک اسٹڈیز ہیں)

طویل علمی وادبی مسافت، عالمی سطح پر زیر تبصرہ تصنیفات

تحقیقی مقالے، سیمینار، بین الاقوامی اور قومی

پروفیسر ایم شافع قدوائی، ڈائریکٹر، سرسید اکیڈمی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

پروفیسر شافع قدوائی ایک معروف مصنف، ذولسانی نقاد، مترجم اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو)، علی گڑھ میں صحافت کے استاد اور محقق ہیں۔ بھارت کے ادارۂ ادبیات یعنی 'ساہتیہ اکادمی' ایوارڈ یافتہ (2019) پروفیسر شافع قدوائی 30 سال سے زائد عرصے سے اے ایم یو میں فلم اسٹڈیز، براڈ کاسٹ جرنلزم، ایڈیٹنگ، اسپورٹس جرنلزم اور اردو جرنلزم کی تعلیم دے رہے ہیں۔ وہ شعبہ ترسیل عامہ کے چیئرمین رہ چکے ہیں اور فی الحال اے ایم یو میں سوشل سائنسز کی فیکلٹی کے ڈین ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ سرسید اکیڈمی، اے ایم یو کے ڈائریکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان کی حالیہ تصنیف 'سرسید احمد خاں: ریزن، نیشن اینڈ ریلیجن' (روٹلیج، 2020) کو انیسویں صدی کے برصغیر ہند کی ایک اہم شخصیت، اے ایم یو اور علی گڑھ تحریک کے بانی سرسید احمد خاں کی خدمات کے معروضی مطالعہ کے طور پر دنیا بھر میں پذیرائی ملی ہے جو ہندوستان کے نوآبادیاتی دور کے سماجی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی سوالات سے بحث کرتی ہے۔ معروف اشاعتی ادارے روٹلیج نے اس کتاب کے جنوب ایشیائی ایڈیشن کی اشاعت سے قبل امریکہ، برطانیہ اور یوروپ کے لیے اپنا بین الاقوامی ایڈیشن شائع کیا۔

ان کی دوسری تصنیف ''لٹریچر اینڈ جرنلزم: کریٹیکل پرسپیکٹیوز' (کیمبرج یونیورسٹی پریس، انڈیا، 2014) کی بھی وسیع پیمانے پر پذیرائی ہوئی اور علمی حلقوں میں مقبول ہوئی۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ، ڈاکٹر قدوائی کو کئی دیگر باوقار ایوارڈز مل چکے ہیں جن میں کلنگا ادبی ایوارڈ (2021)، اقبال سمان (مدھیہ پردیش حکومت کا اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ، 2018) اور امیر خسرو ایوارڈ (اتر پردیش اردو اکادمی کا اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ، 2017) شامل ہیں۔

وہ انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز، دی فرنٹ لائن، دی آؤٹ لک، دی بک ریویو اور نیوز ٹریل کے لیے باقاعدگی سے کتابوں کے تبصرے لکھتے ہیں۔ انہوں نے انگریزی اخبار دی ہندو کے فرائیڈے ریویو کے لیے 'گوئنگ نیٹو' کے عنوان سے ثقافت، میڈیا اور ادب پر دس سال تک پندرہ روزہ کالم لکھا۔

صحافت میں سرسید کی خدمات پر ان کا تحقیقی مقالہ انیسویں صدی کی صحافت پر نمایاں ترین علمی کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے ای ٹی وی، حیدرآباد کے لیے 'اسٹائل بک' (2002) اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، حکومت ہند کے لیے 'اردو میں ابلاغ عامہ کی لغت' (2003) تیار کی ہے۔

وہ گلوبل میڈیا (یونیورسٹی آف پرڈیو، یو ایس اے) اور کلکتہ یونیورسٹی کے رسالے سمیت متعدد تحقیقی رسالوں کے ادارتی بورڈ میں شامل رہے ہیں۔ وہ علی گڑھ جرنل آف کمیونیکیشن اسٹڈیز کے چیف ایڈیٹر ہیں۔ پروفیسر شافع قدوائی کو ان کی اردو تصنیف 'سوانح سرسید: ایک بازدید' (2017) کے لئے 2019 میں بھارت کے سب سے بڑے ادبی ایوارڈ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ان کی دیگر تصانیف 'نیشنل اویکننگ اینڈ مولانا آزاد'، (رانچی یونیورسٹی، 2012)، 'علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ' (2019)، 'فکشن مطالعات: مابعد جدید تناظر' (2018)، 'میراجی' (مونوگراف، ساہتیہ اکادمی)، نئی دہلی، 2001) اور 'خبر نگاری' (1988) کو مبصرین اور قارئین کی طرف سے کافی پذیرائی ملی۔ 'خبر نگاری' بھارت میں اردو میں رپورٹنگ کے فن پر پہلی کتاب ہے۔

ان کے علاوہ ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی سے ان کے تراجم 'آر کے نارائن' (2009)، اور 'مائیکل مدھوسودن دت' (1995) شائع ہوئے ہیں۔

پروفیسر قدوائی انگلینڈ، ماریشس، قطر، شام، سعودی عرب، تھائی لینڈ اور پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ وہ ساہتیہ اکادمی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم، حکومت ہند کے جنرل کونسل کے رکن کے طور پر خدمات انجام دے چکے ہیں اور اردو کمیٹی، بھارتیہ گیان پیٹھ اور سرسوتی سمان، نئی دہلی کے کنویزر رہ چکے ہیں۔

انہوں نے 70 سے زائد تحقیقی مقالے لکھے ہیں اور دو سو سے زائد بین الاقوامی اور قومی سیمینارز اور ورکشاپس میں شرکت کی ہے۔

قرآن کے مطالعے اور انگریزی ادب کے درمیان ایک پُل

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

اعزازی ڈائریکٹر کے۔اے۔نظامی مرکز علوم القرآن مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

پروفیسر عبد الرحیم قدوائی (ولادت: ۱/۱۲۱ اکتوبر ۱۹۵۶ء) ایک معروف مصنف اور محقق ہیں جنہوں نے انگریزی ادب اور اسلامیات میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان کا علمی کام دو مختلف شعبوں یعنی انگریزی ادب اور قرآن کے مطالعے کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔

پروفیسر قدوائی کی تحریریں اپنے موضوع کی گہرائی، وضاحت اور معنویت کی وجہ سے علماء اور عام سامعین کے لیے قابل فہم ہونے میں منفرد مقام رکھتی ہیں۔ پروفیسر قدوائی نے اپنی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) سے مکمل کی۔ ان کی ڈاکٹریٹ (پی ایچ ڈی) انگریزی ادب میں تھی، اور انہوں نے بعد میں برطانیہ میں مزید تعلیم حاصل کی۔ لیسٹر یونیورسٹی (برطانیہ) سے انگریزی ادب میں دوسری پی ایچ ڈی کی سند اور اسلامی علوم میں اپنی مہارت کو مزید پختہ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر قدوائی نے انگریزی ادب اور جدید یورپی زبانوں کے شعبے میں پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ وہ کئی علمی اور تحقیقی اداروں کے سربراہ بھی رہے ہیں، جن میں مرکز برائے فروغ تعلیم وثقافت مسلمانانِ ہند (CEPECAMI) اور کے۔اے۔ نظامی مرکز علوم القرآن شامل ہیں۔

پروفیسر قدوائی کا سب سے نمایاں کام اسلامی علوم، خصوصاً قرآن مجید کے تراجم کے مطالعے میں ہے۔ ان

کی تصانیف قرآنی اصطلاحات اور مفاہیم کی فہرست اور یورپی زبانوں میں قرآن کے تراجم کی فہرست اس شعبے میں ان کے علمی مرتبے کی نشانی ہیں۔ان کا کام نہ صرف علمی حلقوں میں بلکہ عام قارئین کے لیے بھی قرآن کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ پروفیسر قدوائی نے اسلامی تعلیمات اور قرآن کی روشنی میں عصری مسائل پر بھی کام کیا ہے۔ان کی کتاب "قرآن برائے تمام انسانیت" ایک اہم کاوش ہے جس کا مقصد قرآن کے پیغام کو وسیع تر سامعین تک پہنچانا ہے، اور خاص طور پر اس کی تعلیمات کو امن، عدل اور ہدایت کے طور پر پیش کرنا ہے۔ مختصر یہ کہ پروفیسر قدوائی کا علمی کام انگریزی ادب اور اسلامیات دونوں میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ان کی تحریر میں اور تدریس علمی دنیا اور عام سماج دونوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔وہ ایک ایسے عالم ہیں جنہوں نے علم کے ذریعے معاشرتی ہم آہنگی، بین المذاہب مکالمے اور عالمی امن کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ان کا کام آئندہ نسلوں کے لیے رہنمائی کا باعث رہے گا۔

پروفیسر قدوائی نے جس طرح انگریزی میں اپنے علمی مقالات، تحقیقی تصانیف اور تنقیدی مضامین لکھے ہیں، اسی طرح وہ اردو میں بھی مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔علم و تحقیق سے بھر پور ان کی اردو تحریریں زبان و اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی اپنی انفرادی شان رکھتی ہیں۔ان کی مندرجہ ذیل اردو کتابیں کافی مشہور اور اہمیت کی حامل ہیں:

(۱) مستشرقین اور انگریزی تراجم قرآن، مرتبہ: پروفیسر اختر الواسع، البلاغ پبلی کیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۵ء

(۲) اسلام اہل مغرب کی نظر میں، مرتبہ: رفیق احمد رئیس سلفی، ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ، ۲۰۲۳ء

(۳) جلوۂ دانش فرنگ (اقبال کے فکر وفن پر انگریزی میں تنقیدی مضامین کے اردو تراجم)، براؤن بکس علی گڑھ طبع ثالث ۲۰۲۴ء

(۴) جہات قرآنیات، مرتبہ: رفیق احمد رئیس سلفی، مرکز علوم القرآن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بہ اشتراک: ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی، علی گڑھ ۲۰۲۴ء

کے۔اے۔نظامی مرکز علوم القرآن

اس وقت پروفیسر قدوائی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ادارہ کے۔اے۔نظامی مرکز علوم القرآن کے سربراہ ہیں۔یونیورسٹی کا یہ ایک نوخیز ادارہ ہے۔اس میں تعلیم وتعلم اور تصنیف وتحقیق کا عمل ۲۰۱۲ء میں شروع ہوا لیکن اتنے کم عرصے میں اس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی ہے۔اس ادارے میں کوشش کی جاتی ہے کہ دور حاضر سے متعلق قرآن کریم کی ہدایات کی تفہیم کرائی جائے۔

اس ادارے میں بی۔اے، ایم۔اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم کا خصوصی نظم ہے۔

خطاطی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔

یہاں کمپیوٹر کے ذریعے قرآن مجید کی تعلیم کا خصوصی نظم۔

یہ بات بڑی خوش آئند ہے کہ سائنس اور دوسرے شعبوں کے طلباء گریجویشن میں VOC اور VAC کورسز میں بڑی تعداد میں قرآنک اسٹڈیز کا انتخاب کرتے ہیں۔

مرکز میں شام کے وقت کئی ایک سرٹیفکٹ کورسز چلائے جاتے ہیں اور ناظرہ قرآن مجید کی باتجوید تعلیم دی جاتی ہے۔

مرکز میں ہر سال بین الاقوامی سطح کا علمی سیمینار منعقد کیا جاتا ہے، اس کا مرکزی موضوع قرآن مجید اور اس سے متعلق جدید افکار و مسائل ہوتے ہیں۔ ہر سیمینار میں پیش کردہ علمی مقالات کو خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

قرآن مجید سے متعلق مختلف موضوعات پر توسیعی محاضرات کا انعقاد عمل میں لایا جاتا ہے، ان میں خطبہ پیش کرنے والے عام طور پر وہ حضرات ہوتے ہیں جن کی قرآن کریم پر گہری نظر ہوتی ہے، اب تک بیس سے زاید توسیعی محاضرات ہو چکے ہیں۔

اب تک قرآن مجید کی اردو تفاسیر کے تعارف وتجزیاتی مطالعے، ان کے مفسرین کے تفسیری امتیازات اور علوم قرآن کے کئی ایک گوشوں سے متعلق سو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔مرکز کی مطبوعات کو علمی حلقوں میں بہ نظر تحسین دیکھا جا رہا ہے۔

مرکز اپنا ششماہی ترجمان علی گڑھ جرنل آف قرآنک اسٹڈیز آن لائن شائع کرتا ہے، جس کے تمام شمارے مرکز کی ویب سائٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

مرکز علوم القرآن کی چند اہم مطبوعات

(۱) مولانا ابوالحسن ندوی کی قرآن فہمی ڈاکٹر، طارق ایوبی۔(۲) مولانا عبدالماجد دریابادی کی قرآن فہمی، مولانا نعیم الرحمن صدیقی۔(۳) علامہ احسان اللہ عباسی کی قرآن فہمیڈاکٹر گوہر قادروانی وڈاکٹر فائزہ عباسی، (۴) سید العلماء مولانا سید النقوی کی قرآن فہمی ڈاکٹر رضا عباس۔(۵) مولانا اشرف علی تھانوی کی قرآنی خدمات ڈاکٹر عبید اقبال عاصم۔(۶) ہندو پاک کے مشاہیر کی قرآنی خدمات پروفیسر ضیاء الدین فلاحی۔(۷) فضلائے دیوبند کی قرآنی خدمات ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، (۸) ندوی فضلاء کی قرآنی خدمات ڈاکٹر طارق ایوبی۔(۹) مدرستہ الاصلاح کے فضلاء کی قرآنی خدمات، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی۔(۱۰) جماعت اسلامی کے فضلاء کی قرآنی خدمات پروفیسر ضیاء الدین فلاحی۔(۱۱) اہل حدیث فضلاء کی قرآنی خدمات مولانا رفیق احمد رئیس سلفی۔(۱۲) بریلوی فضلاء کی قرآنی خدمات ڈاکٹر ایوب اکرم۔

(۱۳) شیعہ فضلاء کی قرآنی خدمات ڈاکٹر رضا عباس۔(۱۴) ادارہ سرسید مسلم یونیورسٹی کے ابوسفیان اصلاحی۔

مشاہیر کی قرآنی خدمات

(۱۵) مشاہیر اہل سنت کی قرآنی خدمات محمد حنیف خاں رضوی۔(۱۶) علوم القرآن ایک جائزہ ڈاکٹر ابو اسعد اعظمی۔(۱۷) رہنما آیات قرآنی ڈاکٹر حارث منصور۔(۱۸) ہندوستان میں علوم قرآنی کی نشوونما پروفیسر خلیق احمد نظامی۔(۱۹) قرآنی علوم کا ارتقاء عہد اسلامی کے ہندوستان میں پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی۔(۲۰) تفسیر بیان القرآن: ایک جائزہ مفتی محمد اظہار الحق قاسمی۔(۲۱) کنز الایمان کے محاسن مولانا محمد حنیف خان۔(۲۲) بیسویں صدی کی معروف تفسیروں کا مطالعہ ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی۔(۲۳) تفسیر ضیاء القرآن: ایک جائزہ ڈاکٹر محمد عباس۔(۲۴) مولانا ابوالکلام آزاد کی ترجمان القرآن کا تعارف وتجزیہ ڈاکٹر کمال اشرف قاسمی۔(۲۵) شمس پیرزادہ کی تفسیر دعوۃ القرآن ڈاکٹر ضیاء الدین فلاحی۔(۲۶) معلم تدریس قرآن مجید ڈاکٹر یاسر علی خان۔(۲۷) مفتی سعید احمد پالن پوری کی تفسیر ہدایت القرآن ڈاکٹر مشتاق تجاروی۔(۲۸) تفسیر حقانی: ایک تعارفی وتجزیاتی مطالعہ ڈاکٹر ظفر دارک قاسمی۔(۲۹) موضح قرآن: ایک مطالعہ ڈاکٹر جمشید احمد ندوی۔(۳۰) مولانا طاہر القادری اور عرفان القرآن ڈاکٹر اعجاز احمد۔(۳۱) علامہ ابوالفضل محمد احسان اللہ عباسی کا اردو ترجمہ قرآن زریاب احمد فلاحی۔(۳۲) مطالعات فراہی ڈاکٹر ابوسعد اعظمی۔(۳۳) ارمغان پروفیسر ایمیریٹس اختر الواسع مرتب: مولانا رفیق احمد رئیس سلفی

انجمن ترقی اُردو (ہند) تاریخ کے جھروکے سے

اُردو کے قوم پرست ادارے کا سفر 1903 میں شروع ہوا

اُردو گھر۔نام گاندھی جی کا تجویز کردہ۔افتتاح وزیر اعظم ڈیسائی نے کیا

صدر: پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی　　جنرل سکریٹری: ڈاکٹر اطہر فاروقی

212، راؤز ایونیو، نئی دہلی -110002 (ہندستان)

فون 23237722:-11-91+ فیکس 44784159:-11-91+

ای میل contact@atuh.org: ویب سائٹ: www.atuh.org

انجمن ترقی اردو (ہند) اردو زبان وادب کا سب سے محترم، خودمختار اور قوم پرست ادارہ ہے۔

1903 میں انجمن نے اردو کے ایک قوم پرست ادبی ادارے کے طور پر اپنے سفر کے لیے جس راہ کا تعین کیا تھا، وہ اس پر ابھی تک ثابت قدمی کے ساتھ گامزن ہے۔ اردو کے قوم پرست ادارے کے خلقیے کی تعمیر میں مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور سی راجا گوپال چاری جیسے متعدد قومی رہ نماؤں نے اہم رول ادا کیا اور اردو و ہندی کے مصنّفین کی ایک کہکشاں بھی انجمن سے ہمیشہ منسلک رہی۔ ان اکابرین میں منشی پریم چند جیسے ممتاز ادیب سرِ فہرست ہیں۔ انجمن ہمیشہ سیاسی وابستگیوں سے نہ صرف دور رہی ہے بلکہ اس نے تمام تر قوت کے ساتھ اپنی خود مختاری اور سالمیت کی حفاظت بھی کی ہے۔ انجمن کا قیام 1882 میں سر سیّد احمد خاں نے اردو ہندی تنازعے کی بھڑکتی ہوئی آگ کو فرو کرنے کے لیے اس مقصد سے کیا تھا کہ ایک زبان کو دو حصوں میں تقسیم ہونے سے بچایا جا سکے جو بد قسمتی سے ممکن نہ ہو سکا۔ آزادی کے بعد انجمن نے اردو زبان و ادب کے ہمہ جہتی فروغ کے ساتھ، آئین کے آٹھویں جدول میں اردو کو قومی زبان کے طور پر شامل کرانے میں سب سے اہم رول ادا کیا۔ اردو املا کی معیار بندی بھی پہلی بار انجمن ترقی اردو (ہند) کے ذریعے 1944 میں عمل میں آئی۔ اردو اور فرانسیسی کے علاوہ دنیا کی دیگر زبانوں (مع انگریزی) میں معیار بندی اور استناد کا تعین کرنے والے ادارے کا تصور نہیں ہے۔ اردو میں انجمن ترقی اردو (ہند) اور فرانسیسی میں Academie Francaise زبان کی معیار بندی اور اہلِ قلم کے استناد کا فریضہ انجام دیتی ہیں۔

اردو گھر

1967 میں حکومتِ ہند نے انجمن کو 1200 اسکوائر میٹر کا ایک قطعہ راؤز ایونیو، نئی دہلی میں اس زمین کے بدلے میں دیا جو کرزن روڈ (موجودہ کستوربا گاندھی مارگ) پر انجمن نے چوتھی دہائی کے شروع میں خریدی تھی اور جس پر تقسیمِ ہند کے ہنگامی حالات کے سبب تصرف ہو گیا تھا۔ راؤز ایونیو کی اِس زمین پر 1 نومبر 1977 کو اُس وقت کے وزیرِ اعظمِ ہند جناب مرارجی دیسائی نے انجمن کے صدر دفتر کی عمارت اردو گھر کا افتتاح کیا۔ عمارت کا نام اردو گھر گاندھی جی کا تجویز کردہ ہے جہاں گزشتہ 46 برسوں سے انجمن کا صدر دفتر قائم ہے۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔ نسل در نسل علمی خدمات

6 ہزار سے زائد کتابیں۔ کتاب نما۔ پیام تعلیم کے جرائد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی محض ایک اشاعتی ادارہ ہی نہیں ہے، بلکہ اس کو برصغیر کی عظیم دانش گاہ جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے علمی و فکری ترجمان کی حیثیت حاصل ہے، جس کا قیام 1920ء میں جامعہ کے ساتھ ہی عمل میں آ گیا تھا۔ اس ادارے سے تقریباً چھ ہزار سے زائد کتابیں ہو چکی ہیں۔ مکتبہ

جامعہ لمیٹڈ ملک بھر کے اردو تعلیمی نصابات کی معیاری کتابیں شائع کرنے میں امتیازی مقام رکھتا ہے۔ اس ادارے کے تحت شائع ہونے والے دو ماہنامے ''کتاب نما'' اور ''پیامِ تعلیم'' کو بے پناہ مقبولیت ملی ہے۔ ''کتاب نما'' ایک موقر ادبی رسالہ رہا ہے اور ''پیامِ تعلیم'' ثانوی تعلیم سے وابستہ طلبا کا ایک نفیس و نستعلیق ماہنامہ تھا۔ علم و اب کا وہ کون سا گوشہ ہے جو مکتبہ جامعہ کی روشن کتابوں سے منور نہ ہو۔ مذہب و فلسفہ، تاریخ و تہذیب، سائنسی و سماجی علوم و فنون اور خصوصاً شعر و ادب کی وہ کون سی صنف ہے جس پر مکتبہ جامعہ کے نقوش مرتسم نہ ہوئے ہوں؛ تحقیق، تنقید، قواعد، انشا، داستان، ناول، افسانہ، ڈراما، سفر نامہ، خود نوشت، رپورتاژ طنز و مزاح، تذکرہ، کلاسیکی اور جدید شعر و ادب کے علاوہ غالبیات اور اقبالیات کا ایک وافر سرمایہ۔

مکتبہ جامعہ کا ایک اہم اختصاص معیاری اور اعلی درجے کے تراجم کی اشاعت بھی ہے۔ سید عابد حسین نے مہاتما گاندھی کی خود نوشت تلاش حق، پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت تلاش ہند اور کانٹ کی کتاب 'تنقید عقل محض' کے نام سے ترجمہ کیا۔ افلاطون کی کتاب 'ریاست' مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور جان اسٹورٹ مل کی کتاب 'آزادی' مترجمہ سعید انصاری مکتبہ جامعہ کے اہم تراجم ہیں۔ پروفیسر محمد مجیب کا تصنیفی و تالیفی دائرہ تاریخ، سیاست اور شعر و ادب کو محیط ہے۔ مکتبہ جامعہ نے ان کی کتابیں تاریخ تمدن، تاریخ فلسفہ، سیاسیات اور دنیا کی کہانی شائع کی ہیں۔

مکتبہ جامعہ کو اپنی ابتدا میں جہاں ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر سید محمد مجیب اور خواجہ غلام السیدین جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں کی سرپرستی حاصل رہی، وہیں مکتبہ کو اس پر بھی فخر ہے کہ مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو، اور مولانا آزاد جیسے تحریک آزادی کے قافلہ سالاروں کی زریں تصانیف بھی مکتبہ سے شائع ہوئیں۔ اس طرح معروف ادیبوں میں پریم چند کا شاہکار ناول گودان پہلی بار مکتبہ سے ہی شائع ہوا۔ دیوان غالب کا نسخۂ برلن بھی مکتبہ ہی کے ذریعے منظر عام پر آیا۔ نیز مکتبہ کو فراق گورکھپوری، مجنوں گورکھپوری، جگر مرادآبادی، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، مالک رام اور قرۃ العین حیدر جیسے سربرآوردہ فن کاروں اور مصنفوں کی کتابیں شائع کرنے کا بھی اعزاز حاصل رہا ہے۔

1947ء سے پہلے مکتبہ جامعہ کی شاخیں لاہور، لکھنو اور دہلی کے قرول باغ میں بھی قائم تھیں۔ لیکن تقسیم اور فسادات کے زیر اثر یہ شاخیں بند ہو گئیں۔ حتی کہ قرول باغ کی شاخ کو شر پسندوں نے نذر آتش کر دیا۔ لیکن اس کے بعد آج بھی یونیورسٹی مارکیٹ (علی گڑھ)، اردو بازار (دہلی)، علامہ اقبال چوک (ممبئی) اور بھوپال گراونڈ (جامعہ ملیہ) میں مکتبہ کی شاخیں نہایت زندہ، متحرک اور فعال ہیں۔ 1933ء میں یونیسکو نے جامعہ کو بطور تحفہ دو پرنٹنگ مشینیں نذر کی تھیں۔

مکتبہ جامعہ کے دوسربراہان کے نام بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ شاہد علی خاں اور خالد محمود۔ شاہد علی خاں نے اپنے دور میں نہایت نفاست اور لگن سے کام کیا۔ 'کتاب نما' کے درجنوں خصوصی شمارے نکالے۔ مشہور ادیبوں اور نقادوں سے مہمان اداریے لکھوائے اور کثیر تعداد میں کتابیں چھپوائیں۔ وہیں جن حالات میں پروفیسر خالد محمود نے مکتبہ جامعہ کی سربراہی قبول کی وہ نہایت ناگفتہ بہ تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مکتبہ کے پاس اپنا کوئی دفتر نہیں تھا۔ ہزاروں قیمتی کتابوں کا ذخیرہ کباڑ خانے میں دیمکوں کی غذا بن رہا تھا۔ مکتبہ جامعہ کا مشہور زمانہ بمبئی برانچ بند ہونے کے دہانے پر تھا۔ مدت سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ تقریباً بند تھا۔ مکتبہ لاکھوں کے خسارے میں چل رہا تھا اور ایسا اندیشہ تھا کہ شاید یہ مکتبہ اپنی جاں کنی کی آخری سانسیں گن رہا ہے۔ ایسی صورت حال میں پروفیسر خالد محمود نے اس وقت کے وائس چانسلر نجیب جنگ کی سرپرستی میں مکتبہ میں ایک نئی روح پھونک دی۔ اس سلسلے میں ان کے درج ذیل کارنامے مکتبہ کی تاریخ میں ناقابل فراموش ہیں:

(۱) وزارت برائے فروغ انسانی وسائل کے توسط سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ساتھ مکتبہ جامعہ نے ایک ایسے MoU پر دستخط کیا جس کے تحت کونسل نے مکتبہ کے اشراک سے چار سو ٹائٹلس کی گیارہ گیارہ سو کا پیاں یعنی کل چار لاکھ چالیس ہزار کتابیں شائع کیں اور اس معاہدے کے تحت تمام مطبوعات کی حق ملکیت مکمل طور پر مکتبہ جامعہ کے پاس محفوظ ہے۔ کونسل صرف منافع میں پچاس فی صد کا حصہ دار ہے۔

(۲) دہلی کے علاقہ بوانہ میں مکتبہ جامعہ کا کروڑوں کی ملکیت کا قطعۂ اراضی کا بیعانہ بہت

پہلے دیا جاچکا تھا لیکن زمین کی قیمت ادا نہ کرنے کے سبب مکتبہ جامعہ کے نام سے رجسٹری نہیں ہوسکی تھی۔ چنانچہ 35 لاکھ روپے جامعہ سے قرض لے کر وہ زمین خرید لی گئی۔

(۳) وائس چانسلر نجیب جنگ سے اجازت نامہ حاصل کر کے مکتبہ جامعہ کو جامعہ ملیہ کی ایک شان دار دو منزلہ عمارت میں منتقل کر دیا گیا۔

(۴) مکتبہ جامعہ کی آمدنی میں اضافہ کے لئے جامعہ ملیہ اسلامیہ کے تمام دفاتر کو یہ ہدایت جاری کی گئی کہ اسٹیشنری کی تمام خریداریاں مکتبہ جامعہ سے ہی کی جائیں۔

(۵) بمبئی برانچ جو کہ تقریباً جاں بلب ہو چکا تھا اس کو نئے سرے سے زندہ کیا۔

افسوس صد افسوس کہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جیسا تاریخ ساز اشاعتی ادارہ جاں کنی کے عالم میں ہے۔ دونوں رسائل بند ہو چکے ہیں۔ بیشتر عملہ اور کارکنان سبکدوش ہو چکے ہیں۔ مالی بحران اپنی انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ اس ادارے کا پھر کسی خالد محمود کا انتظار ہے۔

پروفیسر خالد محمود۔ ممتاز خاکہ نگار۔ سفر نامہ نویس نے مکتبہ کو متحرک اور فعال کیا

پروفیسر خالد محمود (پ 1948) کا شمار اردو کے ممتاز خاکہ نگار اور انشائیہ نگار میں ہوتا ہے۔ سفر نامہ نگاری کے حوالے سے ان کے تحقیقی وتنقیدی مقالے کو مستند حوالے کا درجہ حاصل ہے۔ وہ عہدِ حاضر کے معروف شاعر، ناقد، محقق اور ترجمہ نگار ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے صدرِ شعبہ، دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اور مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز رہ کر اردو کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی تصانیف میں 'نقوش معنی' (تنقیدی مضامین) 2020، 'شعر زمین' (شاعری) 2018، 'تفہیم و تعبیر' (تنقیدی مضامین) 2017، 'ادب اور صحافتی ادب' (تنقیدی مضامین) 2012، 'شاہ مبارک آبرو' (مونوگراف) 2007، 'شگفتگی دل کی' (خاکے/انشائیے) 2003، 'شعر چراغ' (شاعری) 2001، 'ادب کی تعبیر' (تنقیدی مضامین) 2001، 'شعر چراغ' (شاعری رہندی) 2001، 'تحریر کے رنگ' (تنقیدی مضامین) 1998، 'اردو سفر ناموں کا تنقیدی مطالعہ' (تحقیق و تنقید) 1995 اور 'سمندر آشنا' (شاعری) 1982 شامل ہیں۔ ان کتابوں نے نہ صرف ادبی حلقے میں ہلچل پیدا کی بلکہ ان میں سے کچھ اس قدر مقبول بھی ہوئیں کہ ان کے ایک سے زائد ایڈیشن شائع ہوئے۔

اس کے علاوہ ان کی مرتب کردہ کتابوں میں 'ابنِ صفی: شخصیت اور فن کے آئینے میں' بہ اشتراک خالد جاوید (2014)، 'کلیات مُلّا رموزی' چھ جلدیں (2013)، 'خطبات: شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ' بہ اشتراک شہپر رسول (2012)، 'رابندر ناتھ ٹیگور: فکر وفن' بہ اشتراک شہزاد انجم (2012)، 'اردو صحافت: ماضی وحال' بہ اشتراک سرور الہدیٰ (2012)، اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت 2005، 'اردو کی نئی کتاب' (بارہویں جماعت کے لیے) درسیات این سی ای آر ٹی، بہ اشتراک گوپی چند نارنگ وحنیف کیفی (1989)، 'اردو کی نئی کتاب' (گیارہویں جماعت کے لیے) درسیات این سی ای آر ٹی، بہ اشتراک گوپی چند نارنگ وحنیف کیفی (1986)، 'عبداللطیف اعظمی: حیات وخدمات' (1985) اور 'جائزے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ' (تبصرے) بہ اشتراک مظفر حنفی (1984) شامل ہیں۔

بحیثیت مترجم بھی خالد محمود کی خدمات نمایاں ہیں اور ان کے تراجم میں 'تاپسی' (ناول) از کُسم اَلنسل 2003، 'قصائی باڑہ' (کہانیاں) از اجیت کور 2002، 'کالے کنویں' (کہانیاں) از اجیت کور 2000، 'گوری' (ناول) از اجیت کور 2000 اور 'ماحول کے ذریعے تعلیم' (تعلیمات) برائے این سی ای آر ٹی شامل ہیں۔ اجیت کور کے ناول ''گوری'' کے ترجمے پر انھیں ساہتیہ اکادمی، دہلی کے باوقار ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

ڈاکٹر خالد مبشر۔ نئی نسل کے معروف شاعر نقاد اور محقق اُردو کے اہم مقدمات پر 'مقدماتی ادب'، منفرد۔ مبسوط

ڈاکٹر خالد مبشر (پ 1980) شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں بحیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں۔ وہ نئی نسل کے معروف شاعر، نقاد اور محقق ہیں۔ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے انڈر گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن نصابات پر مشتمل ان کے تدریسی لیکچر کا ایک سلسلہ مشہور ادبی یوٹیوب چینل ''سفیرِ ادب'' پر جاری ہے۔ اب تک 75 لیکچرز اپلوڈ کیے جا چکے ہیں۔ طلبہ واساتذہ میں ان کے یہ لیکچرز خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''طنز ومزاح اور مولانا ابوالکلام آزاد'' (2012ء) اور ''مقدماتی ادب'' (2019ء) منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ''طنز ومزاح اور مولانا ابوالکلام آزاد'' میں مولانا کی طنز ومزاح نگاری پر مفصل تحقیقی وتنقیدی بحث کی گئی ہے۔ مولانا آزاد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' میں ایک خصوصی کالم ''افکار وحوادث'' کے عنوان سے لکھتے تھے، جو طنزیہ ومزاحیہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر خالد مبشر نے مولانا آزاد کے اس پہلو کو پہلی بار اجاگر کیا۔ اس کتاب میں فکاہیہ کالم نگاری کی خصوصیات اور اس کی تاریخ پر مستقل ایک باب قائم کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے باب میں طنز ومزاح کے فن اور روایت کا بسیط محاکمہ بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر خالد مبشر کی دوسری کتاب ''مقدماتی ادب'' اپنے موضوع ومواد کے اعتبار سے منفرد ہے۔ اس کتاب میں اردو کے اہم مقدمات کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔ مقدمہ شعر وشاعری کے علاوہ مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی ادیب، مالک رام، قاضی عبدالودود، مسعود حسن خاں اور رشید حسن خاں کے تحقیقی وتنقیدی مقدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ایک باب میں باغ وبہار، کلامِ میر اور کلامِ غالب پر لکھے گئے اہم مقدمات کا تقابلی مطالعہ بھی کیا گیا ہے۔

فرید بک ڈپو، نئی دہلی

دینی لٹریچر کی اشاعت کا سب سے بڑا ادارہ

فرید بک ڈپو پرائیویٹ لمیٹڈ قرآن کریم اور دینی لٹریچر کی اشاعت کا ہندوستان میں سب سے بڑا ادارہ ہے۔ قرآن کریم کے پچاس سے زائد خوبصورت نمونے اس ادارے کی خاص پہچان ہیں۔ اسلامی اور عالمی تاریخ، تفاسیر، فقہ، دینی موضوعات اور اردو شعر وادب و دیگر علوم وفنون کی دس ہزار سے زائد کتب شائع کر کے فرید بک ڈپو ملک کا سب سے بڑا اشاعتی گھر بن چکا ہے۔ فرید بک ڈپو ایک باقاعدہ کمپنی ہے جسے دہلی کے ایک جلد ساز حاجی محمد فرید نے نصف صدی قبل قائم کیا تھا، اب ان کے صاحبزادے الحاج محمد ناصر خان کمپنی کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ خان صاحب نہایت باذوق اور علم دوست انسان ہیں۔ انھوں نے اپنے جریدہ 'جہانِ کتب' کے تحت اُردو کی کئی عظیم شخصیات پر نہایت اہم خصوصی شمارے شائع کیے ہیں۔ اس ادارے کی مطبوعات دنیا بھر کے اُردو عوام وخواص میں مقبول ہیں۔

ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی

شمس الرحمن فاروقی سمیت تمام بڑے قلمکاروں کی کتابوں کی اشاعت

یہ اشاعتی ادارہ سنہ 2004ء میں پرانی دہلی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باذوق نوجوان عبدالصمد نے قائم کیا تھا۔ گذشتہ دو عشروں میں ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز اپنی علمی وادبی مطبوعات کی کامیاب اشاعت وطباعت کے لیے مشہور ہے۔ عبدالصمد کو اردو زبان اور ادب سے بے انتہا عشق ہے، وہ بڑے اہتمام کے ساتھ برصغیر کے بڑے قلم کاروں کی تخلیقات شائع کرتے ہیں۔ اُردو کے نامور دانشور مرحوم شمس الرحمن فاروقی کی تمام ہی کتابوں کی اشاعت اسی ادارے سے ہو رہی ہے۔ ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز نے جس تیزی سے اشاعتی دنیا میں ترقی حاصل کی ہے وہ بے مثال ہے۔

فاروق ارگلی ۔ دہلی

150 سے زیادہ جاسوسی رومانی سماجی ناول

50 سے زیادہ عظیم شعرا کے کلیات کی اشاعت

فاروق ارگلی (کنور محمد فاروق خان) اتر پردیش کے ضلع فتح پور ہسوا کے ایک گاؤں مستی (تحصیل بندکی) میں 3 جنوری 1940ء کو پیدا ہوئے۔ کھیتی کسانی کا کام چھوڑ کر 1956ء میں دہلی آئے، صرف درجہ چہارم تک رسمی تعلیم تھی مگر مطالعہ کا بیحد شوق جنون کی حد تھا، 1955ء میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب اور 1958ء میں ادیب ماہر کے امتحانات پاس کئے، ہندی اور انگریزی دہلی میں سیکھی، 1960 کے دورانیہ میں ناول نویسی اور صحافت شروع کی کئی رسائل واخبارات سے وابستہ رہے، ہندی اور اردو میں 150 سے زیادہ جاسوسی، رومانی اور سماجی ناول شائع ہوئے۔ مختلف موضوعات پر مضامین اور کتابیں لکھیں، اردو کی نامور شخصیات کے حالات اور کارناموں پر مبنی ان کی کتابیں، 'اردو ہے جن کا نام' (دو جلدیں)، 'جواہر عظیم آباد' (دو جلدیں) 'اردو ہندوستان'، 'فخر وطن'، 'فخر خواتین' اور 'ادب رنگ' وغیرہ اردو حلقوں میں مقبول ہیں۔ انھوں نے 50 سے زائد عظیم شعراء کے کلیات اور مجموعے موجودہ وقت کے مطابق از سرِ نو مرتب کر کے شائع کرایا۔ ان کا شعری کلیات 'مابعدِ سخن' ادبی حلقوں میں خاصا پسند کیا گیا۔ عالمگیر سطح پر مشہور علی صدیقی کے ادارے عالمی اُردو کانفرنس کی تاریخ ساز ادبی سرگرمیوں میں شامل رہے۔

حیدر آباد دکن کا کتابستان

بے شمار سرکاری کتب خانے ۔ ذاتی لائبریریاں

حیدر آباد کے بازاروں میں اب بھی اُردو بولی سمجھی جاتی ہے

ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹر حالات کا تندہی سے مقابلہ کر رہا ہے

(ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز 44 برس سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ گذشتہ 25 برس سے ''ہفتہ وار گواہ'' پابندی سے شائع کر رہے ہیں۔ چھ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ 2023 میں تلنگانہ یونیورسٹی کی اسکالر نے ان کی صحافتی خدمات پر پی ایچ ڈی کی۔)

جب دبستان لکھنو اور دبستان دلی اجڑ رہے تھے، دبستان دکن بسایا جا رہا تھا۔ حیدر آباد دکن جو کبھی ایک مسلم مملکت تھا، جس نے نہ صرف شمالی ہندوستان کے اہل علم و دانش کے لئے اپنی اغوش وا کردیں، بلکہ عرب کی سرزمین سے بھی اہل ہمت، شجاعت ومختلف فنون کے ماہرین کو آباد کیا' حیدر آباد دکن دنیا کا واحد شہر ہے جس میں ایک عرب شہر یا عرب بستی آباد ہے جس کی آبادی ایک لاکھ کے لگ بھگ ہے' ڈیڑھ سو برس سے یہ اپنی روایات کے ساتھ یہاں آباد ہیں۔

حیدر آباد کے بانی قلی قطب شاہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور آخری مسلم تاجدار نواب میر عثمان علی خان اہل علم و دانش شعر و ادب کے سرپرست اور خود فارسی، اردو کے بہترین شاعر رہے۔ فانی بدایونی، داغ دہلوی، حسرت بدایونی نے حیدر آباد دکن کو وطن ثانی بنایا اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔

آصف جاہ ہفتم نواب میر عثمان علی خان نے انگریزی کے استاد سر مارموڈوک پکھتال سے قرآن پاک کا انگریزی میں ترجمہ کروایا۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کتابیں ترجمہ کروایں اور ان کی طباعت کا اہتمام کیا۔ نظام ششم نواب میر محبوب علی خان بھی سرپرست علم وادب تھے' وہ بھی ایک بہترین شاعر تھے آصف تخلص فرماتے تھے۔ ان کے اور آصف جاہ ہفتم کے دور میں حیدر آباد کے وزیر اعظم مہاراجہ کشن پرشاد شاعر بھی تھے اور علامہ اقبال کے دوست بھی، ان کے لئے ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کیا تھا، اور علامہ اقبال کی زندگی میں حیدر آباد میں یوم اقبال کا اہتمام بھی کیا تھا۔

سید علی بلگرامی جنہیں نظام نے عماد الملک کے خطاب سے نوازا تھا، کتب بینی کے لئے مشہور ہے' یہ ایک سنہرا دور تھا۔ دکن کی قدیم ترین دینی درسگاہ کے بانی حضرت انوار اللہ فاروقی رحمۃ اللہ فضلیت جنگ، عماد الملک، ملا عبد القیوم کی ترغیب پر نظام ششم نے دائرۃ المعارف قائم کیا۔ فارسی کتب، نادر و نایاب مخطوطات کے لئے اپنی مثال آپ تھا' 1948 کے سانحہ کی نذر ہوا۔ ہزاروں کتابیں ضائع کردی گئیں۔ جو بچ گئیں، وہ محفوظ ہیں، دائرۃ المعارف بلاشبہ علم کا خزانہ ہے۔ 1891ء میں عماد الملک کی کاوشوں سے کتب خانہ آصفیہ قائم ہوا، جس میں عماد الملک کی کتابوں کے ذخیرے کو منتقل کیا گیا۔ 1932ء میں آخری نظام نے افضل گنج میں اسکی نئی عمارت کا افتتاح کیا، اور 1936ء میں اپنی تخت نشینی کی سلور جوبلی کے موقع پر اس کا افتتاح کیا۔ 72 ہزار 247 مربع گز پر ایک شاندار پرشکوہ عمارت میں کتب خانہ آصفیہ اب اپنی ماضی کی عظمتوں کی گواہی دیتی ہے۔ اس میں پانچ لاکھ سے زائد کتابیں ہیں۔ اس سے غیر اردو داں طبقہ زیادہ فیضیاب ہو رہا ہے' اور اردو سیکشن اردو والوں کی صورتحال کی عکاسی کرتا ہے۔ ویرانی، گرد سے اٹی کتابیں ••• اکا دکا قاری اور کچھ نوجوان جوڑے کتابوں سے زیادہ ایک دوسرے کے چہرے پڑھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

حیدر آباد میں 90 سرکاری لائبریریز ہیں، جہاں تمام زبانوں کا لٹریچر موجود ہے۔ مگر اردو کتابوں

کے لئے مشہور ہے ایوان اردو، جسے ادارہ ادبیات اردو بھی کہا جاتا ہے۔ پنجہ گٹہ کے علاقہ میں یہ ماہر دکنیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنی ذاتی جائیداد پر اس کی عمارت تعمیر کی۔ نادر و نایاب کتابیں، قدیم اخبارات کی فائلس کا شاندار کلکشن ہے۔ بیشتر کتابوں کو ڈیجٹلائز ڈ کیا گیا ہے۔

سالار جنگ میوزیم نوادرات کے کلکشن کے لئے مشہور ہے، اس کا کتب خانہ بھی نادر و نایاب کتابوں، مخطوطات کے لئے مشہور ہے، اسکالرس اس سے فیضیاب ہوتے ہیں۔

ملک پیٹ پلٹن کے علاقہ میں نظامس ٹرسٹ کی لائبریری چند بہترین لائبریریز میں سے ایک ہے، جس کی دیکھ ریکھ دلچسپی سے کی جاتی ہے۔

حیدر آباد میں ایک میکانک ہوا کرتے تھے محمد عبد الصمد کتابوں کے شوقین، انہوں نے ایک لاکھ سے زائد کتابیں اکھٹا کیں۔ جو بھی ادب کا دلدادہ حیدر آباد آتا وہ اس منفرد کلکشن کو دیکھنے ان کے پاس ضرور آتا۔ شکاگو یونیورسٹی نے یہ کلکشن خرید لیا اور سوندریہ کیندرا وگنانم، میں منتقل کیا۔ بدقسمتی سے سیلاب کے پانی نے اس کلکشن کو برباد کر دیا۔ کتابیں موجود ہیں مگر پڑھی نہیں جاسکتیں۔

اردو ہال حمایت نگر حیدر آباد میں اردو، انجمن ترقی اردو کی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ مولوی حبیب الرحمن نے اپنی جائیداد وقف کردی، اس میں اردو آرٹس ایوینگ کالج قائم کیا گیا اور لائبریری بھی۔ یہاں بھی اردو شعروادب کا ذخیرہ ہے۔

ڈاکٹر حسن الدین مرحوم احمد آئی اے ایس، فراست علی خسرو، شاہد حسین زبیری کے ذاتی کتب خانے بھی اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر صفی اللہ کے پاس آصف جاہی خاندان (نظام) اور حیدر آباد پر سات ہزار کتابوں کا کلکشن ہے، بیشتر اسکالر حیدر آباد سے متعلق مواد ان ہی سے حاصل کرتے ہیں۔

سوانحی خاکہ

نام۔ محمد نعمان خان

والد کا نام۔ حکیم حافظ محمد سلیمان خان (مرحوم)۔ پیدائش۔ 2 جولائی 1952۔ جائے پیدائش۔ بھوپال

ابتدائی اور ثانوی تعلیم۔ پھول محل مڈل اسکول اور جہانگیریہ ہائر سیکنڈری اسکول، بھوپال

اعلیٰ تعلیم۔ بی اے۔ ایم اے۔ سیفیہ پوسٹ گریجویٹ کالج۔ بھوپال۔ پی ایچ ڈی۔ برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال۔

ملازمت۔ معاون مدیر روزنامہ آفتابِ جدید بھوپال (ستمبر 1978 سے جون 1981)
استاد، شعبہ اُردو سیفیہ کالج، بھوپال (1981 سے 1992) صدر شعبہ اُردو سیفیہ کالج بھوپال (1996 تا 2002) ریڈر و پروفیسر اُردو، این سی ای آر ٹی، شری آربندو مارگ، نئی دہلی 110016 (5 اپریل 2002 سے جولائی 2014 تک)

گھر کا پتہ۔ 56، ندیم روڈ، ابراہیم پورہ، بھوپال (ایم پی) 103، تھرڈ فلور، گلی نمبر 3، جوہری فارم (اوکھلا) نئی دہلی 110025

رابطہ۔ 9891424095 فیکس: 011-26962873
ای میل e-mail.n khan.ncert@.nic.in

مطبوعات۔ بھوپال ادب کے آئینے میں (1994)۔ بھوپال میں اُردو۔ انضمام کے بعد (2006) تفہیم وتاثر۔ تلاش وتجزیہ۔ بھوپال میں اُردو۔ انضمام کے بعد (2006)۔ سرمایہ ادب

ترتیب وتالیف: مشاہیر اور ریاست بھوپال۔ فلسفہ تعلیمات۔ اپنوں کے درمیان۔ نایاب ہم (خاکے)

بہ اشتراک: ارمغانِ سیفیہ 1986۔ جوہرِ آزاد 1990۔ فخر نامہ 1996

عبدالقوی دسنوی ایک مطالعہ 2001۔ درسی اُردو کتب برائے ایس سی ای آر ٹی، مدھیہ پردیش بھوپال۔ درسی اُردو کتب برائے این سی ای آر ٹی، نئی دہلی۔ انتخابِ غزلیات برائے بی اے سال اول برائے ایم پی یونیورسٹیز۔ انتخاب انشائیے اور خاکے برائے بی اے سال اول برائے ایم پی یونیورسٹیز۔

اعزازی عہدے۔ اعزازی مدیر سہ ماہی کاروانِ ادب، بھوپال (4 سال)۔ چیئرمین، بورڈ آف اسٹڈیز، برکت اللہ یونیورسٹی بھوپال (3 سال)۔ ایکسپرٹ ممبر برائے مدھیہ پردیش ایس سی ای آر ٹی اُردو درسی کتب کمیٹی (3 سال)۔ ایکسپرٹ ممبر، بوڑرڈ آف اسٹڈیز، وکرم یونیورسٹی اجین۔ رکن، مشاورتی کمیٹی برائے ایم پی اُردو اکادمی اور کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز (2 سال)۔ رکن، مدھیہ پردیش یونیفائڈ اردو نصابی کتب کمیٹی، حکومت مدھیہ پردیش (2 سال)۔ ایڈیشنل پرنسپل، سیفیہ پوسٹ گریجویٹ آرٹس کامرس اینڈ لا کالج، بھوپال (1996)۔ نائب صدر، مدھیہ پردیش اُردو رائٹرز گلڈ۔ چیئرمین، دبستان بھوپال۔ نائب صدر کل ہند اُردو قبیلہ، بھوپال۔ رکن سپتک فائن آرٹ سوسائٹی بھوپال۔ ایکسپرٹ ممبر، آر ڈی سی، برکت اللہ یونیورسٹی، بھوپال

اعزازات۔ نیشنل میرٹ ایوارڈ اسکالر شپ، محکمہ تعلیمات حکومت مدھیہ پردیش (بی اے میں میرٹ لسٹ میں آنے پر 2 سال کے لیے)۔ ملا سجاد حسین گولڈ میڈل 1975 (سیفیہ کالج کی فیکلٹی آف آرٹس میں سب سے زیادہ نمبرات حاصل کرنے اور ایم اے اُردو کے امتحان میں یونیورسٹی کی میرٹ لسٹ میں آنے پر)۔ ملا فخر الدین اعزاز 2002۔ کل ہند اُردو رابطہ کمیٹی اعزاز 2003۔ ستارہ بھوپال

تصانیف زیرِ طبع: نقد ونظر) تنقیدی مضامین)۔ چند مشاہیر ادب اور بھوپال (تحقیقی مضامین)۔ تصورات وتاثرات (شخصی مضامین)۔ کتابوں کی باتیں (ریڈیو تبصرے)۔ سخنوران بھوپال۔ کیف بھوپالی اعزاز۔ نواب صدیق حسن خان اعزاز۔ شاداں اندروی ایوارڈ۔ ظفر حنفی لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ۔

نواب بہادر یار جنگ نے اپنی کتابوں کا کلکشن انجمن مہدویہ (چنچلگوڑہ) کو عطیہ کردیا تھا۔ یہ بھی ایک اچھا کتب خانہ ہے۔

حیدر آباد اب سے تیس پینتیس برس پہلے تک اردو کا بازار بھی تھا۔ پرانے شہر حیدر آباد میں مدینہ بلڈنگ، چارمینار، لاڈ بازار سے چوک مرغان تک اتوار بازار لگا کرتا تھا، ہر قسم کی قدیم اردو کتابیں، جرائد، رسائل فٹ پاتھ پر مل جایا کرتے تھے، اب بھی یہ روایت برقرار ہے مگر پہلے جیسی بات باقی نہ رہی۔ چارمینار کے قریب اردو کتابوں کے کئی پبلشرس تھے۔ حسامی بک ڈپو اردو کتابوں کے لئے مشہور تھی، اسٹوڈنٹس بک ڈپو، کمرشیل بک ڈپو، الکتاب مینار بک ڈپو پبلشر بھی تھے۔ افسوس کے ان سب نے اب اپنے کاروبار میں تبدیلی لائی ہے۔

آج کے دور میں ہدیٰ بک ڈسٹری بیوٹر حالات سے مقابلہ کر رہا ہے، یہ ہندوستان کے ہر کتب میلے میں حیدر آباد کی نمائندگی کرتا ہے۔ اردو کے علاوہ انگریزی اور تلگو کتابیں چھاپتا بھی ہے اور نمائش بھی کرتا ہے۔

''القلم'' بھی اپنی دیرینہ روایات کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

دکن ٹریڈرس، مکتبہ جماعت اسلامی، عرشی پبلکشنز نے حیدر آباد دکن کے کتابستان کو برقرار رکھنے میں اہم رول ادا کیا ہے اگرچہ وہ خسارے میں ہیں۔

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی لائبریری اور ان کی جانب سے کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ادارہ ادبیات، ماہنامہ ''سب رس'' پابندی سے شائع کر رہا ہے۔ ''گواہ'' سلور جوبلی مکمل کر چکا ہے، شاداب انڈیا، خوشبو کا سفر ایڈیٹر صلاح الدین نیر، شگوفہ ایڈیٹر ڈاکٹر مصطفی کمال پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ سیاست، منصف، اعتماد، رہنمائے دکن، سہارا کے ادبی ایڈیشن ان کے قارئین کے ادبی ذوق کی تسکین کر رہے ہیں، اگرچہ یہ ایڈیشن اب آن لائن ہو چکے ہیں۔

تلخ حقائق کے باوجود حیدر آباد اب بھی اردو کا شہر ہے، جس کے بازاروں میں اردو بولی جاتی ہے، دکانوں، دفاتر کے سائن بورڈز، حکومت تلنگانہ کے سرکاری لوگو میں اردو اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے اور حیدر آباد کے دینی مدارس، اردو کے شجر کو اپنے خون جگر سے سینچ رہے ہیں۔

بھوپال کے اُردو پبلشرز اور بک سیلرز

بھوپال بک ہاؤس۔ اب بھی اُردو زبان وادب کے ہر موضوع کی کتابیں اور رسائل دستیاب

اساتذہ۔ ریسرچ اسکالرز کے استفادے کے لیے اہم کتب خانے

ممتاز محقق اور اُردو کے پروفیسر سحر نعمان خان کی مختصر مگر جامع تحریر

بیت الکمال، دار الاقبال، بھوپال کے فرمانروایان کی ادب نوازی اور ریاست بھوپال سے مشاہیر علم وادب کی وابستگی کے سبب ہر عہد میں اسے گہوارہ علم وادب وتہذیب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

نواب سکندر جہاں بیگم نے 1859ء میں اردو زبان کو ریاست بھوپال کی سرکاری زبان کا درجہ عطا کیا۔ جس کی وجہ سے کئی سرکاری اور نجی ادبی ادارے، کتب خانے اور مطابع قائم ہوئے اور دفتر تاریخ وتحقیق کے تحت اردو زبان میں تصنیف وتالیف وتراجم اور اردو اخبارات ورسائل کی طباعت واشاعت کے سلسلے شروع ہو گئے۔

ماضی میں موتی محل شوکت محل، تاج محل، اور قصر سلطانی کے شاہی کتب خانوں اور معروف زمانہ سرکاری حمیدیہ لائبریری نے جہاں ریاست بھوپال کے قارئین علم وادب اور ادیبوں، محققین اور طلبہ واساتذہ کی ضرورتوں کو پورا کیا وہیں یکم جون 1949ء کو انضمام ریاست کے بعد بھوپال کی

مولانا آزاد سنٹرل لائبریری، اقبال لائبریری، کتب خانہ دارالعلوم، تاج المساجد، جامعہ عربیہ مسجد ترجمہ والی، میونسپل کارپوریشن بھوپال کے امبیڈکر لائبریری، احمد حسین لائبریری، نقوی لائبریری، تاج لائبریری، مکتبہ عابدیہ، قادری لائبریری، واحد لائبریری، حمیدیہ کالج، سیفیہ کالج، ایم ایل بی گرلس کالج، ایم پی اردو اکادمی اور سپرے سنگھر الیہ وغیرہ کے کتب خانوں نے اہل زبان و ادب خصوصاً اردو طلبہ، ریسرچ اسکالر اساتذہ کو استفادے کے مواقع فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

انضمام ریاست بھوپالی سے قبل اور بعد اردو بک سیلر کی جو اہم دکانیں تھیں اُن میں احمد حسین، مکتبہ شرقیہ، سعیدیہ بک ڈپو، سنٹرل بک ڈپو، زبیری بک ڈپو اور بھوپال بک ہاؤس کے علاوہ ایم پی اردو اکادمی، ہندی گرنتھ اکادمی ، ایم پی ٹیکسٹ بک کارپوریشن کے خصوصی سیلس کاؤنٹر کے نام شامل ہیں۔

دیگر شہروں کی طرح بھوپال میں بھی انٹرنیٹ، ویب سائٹس، ای پورٹل، ای لائبریری کی سہولتیں بآسانی مہیا ہونے کے سبب اب اردو کتابوں کی دوکانوں کی تعداد میں بھی نہ صرف کمی واقع ہوئی ہے بلکہ اردو ادب سے متعلق کئی دکانیں مذہبی کتابوں کی فروختگی کے لیے تبدیل ہوچکی ہیں۔

اس لحاظ سے بھوپال بک ہاؤس (بدھوارہ بھوپال) ہی واحد ایسی دوکان ہے جہاں اردو زبان وادب کی ہر موضوع کی کتب اور رسائل فروخت کیے جاتے ہیں۔

خان باسط مرحوم نے 1967ء میں بھوپال بک ہاؤس کو قائم کیا تھا۔ خان باسط مرحوم کی اردو دوستی، محنت ولگن کے سبب بھوپال بک ہاؤس کاروبار کی حد تک ہی اردو کتب ورسائل کی فروختگی کا ذریعہ نہیں بنا بلکہ بہت جلد اس نے ایک معیاری اشاعتی مرکز کی حیثیت بھی حاصل کرلی۔

بھوپال بک ہاؤس کے زیر اہتمام ابتدا اردو درسی کتب اور ان سے متعلق نوٹس شائع کیے گئے باقاعدہ طور پر علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی تخلیقی کتب بھی شائع کی جانے لگیں۔

بھوپال بک ہاؤس کے زیر اہتمام جو ادبی کتب شائع ہوئیں اور ان کے کئی ایڈیشن بھی شائع ہوئے، ان میں علامہ سید عابد علی وجدی الحسینی قاضی شہر بھوپال کی تصانیف میں 'ہندوستان اسلام کے سائے میں' 'تاریخ قضا ومعیشانِ بھوپال' 'قطبِ مالوہ' 'تاریخ ریاست بھوپال' تحریکات آزادی میں بھوپال کا حصہ' ابراہیم یوسف کی تصنیف 'اردو کے اہم ڈراما نگار' ڈاکٹر ہارون ایوب کی کتاب 'اردو میں درس وتدریس کے مسائل' قمر جمالی کے ریڈیائی ڈراموں کا مجموعہ 'مٹھی بھر دھول' مختار شیم کا شعری مجموعہ 'نامہ گل' اور افسانوی مجموعہ 'پس عکس خیال' شمیم صادقہ کی کتاب 'ادھورے چہرے' حیدر عباس رضوی کی کتابیں 'یادگار غالب ایک مطالعہ' اور 'ڈراما انارکلی کا تحقیقی، تنقیدی جائزہ' اخلاق اثر کیا کتاب 'ملاقات' طیبہ ہی کی کتاب 'تاریخ فرمانروایان ریاست بھوپال' اور ڈاکٹر سید حامد حسین کی کتاب 'مثنوی اسرار خودی ایک مطالعہ' کے نام قابل ذکر ہیں۔

بھوپال کے بک ہاؤس کے مالک خان باسط کا انتقال ہو چکا ہے لیکن ان کے بیٹے جمال خان کتابوں کی اس دوکان کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ دوکان بھوپال اور صوبہ مدھیہ پردیش کے اردو اداروں کے طلبہ، اساتذہ اور قارئین کی ضرورتوں کو پورا کرنے میں کامیابی کے ساتھ خدمت انجام دے رہا ہے۔

ڈاکٹر ناصرالدین انصار۔

مہاراشٹر میں اُردو فارسی پر قابل رشک عبور

تمام کتابیں مہاراشٹر اور اتر پردیش ساہتیہ اکیڈمی سے انعام یافتہ

ڈاکٹر ناصرالدین انصار کا شمار عصر حاضر کے معروف قلم کاروں میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ہمہ جہت اور ہفت زبان قلم کار ہیں۔ ان کا ادبی علمی تنقیدی اور شعری ذوق نہایت بالیدہ اور تربیت یافتہ ہے۔ وہ اُردو زبان کے مزاج شناس ہیں تو فارسی کے کلاسیکل ادب سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ انہیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر قابل رشک عبور حاصل ہے۔ ساتھ ہی عربی، ہندی، مراٹھی اور انگریزی زبان وادب سے بھی وہ گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر ناصرالدین انصار مہاراشٹر کے ضلع اکولہ کے ایک قصبے مانا میں 15 مارچ 1967 کو پیدا ہوئے۔ ان کا تعلیمی کیریئر نہایت شاندار رہا۔ انھوں نے ناگپور اور امراوتی یونیورسٹی سے چھے مضامین میں ایم اے کرنے کے بعد دو مضامین (اردو اور فارسی) میں نیٹ کا امتحان بھی پاس کیا نیز اردو شاعری میں فکر اسلامی کا جائزہ اس عنوان پر امراوتی یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ درس وتدریس سے وابستگی کے بعد وہ ترقی کرکے بلاک ایجوکیشن آفیسر کے عہدے تک پہنچے۔

ڈاکٹر انصار ادبی وعلمی میدان میں بے حد فعال ہیں۔ وہ مختلف تعلیمی سماجی، ادبی اور فلاحی اداروں سے وابستہ ہیں اور وسط ہند میں شعر وادب کی اہم شخصیت شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ ریاست مہاراشٹر میں نصابی کتابوں کی ترتیب وتدوین کے ادارے بال بھارتی پونہ میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی لسانی اور مطالعاتی کمیٹی کے رکن ہیں۔ ڈاکٹر انصار یوں تو ادب کی تمام اصناف سے دلچسپی رکھتے ہیں لیکن اردو زبان وتن پر غیر معمولی دسترس کے باعث ان کا غالب رجحان تنقید کی جانب ہے۔ بحیثیت ادیب ان کی تحریروں میں زبان کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ادبی تفکر بھی پایا جاتا ہے۔ اب تک ان کی مجھے کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں ادبی مطالعات (تحقیق وتنقید) ارباب نظر (ناکے) مکتوبات مشاہیر (خطوط) روش گفتگو (مصاحبے) سیر وسیاحت (سفرنامے) اور مرد خوب آگاہ جیسی کتابیں شامل ہیں۔

ڈاکٹر ناصرالدین انصار کی تقریباً تمام کتابوں کو مہاراشٹر اور اتر پردیش ساہتیہ اکادمی نے انعامات سے نوازا ہے۔

23 دسمبر 1955 کورتول جو پوری دنیا میں انور رتول آم کی وجہ سے مشہور ہے میں پیدا ہوئے۔ ہائی سکول تک کی تعلیم اپنی ننھیال سکندر راؤ ضلع علی گڑھ مین ہوئی اس کے بعد کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ علی گڑھ سے پری یونیورسٹی، بی اے، بی ایڈ، ایم ایڈ، ایم اے، پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل اور معلم اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی مین پی آر او، ڈپٹی رجسٹرار، پروفیسر اور ڈائریکٹر اردو اکیڈمی اے ایم یو کے عہدے پر فاءز رہے۔ 30 سے زاید اردو، ہندی اور انگریزی مین کتابیں تصنیف اور تالیف کیں۔ مسلم تعلیم، تعلیم نسوان، 1857، سرسید اور علی گڑھ تحریک پر کتابیں مستند حوالہ جاتی اہمیت کی تصور کی جاتی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی، گوپی چند نارنگ، انتظار حسین نے ان کی علمی اور تحقیقی کاموں کو خوب سراہا ہے۔ اردو شعریات کے اولین تذکرہ نگار حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع ہو چکی ہے۔ مسلم تعلیم نسوان چلمن سے چاند تک اردو، ہندی اور انگریزی مین شائع ہو چکی ہے۔ انگریزی ورژن VDM Verlog سے شائع ہوئی تھی. اردو کی تین کتابیں لاہور پاکستان سے بھی شائع ہو چکی ہیں۔ یوپی اردو اکیڈمی سمیٹ بہت سے اداروں اور تنظیموں نے اعزاز سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط۔ 50 سال سے تحقیق میں مگن

اردو کے علاوہ عربی اور مراٹھی زبانوں پر عبور

ولی دکنی ایوارڈ۔ سیتو مادھیو پگڑی ایوارڈ۔ حفیظ میرٹھی ایوارڈ سے نوازے گئے

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کا شمار عہد حاضر میں اردو زبان کے ممتاز محققین میں ہوتا ہے ۔ وہ یکم جنوری ۱۹۵۰ کوکل گاؤں ضلع ایوت محل مہاراشٹر میں پیدا ہوئے ۔ نوعمری ہی میں پیشہ درس وتدریس سے وابستہ ہوگئے اور ۲۰۰۸ میں ایک مقامی ہائی اسکول سے بحیثیت صدر مدرس سبک دوش ہوئے ۔ انھوں نے یک درگیر ومحکم گیر پر عمل کرتے ہوئے ابتدا ہی سے تحقیق کو اپنا مطمح نظر بنایا اور تقریباً پچاس سال تک نہایت یکسوئی اور خاموشی سے میدان تحقیق میں کئی اچھوتے موضوعات پر داد تحقیق دی ۔ ڈاکٹر نشیط نے خصوصی طور پر تقدیسی ادب جیسے شعبہ ادب کو اپنی تحقیقی کاوشات کے لیے منتخب

کیا اور اول روز ہی سے اس میں کمال درجے کی تحقیقات پیش کیں ۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک میں تقدیسی ادب کے اہم اور معتبر محقق و نقاد کے طور پر ان کی شناخت قائم ہے۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط نے تقریباً دو دہائیوں تک ریاست مہاراشٹر میں نصابی کتابوں کی ترتیب و تدوین کے ادارے بال بھارتی میں اپنی خدمات نہایت خوش اسلوبی اور نیک نامی سے انجام دیں ۔ اس دوران وہ تقریباً دس سال تک اردو لسانی کمیٹی کے چیئر مین بھی رہے ۔ انھیں اردو کے علاوہ عربی اور مراٹھی زبانوں پر قابلِ رشک عبور حاصل ہے ۔ مراٹھی حلقوں میں بھی انھیں ایک اہم دانشور کی حیثیت سے قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ ان کی تحقیقی تصنیفات کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے ۔ جن میں اردو مراٹھی کے تہذیبی رشتے اردو میں حمد و مناجات 'اردو مراٹھی کے باہمی روابط 'اسطوری فکر و فلسفہ (اردو شاعری میں '(اردو رباعیات میں ہندوستانی عناصر ' اردو میں معراج نامے کی روایت اور نحویات غالب جیسی اہم کتابیں شامل ہیں۔

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط کو ان کی گرانقدر تحقیقی خدمات کے لیے قومی اور ریاستی سطح کے متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا ہے جن میں ولی دکنی ایوارڈ ' سیتو مادھو پگڑی ایوارڈ ' قاضی سجاد حسین ایوارڈ اور حفیظ میرٹھی ایوارڈ جیسے ایوارڈز شامل ہیں ۔ ان کی متعدد کتابوں کو ملک بھر کی مختلف ریاستی اکادمیوں کی جانب سے خصوصی ایوارڈز بھی تفویض کیے گئے ہیں۔

شاعر و محقق ڈاکٹر محمد شرف الدین (ناگپور)

52 کتابیں شائع ہو چکی ہیں متعدد ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں

معروف شاعر، محقق، نقاد اور اردو کے معلم ڈاکٹر محمد شرف الدین (تخلص : ساحل) نے ابتدائی و ثانوی تعلیم کے بعد ناگپور یونیورسٹی سے بی اے (1972) کے بعد تین زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں بالترتیب 1974، 1976-1978 میں ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔ 1977 میں ان کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی اس کے بعد 1981 میں انہوں نے بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی ۔ 1986 میں انہوں نے دوسری بار پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر شرف الدین نے اس قدر علمی اور ادبی اسناد حاصل کرنے کے بعد بھی وہ کسی پی جی کالج میں باضابطہ ملازمت سے محروم رہے۔ البتہ انہوں نے بعض تعلیمی اداروں میں کام کیا ہے لیکن یہ ملازمت ان کے لیے عارضی ہی ثابت ہوئی۔ مثلاً انہوں نے اسلامیہ ہائی اسکول ناگپور میں چار سال (1989 تا1973)، ناگپور میں تین سال (1984 1981) اور پورواں کالج کامٹی، ناگپور میں ایک سال (1989 ۔1990) درس و تدریس کے فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی ادبی زندگی کا آغاز 1964 میں شعر گوئی سے ہوا جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ان کے دس شعری مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے حمد، مناجات، نعت، سلام، منقبت، غزل نظم، آزاد نظم، رباعی اور قطعہ وغیرہ میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔ جب اردو تحقیق و تنقید کا جذبہ 1970 میں بیدار ہوا تو ان کا پہلا تنقیدی مضمون اردو غزل میں قومی یک جہتی کے رجحانات ماہنامہ 'دوام ٹانڈہ'، فیض آباد میں شائع ہوا جس کے ایڈیٹر شبنم سبحانی (مرحوم) ہوا کرتے تھے۔ شرف الدین ساحل کا پہلا تحقیقی مضمون مالک رام کے رسالہ تحریر (شمارہ 21، 1972) میں شائع ہوا۔ ان کی تقریباً 52 کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے موضوعات میں تحقیق، تنقید، تاریخ، تدوین، شرح و تفہیم اور متفرقات شامل ہیں۔ ان کی سات کتابوں کو اتر پردیش اردو اکادمی اور مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے انعام سے نوازا جا چکا ہے۔ بہار اردو اکیڈمی نے ایک کتاب کو انعام عطا کیا ہے۔ علاوہ ازیں شرف الدین ساحل کو ایک درجن سے زائد ایوارڈز و اعزازات عطا کیے گئے ہیں ان میں 'امتیاز میر ایوارڈ' (1997) اور 'سرسید ایوارڈ' (1998) شامل ہیں۔ 2012 میں اور 'بھر گورو پرسکار) بھی ملا تھا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی نے 2019 میں 'ولی دکنی ایوارڈ' سے نوازا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مارواڑی فاؤنڈیشن ناگپور نے ایک لاکھ روپے پر مشتمل 'پریودھن کا اٹھا کر ایوارڈ' سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر شرف الدین شہر ناگپور کے کئی دینی اور تعلیمی اداروں کے اعلیٰ مناصب پر فائز رہ چکے ہیں۔ ان کی علمی و ادبی خدمات پر پروفیسر نصرت سلطانہ نے پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا تھا۔ اس مقالہ پر وکرم یونیورسٹی اُجین نے 2006 میں پروفیسر نصرت سلطانہ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض کی تھی۔

اہم تصانیف: بیان میرٹھی (حیات و شاعری)۔ ناگپور میں اردو کا ارتقائی سفر۔ ناگپور کا مسلم معاشرہ (تین جلدوں میں)۔ خاقانی شروانی (حیات و شاعری)۔ صفحہ دشت (تحقیقی مضامین)۔ نقش معنی (تنقیدی مضامین)۔ آئینہ تمثال (مجموعہ کلام)

ڈاکٹر محمد اسد اللہ۔ انشائیہ نگار۔ مراٹھی کے مترجم

19 کتابیں مقبولیت خاص و عام حاصل کر چکی ہیں

ڈاکٹر محمد اسد اللہ، اردو کے ایک انشائیہ نگار، ادبِ اطفال کے معمار، مراٹھی کے مترجم اور تنقید نگار کے طور پر مشہور ہیں۔ محمد اسد اللہ ضلع امراوتی کے ایک قصبے وروڈ میں ۱۶ جون ۱۹۵۸ کو پیدا ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد جونیئر کالج ناگپور میں ۲۵ سال تک تدریسی خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے مختلف اداروں میں سماجی و ادبی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ نصابی کتابوں کے ادارے بال بھارتی پونا میں اردو کی مطالعاتی و لسانی کمیٹی اور مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن پونے کے رکن کی حیثیت سے خدمات انجام دیتے رہے ہیں۔

اردو انشائیہ نگاری کی تحریک جسے وزیر آغا کی سرپرستی حاصل تھی، ہندوستان کے تین ادیبوں نے اس میں شمولیت اختیار کی اور اپنی پہچان بنائی ان میں احمد جمال پاشا اور رام لعل نابھوی کے علاوہ محمد اسد اللہ بھی ہیں۔

ڈاکٹر محمد اسد اللہ نے اردو، عربی، انگریزی اور فارسی میں ایم اے کیا اور انشائیہ سے متعلق تحقیقی مقالہ پیش کر کے امراوتی یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ناگپور، امراوتی اور ناسک کی یونی ورسٹیز کے نصاب میں ان کی کتابیں اور مضامین شامل ہیں۔ ان کی انیس کتابیں کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں۔ انشائیہ کی روایت مشرق و مغرب کے تناظر میں۔ یہ ہے انشائیہ۔ انشائیہ ایک خواب پریشان۔ انشائیہ شناسی۔ بوڑھے کے رول میں پر پرزے ڈبل رول اور صبح زرنگار قابل ذکر ہیں۔ پیکر اور پرچھائیاں (تنقید و تحقیق)۔ خواب نگر، گپ شپ (ادب اطفال)۔ جمال ہم نشیں اور دانت ہمارے (مراٹھی تراجم)۔ کھلونا ایک انتخاب اور بچوں کی زمین سے شامل ہیں۔

مہاراشٹر، بہار، یوپی اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں نے محمد اسد اللہ کو ان کی مختلف تصانیف پر انعامات سے نوازا ہے جن میں مہاراشٹر اردو اکادمی کا اردو مراٹھی خدمات کے لئے سیتو مادھو پگڑی ایوارڈ بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر مشتاق تجاروی۔

سیرت طیبہ۔ تاریخ۔ ادبیات تصوف سے دلچسپی

200 سے زائد مقالے۔ سیرت رسول۔ برصغیر میں اشاعت اسلام کی تاریخ

ڈاکٹر مفتی محمد مشتاق تجاروی (پیدائش: 10 فروری (1969) ضلع الور، راجستھان (میوات) کے مشہور تاریخی قصبہ تجارہ کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد حکیم مولانا محمد عثمان اور اپنی والدہ سے حاصل کی۔ اس کے بعد ایک سال مدرسہ سبحانیہ، دہلی میں رہے پھر دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا اور وہاں سے فضیلت کی سند حاصل کرنے کے بعد تکمیل تفسیر کا ایک سالہ نصاب مکمل کیا۔ پھر مدرسہ امینیہ دہلی سے افتا کیا۔ اس کے بعد کچھ عرصے کے سلسلہ تعلیم موقوف رہا اس دوران میں علی گڑھ میں بعض تحقیقی اداروں سے وابستہ رہے۔ پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے بی۔ اے، ایم۔ اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد جامعہ سے ہی بطور استاد

منسلک گئے۔گزشتہ 15 سال سے وہ اسی یونیورسٹی کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر تجاروی کو سیرت طیبہ، تاریخ ادبیات اور تصوف سے دل چسپی ہے۔ان کی چھوٹی بڑی تقریبا پندرہ کتابیں اور ترجمہ کردہ کتابیں ملک اور بیرون سے شائع ہوچکی ہیں۔دوسو سے زیادہ مقالے ملکی اور بین الاقوامی جرائد میں اشاعت پذیر ہوچکے ہیں اور سو سے زیادہ سیمیناروں میں انھوں نے مقالات پیش کیے ہیں۔ان کی تصانیف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شعب ابی طالب میں، سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی، برصغیر ہند میں اشاعت اسلام کی تاریخ، فضلائے دیوبند کی قرآنی خدمات، غالب اور الور، دارا شکوہ ایک صوفی شہزادہ، حضرت خواجہ اجمیری حیات و تعلیمات، مولانا ابراہیم الوری میوات کے عظیم مجاہد آزادی، آسیہ خاتون میواتی جنگ آزادی کی ایک گمنام مجاہدہ (اردو و ہندی) اور چند چھوٹے رسائل ہیں۔ان کے علاوہ ان کے تراجم میں تصوف اور شریعت، تذکرہ خواتین صوفیہ، شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور تجدید فکر اسلامی اور عصر حاضر میں فتوی کی تبدیلی کے اسباب وغیرہ ہیں۔ان کتابوں کے ہندو پاک میں کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

اطہر فاروقی۔

اُردو زبان کی تفہیم میں خدمات۔مسلمہ

’بابر کی اولاد‘۔ترجمے پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ

اردو وانگریزی زبان کے معروف ادیب، محقق اور مترجم ہیں، اردو زبان کی تفہیم وسیاست میں ان کی خدمات کا ادبی حلقوں میں اعتراف کیا جاتا ہے۔انھوں نے اردو زبان کے سیاسی وسماجی محرکات پر جواہر لال نہرو یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ہندستان کے موقر انگریزی اور اردو کے جریدوں واخباروں میں مسلسل فکر انگیز مضامین شائع ہوتے رہے ہیں، ’بابر کی اولاد‘ کے ترجمے پر انھیں ساہتیہ اکادمی اوارڈ سے نواز جاچکا ہے۔اردو زبان میں ’گفتگو ان کی‘، ’نامکمل‘، ’اختر الایمان‘، ’آزاد ہندستان میں اردو زبان، تعلیم اور صحافت‘، ’ہندستان میں اردو سیاست کی تفہیمِ نو‘ اور انگریزی زبان میں

Delhi in Historical Perspectives, The Life & Poetry of Bahadur Shah Zafar, Redefining Urdu Politics in India, Muslim and Media Images, The Last Gathering (Bazm-i Akhir), Sawaneh-i Delhi

جیسی کتب ادبی حلقوں میں تسلیم کی گئی ہیں۔

شمیم طارق۔

روشن ضمیر ادیب وشاعر اور وسیع المطالعہ کالم نگار

محقق، نقاد، شاعر، کالم نگار شمیم طارق ان لوگوں میں ہیں جنہیں قدرت نے تقریر اور تحریر کی یکساں صلاحیت عطا کی ہے۔2015 میں ساہتیہ اکیڈمی نے انعام کا فیصلہ کرنے کے لیے جو ’جیوری‘ بنائی تھی اس کا ایک رکن میں بھی تھا اور پوری جیوری نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا تھا کہ 2015 کا ساہتیہ اکیڈمی انعام شمیم طارق کی کتاب ’’تصوف اور بھکتی، تنقیدی اور تقابلی مطالعہ‘‘ کو ملنا چاہئے۔بعد میں ان کے اعزاز میں بھی اسلام جیمخانہ کے بڑے ہال میں جلسہ ہوا تو مہمان خصوصی میں ہی تھا۔اس جلسے میں بھی میں نے کہا کہ حاضرین نے ستائش وتائید کی کہ ’’شمیم طارق عالم ہیں اور ان کا اعزاز عالم کا اعزاز ہے۔‘‘ اس کتاب کے چار ایڈیشن اُردو میں اور ایک انگریزی میں شائع ہوچکا ہے۔پڑھنے والوں نے محسوس کیا کہ یہ کتاب وہی لکھ سکتا تھا جس کا ذہن اور قلب دونوں روشن ہوں۔فہرست سازی مقصود نہیں ورنہ ان کی دو درجن کتابوں کے نام لکھے جاسکتے ہیں۔بعض کتابوں کے تو کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔2024 میں ساہتیہ اکیدمی نے ان کی کتاب ’’نئی صدی نیا ادب‘‘ شائع کی ہے جس میں اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے کہ ادھر چالیس پچاس برسوں میں اُردو میں کن نئے موضوعات پر لکھا گیا ہے اور جن موضوعات پر مسلسل لکھا جارہا ہے ان میں کیا نیا پن یا ندرت پیدا کی گئی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ہندوستان کی قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان نے ایک آن لائن پروگرام منعقد کیا تھا اور اس پروگرام میں انہوں نے محمود شام کے ایک شعر کو پڑھ کر سامعین کو چونکا دیا تھا شعر تھا۔

بانٹنا چاہا عقائد نے مجھے
احسن الخلق تھا بٹتا کیسے

اس شعر کے انتخاب سے ان کی انسانیت دوستی کا بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور وسیع مطالعے کا بھی۔ان کی زندگی اور شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنا ہو تو اتنا لکھنے پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے کہ وہ سیدھے سچے انسان ہیں اور اپنے علم ومطالعے کا معاوضہ لینے کے لیے جوڑ توڑ بھی نہیں کرتے۔اہل علم خود مجبور ہوتے ہیں کہ ان کی خوبیوں کا اعتراف کریں مثال کے طور پر پروفیسر خالد محمود صاحب نے جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کی اُردو شعبے اور دہلی اُردو اکیڈمی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ ’’مشرف، محنت اور کفالت‘‘ کے ساتویں ایڈیشن میں لکھا ہے کہ ’’کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر دلعزیزی میں موضوع کی اہمیت اور اس کی پیغام کی معنویت اپنی جگہ

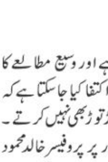

حقانی القاسمی

نام: حقانی القاسمی
پیدائش: 15 جولائی 1970
سرٹی فیکیٹ کے مطابق: 26 جنوری 1970
تعلیم: ایم،اے ایم،فل (علی گڑھ)
اعزازات: تخلیقی نثر کا ایوارڈ (اردو اکاڈمی دھلی)، کل ھند حکیم قمر الحسن ایوارڈ (مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی)

حقانی القاسمی عصری تنقیدی منظرنامے کا ایک اہم نام ہے جس نے منفرد تنقیدی نگاہ اور تخلیقی اسلوب سے اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔

مشرقی شعریات اور تانیثیت کے باب میں حقانی القاسمی کی تحریریں اعتبار کی نظر سے دیکھی جاتی ہیں۔علی گڑھ کے فیض یافتہ حقانی القاسمی کی کتابیں:

1۔فلسطین کے چار ممتاز شعراء 2۔طواف دشت جنوں 3۔لاتخف 4۔تکلف برطرف 5۔رینو کے شہر میں 6۔خوشبو روشنی رنگ 7۔شکیل الرحمٰن کا جمالیاتی وجدان 8۔بدن کی جمالیات 9۔تنقیدی اسملاژ 10۔ادب کولاژ ادبی حلقوں میں خاصی مقبول ہوئیں۔

ادب اور صحافت کا حسن امتزاج حقانی القاسمی نے ہفت روزہ اخبار نو، نئی دہلی اور ہفت روزہ نئی دہلی جیسے اخبارات سے وابستگی کے دوران ادبی موضوعات اور سیاسی مسائل پر تجزیاتی مضامین لکھے۔آواں گارد، ادبی مجلّہ ’’استعارہ‘‘ کے مدیر کی حیثیت سے مجلّاتی صحافت میں ان کی الگ پہچان بنی، اس مجلّہ میں حقانی القاسمی کی تنقیدی تحریریں اور حقانی تبصروں نے پوری اردو دنیا کو متوجہ کیا۔خاص طور پر بدن کی جمالیات سیریز نے خاصی دھوم مچائی۔حقانی القاسمی سہارا انڈیا پریوار کی ادبی میگزین ’’بزم سہارا‘‘ کے شعبہ ادارت سے بھی وابستہ رہے۔ان دنوں یک موضوعی مجلّہ ’’انداز بیاں‘‘ کی ادارت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

حقانی القاسمی کی تحریریں ہند اور بیرون ہند کے مجلّات میں اہتمام سے شائع کی جاتی ہیں اور بہت سے مضامین کا انگریزی، پنجابی، کشمیری، ہندی زبانوں میں ترجمہ ہوچکا ہے۔

برحق سہی مگر مصنف کے طرز استدلال کی اثر انگیزی، طرز فکر کی صحیح الجہتی اور طرز ادا کی جادو نگاری نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔''
پروفیسر گوپی چند نارنگ تو 2002 میں ہی کہہ چکے تھے کہ ''شمیم طارق ایک وسیع المطالعہ شخص ہیں اور ان کی تصنیف ''غالب اور ہماری تحریک آزادی'' اہم اور بحث انگیز تصنیف ہے جو غالبیات میں بحث کے نئے دروازے کھولتی ہے۔'' مجھے یہ کہنے یا اعتراف کرنے میں جھجھک نہیں کہ جتنے متنوع موضوعات پر دلکش انداز میں شمیم طارق نے مضامین اور کتابیں لکھی ہیں ان کے کسی ہم عصر نے نہیں لکھی ہیں۔ ان کے پیش رو ادیبوں اور اہل قلم نے ان کی ستائش بھی خوب کی ہے۔ ❁

بھارت میں اُردو کتب کے ناشرین۔اور بک سیلرز کے رابطے

Maktaba Jamia Limited
Urdu Bazar, Jama Masjid,
Delhi - 110006

Midland Book Shop
G-8, Basement, South Extension - 1,
New Delhi – 110049

Modern Publishing House
9 - Gola Market, Darya Ganj,
New Delhi – 110002

M.M.I. Publishers
D-307, Dawat Nagar, Abul Fazal Enclave,
Jamia Nagar, New Delhi - 110025
Phone: 072900 92401

M.M.I. Publishers
Urdu Bazar, Jama Masjid
Delhi - 110006

M. R. Publications
2724-25, 1st Floor,
Kucha Chelan, Darya Ganj,
New Delhi - 110002

National Council For Promotion of Urdu Language,
West Block - 8, Wing - 7, R.K. Puram,
New Delhi – 110066
Phone No. 011-26109746

Seemant Prakashan
922, Kucha Rohella, Darya Ganj,
New Delhi - 110002 (Closed)

Takhleeqkar Publishers
104/B, Yawar Manzil,
Block - I, Laxmi Nagar,
Delhi – 110092
Mobile No. 9811612373

Ghalib Academy
Basti Hazrat Nizamuddin,
New Delhi - 110013

Idara Faisal
2649, Kucha Chelan,
Kalan Mahal, Daryaganj,
New Delhi - 110002
Phone: 096255 23987

Islamic Book Service
2241, Kucha Chelan,
Daryaganj,
New Delhi - 110002
Phone No. 011-23253514

Jaseem Book Depot
401, Matia Mahal Rd,
Jama Masjid,
Delhi - 110006
Mobile No. 9810737865

Kitab Wala
2794, Gali Jhot Wali,
Pahari Bhojla,
Near Anjuman Masjid,
Delhi - 110006
Mobile No. 9810277298

Kitabi Duniya
2264, Zahoori Handicraft Market, ,
Turkman Gate,
Delhi 110006

Kutub Khana Anjuman Taraqqi Urdu
Urdu Bazar, Jama Masjid,
Delhi - 110006
Kutub Khana Azizia
Urdu Bazar, Jama Masjid,
Delhi – 110006

Kutub Khana Rahimia
Urdu Bazar, Jama Masjid,
Delhi - 110006

Aakif Book Depot
3243 - Kucha Tara Chand,
Darya Ganj, New Delhi - 110002

Al Hasanat Books Pvt. Ltd.
3004/2, Sir Syed Ahmed Road,
Kucha Chalan, Khabas Pura,
Daryaganj, New Delhi-110002
Phone: 011 2324 1934

Aijaz Publishing House
2861, Kucha Chelan,
Daryaganj,
New Delhi - 110002
Mobile No. 8700326374

Arshia Publications
A-170, Ground Floor - 3,
Surya Apartment,
Delhi - 110095
Mobile No. 9971775969

Ateqad Publishing House
3095, Sir Syed Ahmed Road,
Kucha Alam, Khabas Pura,
Daryaganj, New Delhi - 110002

Delhi Urdu Academy
CPO building, Near Ritz Cinema,
Kashmere Gate, Delhi-110006
Phone: 011 2386 3566

Educational Publishing House
D1/16, Ansari Rd, Daryaganj,
New Delhi - 110002
Phone No. 011 4141 8204

Farid Book Depot
422, Matia Mahal,
Jama Masjid,
Delhi – 110006

Farid Book Depot
M.P. Street, Pataudi House,
Darya Ganj,
New Delhi - 110002

Ghalib Institute
Mata Sundri Road,
New Delhi - 110002

اہم شخصیتوں کی پسندیدہ کتابیں

مقدمہ ابن خلدون۔ اختر عباس صاحب کی پسندیدہ

جائزہ اور انٹرویو: رانا محمد شاہد، بوریوالہ

یہ سچ ہے کہ آج کی نسل کتاب سے دور ہو چکی ہے۔ کتاب سے ہماری محبت کا یہ عالم ہے کہ آج کتابیں فٹ پاتھ پر جبکہ جوتے شیشے کی الماریوں میں بند ہیں۔ اشفاق احمد کا ایک جملہ کہیں پڑھا تھا۔"اس قوم کو علم وحکمت کی کیا قدر جو مہنگا جوتا خریدنے میں فخر جبکہ سستی کتاب لینے میں دقت محسوس کرے۔ ایسا کیوں نہ سمجھا جائے کہ اس قوم کو کتابوں سے زیادہ جوتوں کی ضرورت ہے"۔

لکھے ہوئے لفظوں کی خوشبو خط، کتاب اور عید کارڈ واٹس ایپ اور پی ڈی ایف کا بدل نہیں ہو سکتی۔

مجھے دو، چار ہفتوں کے بعد کسی پبلشر یا مصنف کی طرف سے نئی کتاب موصول ہوتی ہے تو ناقابل بیان خوشی ہوتی ہے۔ ٹیکنالوجی کے اس دور میں جب لوگوں کی اکثریت کا کتاب اور لکھنے، پڑھنے سے عمومی بیزاری کا رجحان ہے۔ کچھ سر پھرے کتاب زندہ رکھنے کے لیے کوشاں ہیں۔

کتاب زندگی کی طرح ہوتی ہے۔ جس میں ہم انسان کے ذاتی، سماجی روحانی اور عملی تجربات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ہر انسان زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف تجربات سے گزرتا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہم محض الفاظ نہیں دیکھ رہے ہوتے بلکہ ایک وسیع و عریض دنیا میں قدم رکھ رہے ہوتے ہیں۔ خیالات و مشاہدات کی یہ وسعت ہمیں نئے جہانوں سے روشناس کراتی ہے۔ کتاب ہمیں مختلف ادوار، ثقافتوں اور معاشرتوں کے بارے میں جاننے کا موقع دیتی ہے۔

دوسروں کے تجربات سے سیکھنے کا بہترین ذریعہ مطالعہ اور کتاب ہے۔ لوگوں کی سوانح عمریاں پڑھیں۔ جن میں انہوں نے اپنی زندگی کے تجربات و مشاہدات بیان کیے۔ یہ تجربات دراصل زندگی کا نچوڑ

جمیل احمد عدیل کی محبوب کتاب 'میرداد'

ہیں۔ مطالعہ کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم ایک موضوع پہ مختلف مصنفین کو پڑھتے ہیں تو گویا ہر ایک زندگی کا مختلف رنگ دکھا رہا ہوتا ہے۔

ایک کتاب کا بار بار مطالعہ بھی آپ کو نئی باتوں اور نئے فوائد سے روشناس کراتا ہے۔ امام شافعی کے شاگرد امام مزنی نے اپنے استاد کی ایک کتاب کا پچاس برس تک مطالعہ کیا۔ لکھتے ہیں۔"ہر مرتبہ کے مطالعے میں مجھے نئے نئے فوائد حاصل ہوئے"۔ حکیم جالینوس سے کسی نے پوچھا۔"آپ اپنے ساتھیوں سے علم وحکمت میں کیسے نمایاں ہو گئے؟"۔ انہوں نے جواب دیا۔"میں نے کتابیں پڑھنے کے لیے چراغ کے تیل پر اس سے زیادہ خرچ کیا، جتنا لوگ کھانے پینے پر خرچ کرتے ہیں"۔ امام رازی کو افسوس ہوتا تھا کہ کھانے کا وقت مطالعہ کے بغیر گزرتا ہے۔ حضرت رشید احمد گنگوہی مطالعہ میں اس درجہ محو رہتے کہ پاس رکھا کھانا کوئی اٹھا کر لے جاتا تو آپ کو خبر تک

اختر عباس صاحب کی چھوٹی بیٹی نے چند ماہ میں 12 ہزار روپے کی کتابیں آن لائن منگوائیں

نہ ہوتی۔ جمال الدین قفطی کا مطالعہ سے عشق اتنا بڑھا کہ شادی کرانے سے انکار کر دیا کہ خاندان کا جھنجھٹ اس عشق کو متاثر کرے گا۔ مولانا منہاج الدین زمانہ طالب علمی میں لاہور سے دہلی گئے۔ پاس کچھ نہ تھا۔ چنانچہ دکانداروں کے کام کر کے ان سے آٹا اور گھی لے لیا کرتے تھے۔ رات کو آٹے کا چراغ بنا کر اس میں گھی ڈالتے۔ یوں اس چراغ کی روشنی میں رات بھر مطالعہ کرتے۔ دن نکلتا تو اس آٹے کی روٹی بنا کر کھا لیتے اور اس پر قناعت کرتے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو اتنی شہرت ملی کہ سلطان بہلول لودھی کے دور میں دہلی کے مفتی مقرر ہوئے۔ اپنی بات بتاوں تو مجھے جوتوں کپڑوں میں اتنی دلچسپی نہیں۔ اس کے باوجود ایک عید پر بہاولپور والے بھائی نیا

مشتاق یوسفی کو جتنی بار پڑھا نیا لطف ملا۔ رضی الدین رضی

سوٹ اور جوتا ضرور بھیجتے ہیں۔ میں نے انہیں کئی بار کہا کہ مجھے کپڑے پہننے سے دلچسپی نہیں، کتاب پڑھنے سے ہے۔ یعنی پہننے

خالد جاوید۔ انور گریوال۔ رضی الدین رضی۔ اختر عباس

سے نہیں پڑھنے سے دلچسپی ہے مگر وہ کہتے ہیں کہ کتاب تم خرید لو گے، کپڑے دلانا ضروری اور ہماری مجبوری ہے۔آج کتابیں مہنگی ضرور ہیں مگر اس کے باوجود یہ کپڑوں، جوتوں اور ہوٹل کے ایک وقت کے کھانے سے سستی ہیں۔یاد رہے،آپ کی خریدی ہوئی کتاب آپ کو ہی نہیں،آپ کی نسلوں کو بھی فائدہ دیتی ہے۔آپ بازار سے جوتا خریدتے ہیں تو یہ صرف آپ پہن سکتے ہیں۔آپ کے گھر کا کوئی دوسرا فرد نہیں پہن سکتا۔جبکہ کتاب گھر کے سبھی افراد پڑھ سکتے ہیں۔آپ کے جوتوں اور کپڑوں کی الماری ختم ہوسکتی ہے مگر کتابیں نہیں۔یہ عمر بھر آپ کا ساتھ دیتی ہیں۔

کتاب اور لائبریری کی ضرورت واہمیت کے حوالے سے ملک کی ممتاز ادبی شخصیات سے کچھ سوالات کیے تھے، جوابات پیش خدمت ہیں۔

:1 کسی کتاب کی کوئی ایسی بات، جملہ یا پیراگراف جس نے زندگی کی پریشانی کو کم کیا ہو یا بہت اطمینان اور خوشی کا باعث بنا ہو؟۔

:2 لکھنے کا عمل کیا ہوتا ہے، وہی جانتا ہے جو لکھتا ہے۔لکھنے کے عمل کے دوران کسی کتاب نے آپ کی سمت متعین کی ہو؟۔

:3 پرانی کتابیں، پرانی تصویریں اور پرانے مناظر۔۔۔۔یہ ہمیشہ آواز دیتے اور اپنے پاس بلاتے ہیں۔کوئی ایسی پرانی کتاب جو آج بھی یاد آتی ہو اور آپ کو آواز دیتی ہو؟۔

نسیم حجازی نے میری ذات پر گہرے اثرات چھوڑے۔خالد جاوید، کالم نگار

4: آپ لائبریری جاتے ہیں۔آخری بار لائبریری کب گئے تھے؟۔

اختر عباس (ادیب، لائف کوچ)

1: مقدمہ ابن خلدون ان کتابوں میں سے ایک ہے جسے میں نے فیروزسنز سے کئی دہائی پہلے خریدا۔

مقدمہ ابن خلدون کو تاریخ، فلسفہ، اور سماجی علوم کا ایک عظیم الشان کام سمجھا جاتا ہے۔ابن خلدون نے اس میں تاریخ کو ایک سائنسی نقطہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔انہوں نے مختلف تہذیبوں کے عروج وزوال کا تجزیہ کیا اور اس کی وجوہات بیان کیں: ابن خلدون نے عمرانیات کا ایک جامع نظریہ پیش کیا۔انہوں نے بتایا کہ معاشرے کیسے قائم ہوتے ہیں، کس طرح ترقی کرتے ہیں اور کیسے زوال پذیر ہوتے ہیں۔ ابن خلدون نے مختلف تمدنوں کے ارتقاء کا تجزیہ کیا اور بتایا کہ ایک تمدن کیسے دوسرے تمدن سے متاثر ہوتا ہے۔ 2.انہوں نے حکومت اور معیشت کے درمیان تعلق کو واضح کیا اور بتایا کہ ایک مضبوط حکومت کے لیے ایک مضبوط معیشت کی اہمیت کیا ہے۔* 3.: ابن خلدون نے عرب قبیلوں کے کردار کو اسلامی تاریخ میں بہت اہمیت دی ہے۔انہوں نے بتایا کہ عرب قبیلوں نے اسلامی ریاست کی تشکیل میں کیسے کردار ادا کیا۔ 4.: ابن خلدون نے تاریخ کو ایک مسلسل عمل کے طور پر دیکھا اور اس بات پر زور دیا کہ تاریخی واقعات ایک دوسرے سے متصل ہوتے ہیں۔ 5.عالمی شہرت: یہ کتاب صرف اسلامی دنیا میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں پڑھی اور مطالعہ کی جاتی ہے۔اس بات نے مجھے ہمیشہ خوشی دی۔۔

مقدمہ ابن خلدون ایک ایسی کتاب ہے جس نے تاریخ کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا طریقہ فراہم کیا۔

دائیں سے تجمل شاہ۔جمیل احمد عدیل۔غزالہ انجم

۔ہم اکثر کتابوں کو ان کی روح کو سمجھے بنا بھی پڑھ جاتے ہیں۔۔اسی طرح میں تاریخ کی کتاب الفخری کو بہت مس کرتا ہوں۔۔مسلم حکمرانوں کے عروج وزوال کی خوفناک داستان ہے۔

2: لکھنے کا عمل کوئی انوکھا یا پراسرار عمل نہیں ہے۔یہ بنیادی طور پر لکھنے والے کا فکری اظہار ہے۔وہ جن چیزوں کو دیکھتا، پڑھتا، سنتا اور سوچتا آیا ہے۔ایک وقت آتا ہے، جب اس کا اندر ایک پیکج کی شکل میں ڈھل جاتا ہے اور آپ کو ایک طرح سے خوشی عطا کرنے لگتا ہے۔جب آپ لکھتے ہیں تو آپ کو اپنا لکھا کئی پہلوؤں سے نہ صرف ایک تازگی دیتا ہے بلکہ جو آپ نے پہلے پڑھا ہوتا ہے، اس کا اظہار یہ بھی ہوتا ہے۔ایک اچھی سوچ اور اچھی تحریر کا بہت عمدہ پھل جو ملتا ہے، وہ یہ کہ آپ کے علاوہ باقی لوگ بھی اس کا مزہ لیتے ہیں۔اس لیے جو لوگ لکھنے میں بہت محنت نہیں کر پاتے یا ان کے لکھے ہوئے میں کوئی گہرائی نہیں ہوتی۔اگر وہ گلہ کریں کہ ان کی لکھی چیز لوگ نہیں پڑھتے تو ان کا گلہ بے جا ہوتا ہے۔جس تحریر میں بھی دم ہوگا، لوگ اسے شوق سے، محبت سے پڑھتے ہیں اور وہ تحریر زندہ رہتی ہے۔ہم نے تو ایسی بے شمار کتابیں پڑھی ہیں۔جو سات، آٹھ سو سال پرانی ہیں مگر پھر بھی ان میں دم ہے۔ایسے ہی اس عہد میں جو اچھی کتابیں لکھی جائیں گی۔آنے والے برسوں میں وہ بھی زندہ رہیں گی۔۔انشاءاللہ

3: ایسی کئی کتابیں ہیں۔جو مجھے یاد آتی ہیں، آواز دیتی ہیں۔جمیلہ ہاشمی کی کتابیں"دشت سوز"تھی۔"تلاش بہاراں"بھی ان کی ایک شاندار کتاب تھی۔اسی طرح رحیم گل کی"جنت کی تلاش"اپنی بھری جوانی میں مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔اور شہاب صاحب کا ظاہر ہے"شہاب نامہ"۔اشفاق صاحب کا اب زاویہ بہت اچھا لگتا ہے اور جب ہم نے ان کو پڑھنا شروع کیا تو لوگوں نے ان کا صرف"گڈریا" پڑھا۔مجھے موقع ملا، میں نے ان کی بہت ساری چیزیں پڑھیں۔مجھے ان کا"کھیل تماشا"جو آپ بیتی بھی ہے اور ناول بھی۔وہ

قرآن پاک کا ترجمہ پڑھنے سے جہانوں سے آشنائی ہوئی ہے۔تجمل شاہ

بہت اچھا لگا۔بانو آپا کی کتابیں، ہمیشہ جو بھی مل جائیں۔آدھی بات ہو یا ان کے بہت پرانے ناولٹ لائیک پروا، وہ اب بہت زیادہ ہانٹ نہیں کرتے۔لیکن جو باقی کتابیں ہیں۔وہ بہت۔مسمرائز بھی کرتی ہیں۔اسی طور پر ممتاز مفتی صاحب کا ایک افسانہ تھا"سمے کا بندھن"۔وہ مجھے کبھی نہیں بھولتا۔اسی طور پر ایک افسانہ تھا مستنصر حسین تارڑ صاحب کا۔۔۔"دیوار پہ لگی تصویر"شاید یہ نام تھا اس کا۔یہ ایک لڑکی کی کہانی تھی اور کلاس کی تھی۔

4: جب تک میں کالج میں رہا تو لائبریری ریگولر جاتا تھا اس وقت بہاولپور میں تھا، وہاں سینٹرل لائبریری بہت جاتا تھا۔وہیں میں نے بڑے بڑے رائٹرز کی کتابیں لیں، ان کو پسند کیا اور وہیں ناپسند کیا مطلب واجدہ تبسم اور عصمت چغتائی مجھے کبھی پسند نہیں آئیں۔یعنی بعض تحریروں کے نتائج کراہت والے ہوتے ہیں۔ظاہر ہے وہ ہماری اقدار سے ٹکراتے ہیں۔ان کو ایسی تحریریں لکھنا اچھا لگتا ہوگا۔لیکن اس میں سوچ اور سماج کے ضوابط پر شدید ضرب لگتی ہے۔اس کا فائدہ کوئی نہیں ہوتا۔نقصان زیادہ ہوتا ہے۔اس کے بعد پھر میں نے اپنی لائبریری بنائی۔اب ماشاءاللہ میری اپنی

لائبریری میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کتابیں ہیں۔ میں روز اس میں بیٹھتا ہوں۔ لیکن اب ذرا پڑھنے کا وقت کم ملتا ہے اور ان پہ میں بہت محبت سے، اپنے بچوں کی طرح نظر ڈالتا ہوں۔ کبھی ان پر ڈسٹ پڑی ہو تو وہ اتارتا ہوں۔ پھر کوئی کتابیں دو، چار نکال کے اپنے ٹیبل پر رکھتا ہوں کہ ان کو پڑھوں گا۔ لیکن اب اس رغبت سے پڑھا نہیں جاتا۔ اچھا لیکن کتابیں جمع کرنے کا اور خریدنے کا شوق کم نہیں ہوا۔ بیچ میں کئی سالوں سے میں انگریزی کتابیں زیادہ خرید رہا ہوں۔ اردو والی نسبتاً کم خریدتا ہوں۔ میری چھوٹی بیٹی کل بتا رہی تھی کہ اس نے پچھلے چند ماہ میں بارہ ہزار کی کتابیں آن لائن منگوائی ہیں۔ یہ انگریزی ناول تھے اور جو اس کی پسند کی چیزیں تھیں۔ میں نے اسے کبھی منع نہیں کیا۔ اس کو اردو ناول یا تحریریں پڑھتے نہیں دیکھا۔ وہ انگریزی والی چیزیں پڑھتی ہے۔ کتابوں کا یہ چسکا اسے ایک انگریزی سیریز سے لگا۔ میں نے اسے ”چکن سوپ فار سول“ نامی سیریز گفٹ کی، جو اسے بہت پسند آئی۔ پھر اس سے سیر کے دوران مزے سے کہانی سنتا۔ بچوں کی چونکہ ہم نے کبھی رہنمائی نہیں کی۔ ان کی دلچسپی کی چیزیں انہیں نہیں دیتے تو پھر ان کے اندر رغبت پیدا نہیں ہوتی۔

کتاب کی اہمیت کبھی کم نہیں ہوتی، نہ ہوئی ہے۔ ایک اور بات یاد رکھیے گا کہ اگر کچھ لوگ نہیں پڑھ رہے تو بہت سے لوگ پڑھ رہے ہوتے ہیں۔ نہ پبلشر کم ہوئے ہیں، نہ پبلشنگ ہاوس بند ہوئے ہیں۔ پہلے سے وہ زیادہ چھاپ رہے ہیں۔ یہ بک فیئر جو ایکسپو کراچی، لاہور، اسلام آباد میں ہوتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہاں لاکھوں کی کتابیں بکتی ہیں۔ ہزاروں بچے، خواتین خرید کر لے جاتے ہیں ہم چونکہ ایک تو مردہ پرست ہیں، ماضی پرست ہیں۔ ہمیں الٹی سیدھی بات پہ زیادہ یقین آتا ہے۔ ہم خراب بات کر کے خوش ہوتے ہیں یا مزہ لیتے ہیں۔ اصل چیز ہمارا یقین، ہمارا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ابھی کتاب کے بارے میں الٹی سیدھی باتیں ہم روز سنتے ہیں۔ یہ کمپیوٹر موبائل جتنا مرضی ہو جائے، کتاب کی اہمیت رہے گی۔ لوگ رشتوں کے بنا رہنا شروع ہو جائیں تو کیا رشتوں کی اہمیت ختم ہو جائے گی۔ رشتے پھر بھی رہتے ہیں۔ ان کی حلال اولادیں بھی اہم رہتی ہیں اور زندگی سے بونڈنگ اور بائنڈنگ بھی اسی طور پر جاری رہتی ہے۔

جمیل احمد عدیل (محقق، کالم نگار)

1: اگرچہ اس ضمن میں کسی ایک کتاب/ عبارت فقرے یا جملے کو نشان زد کرنا قدرے دشوار ہوگا کہ عمر کے ہر حصے کے الجھاوے الگ ہوتے ہیں۔ تاہم اب سے کوئی دو دہائیاں قبل فکری سطح کے کچھ قضایا درپیش ہوئے، یوں الٰہیات کی تفہیم نو پہلے درجے میں آ گئی۔ وہ مسئلہ وہی تھا، جسے، مسئلہ تقدیر، کے عنوان سے دنیا جانتی ہے۔ یہ معما کھلتا نہیں تھا اور ہر سوال دس سوالات کی ردا میں لپٹ کر نئی

غزالہ انجم کی پسند
کلیات اقبال اور زاویہ

صورت حال سامنے لے آتا تھا۔ یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے، جب ایک سوچنے والا الحاد کی وادی میں اترنے کے امکانات کو آس پاس موجود پاتا ہے۔ اس پس منظر میں اصل قضیہ یہ تھا کہ کوئی بیلیور، دعا، کے عمل کو کیسے سمجھے؟ کہیں سے ایک کتاب ہاتھ لگ گئی۔ نام تھا اس کا، کتاب میرداد، مصنف ہیں میخائل نعیمی۔ اس تصنیف سے یہاں صرف دو چار سطور نقل کی جاتی ہیں:

'' اگر اپنی ربوبیت کا بیج تمہیں دینے کے بعد تمہارے بجائے تمہارے رب نے آپ ہی اس بیج کی پرورش کرنی ہوتی تو تم میں کیا صلاحیت ہوتی اور پھر تمہاری زندگی میں تمہارے لائق کام ہی کیا رہ جاتا؟ اگر تمہارے کرنے کے لیے کچھ بھی باقی نہیں رہ جاتا اور کچھ کرنا تھا اور وہ خدا ہی کو تمہاری خاطر کرنا تھا تو تمہاری زندگی کا مقصد ہی کیا ہوتا؟ تمہاری دعا سے کیا ہاتھ آتا؟ اپنی بے شمار امیدیں اور فکر خدا کے سامنے نہ رکھو، جن دروازوں کی چابیاں اس نے تمہارے سپرد کر رکھی ہیں، وہ دروازے کھولنے کے لیے اس کی منتیں نہ کرو، کیوں کہ دل کی وسعت میں ہر وہ اچھی یا بری شے موجود ہے جس کی بھوک اور پیاس تمہیں محسوس ہوتی ہے۔

2: لکھنے کا عمل ایک بھید ہے، اس لیے کہ ہر لکھنے والے کا تجربہ انفرادیت کا حامل ہوا کرتا ہے۔ دو مصنفین ایک جیسی کیفیت سے نہیں گزر سکتے۔ اگرچہ وہ بادی النظر میں ایک ایسے، میکانکی عمل، میں محو دکھائی دیں گے، جیسے امتحانی کمرے میں دو طالب علم مشابہت

محمد انور گریوال کا غم
''بسلامت روی'' نے غلط کیا

والی نشست و برخاست میں پرچہ حل کرتے ہوئے نظر آئیں گے۔
ذاتی طور پر میرے لکھنے کا عمل شاید زیادہ پیچیدگی لیے ہوئے ہے۔ بعض اوقات ایک صفحے کی تحریر قلمبند کرنے کی خاطر مجھے اپنا ذہن بناتے ہوئے ایک ہفتہ گزر جاتا ہے۔ کچھ اس 'ڈیجیٹل ایرا' نے بھی مسائل پیدا کیے ہیں۔ میری عمر کے لوگوں کی اکثریت 'مینوئل رائیٹنگ' کی عادی ہے۔ ادھر سیلولر فون نے کی پیڈ نکال کر انگشت شہادت کی پور کو ٹائپنگ پہ لگا دیا ہے۔ یوں مختصر نویسی اس میں محدود ہو گئی۔ باقاعدہ لکھنے کے لیے کاغذ پنسل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ یہ، پیرا ڈائم شفٹ، اپنی جگہ تقسیم کا سبب بنی۔ دونوں کا ایکدم اجنبی ہو جانا مجھ پہ بیتا ہے۔ بہر طور عام تحریر پھر بھی ذرا جلد کام سمیٹ لیتی ہے مگر تخلیقی نگارش مہینوں کو محیط عمل کہیے۔ باقی رہا کتاب کا سمت نما ہونا تو یہ دو طرح سے ہوتا ہے: ایک تو یہ کہ آپ اپنی مرضی سے پڑھ رہے ہیں۔ جب کچھ لکھنے کا ارادہ ہوا تو پڑھی ہوئی کتاب سے کوئی اقتباس حوالہ بنانا ہے تو اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ معاون کتب خود مہیا کی جائیں۔ میں تو اپنے موضوع سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتابی مواد کی فراہمی کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔

3: میرے ہاں اکثر گزران خاص کشش کی حامل رہی۔ پرانی کتابیں تو قلب و ذہن میں اپنے نقوش مرتسم کر چکی ہیں۔ انھیں مسلسل سوچتے رہنے سے ان کے متون از بر ہو چکے۔ ایک کتاب جو کئی دہائیاں پہلے پڑھی تھی، وہ تقریباً' زبانی یاد ہو چکی لیکن دو چار سال کے بعد اسے پھر پڑھنا شروع کر دیتا ہوں اور وہ کتاب ہے: ، قید یاغستان، ! اس کے مصنف محمد اکرم صدیقی۔ مہم جوئی ایسی کہ قاری کو دفعتہً' جذب کر لیتی ہے۔ اسے بار بار پڑھا۔

4: اگر میرے لیے کسی عمارت میں رومان ہے تو وہ لائبریری کی بلڈنگ ہے۔ یہ رومان یوں زیادہ زندہ اور پرتاثیر ثابت ہوا کہ کتابوں سے شدید عشق کے باوجود کم بلکہ بہت ہی کم لائبریری جاتا ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ لائبریری میں زیادہ سے زیادہ کتب دستیاب ہو سکتی ہیں لیکن میں نے سدا کوشش کی کہ اس باب میں، اشتراکیت، کی بجائے، سرمایا داری، کو اپنایا جائے۔ یوں اپنی ہر پسندیدہ کتاب ترجیحی بنیادوں پر خود خریدنے کی سعی کی۔ نتیجہ معلوم اپنے گھر میں مناسب سی لائبریری بنائے رکھی۔ جن کالجوں میں ملازمت کرتا رہا ہوں، وہاں کی لائبریری سے شاید و باید ہی کبھی کتاب جاری کرائی ہو! تاہم لاہور شہر میں کئی لائبریریاں ہیں۔ کبھی کبھار کتابوں سے معمور ماحول میں جا کر، کچھ وقت گزار کر تسکین حاصل کر لیتا ہوں۔

رضی الدین رضی (صحافی، کالم نگار)

میں نے سکول کے زمانے میں ابن انشاء کو پڑھا اردو کی آخری کتاب نے مجھے اس زمانے میں جو خوشی دی میں اسے فراموش نہیں کر سکتا بعد کے دنوں میں میں مسرت حاصل کرنے کے لیے مشتاق یوسفی کو پڑھتا ہوں اور ان کا کوئی بھی مضمون جتنی بار بھی پڑھا جائے

ہمیشہ نیا لطف اور نئی مسرت دیتا ہے۔

لکھنے کے عمل میں کتابیں ہماری بس یہ سمت متعین کرتی ہیں کہ ہم نے جو مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت ہماری تحریروں سے منعکس ہوتا ہے ہاں البتہ حوالہ جات کے لیے ہمیں کتابوں کی مدد لینا پڑتی ہے اس کے بغیر آپ کی بات کو سند نہیں ملتی۔

پرانی کتابوں کا تو ایک انبار ہے میرے پاس پرانے اخبارات پرانے رسائل اور پرانے مخطوطے یہ سب کچھ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے کچھ کتابیں جو میں پڑھ چکا ہوں اور یہ چاہتا ہوں کہ وہ اب کسی اور کے کام آئیں انہیں میں زکریا یونیورسٹی کے حوالے کر چکا ہوں اور کچھ پرانی کتابوں کی آن لائن فروخت کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔

اخبار کے ساتھ میں نے طویل عرصہ تک ربط رکھا جب میں جنگ اور نوائے وقت میں کام کرتا تھا تو میرے پاس تمام اخبارات کی فائلیں آتی تھیں اور میں علی الصبح ان تمام اخبارات کا مطالعہ کرتا تھا۔ پھر میں نے اپنے گھر پر ایک اردو اور ایک انگریزی اخبار منگوانا شروع کر دیا لیکن کچھ عرصہ بعد احساس ہوا کہ اردو اخبارات میں پڑھنے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا۔ اب میں ہر اتوار کو ڈان اخبار لیتا ہوں اور وہ تمام ہفتہ میرے مطالعے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

خالد جاوید (کالم نگار، استاد)

نسیم حجازی پہلا مصنف تھا۔ جسے میں نے اپنے بچپن میں ہی پڑھ لیا تھا اور اس نے میری ذات پر اتنے گہرے اثرات چھوڑے کہ میں نوجوانی کی عمر میں ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ ادھیڑ عمری کے عالم میں ممتاز مفتی کی علی پور کا ایلی پڑھی تو افسوس ہوا کہ اوائل عمری میں ہی یہ کتاب کیوں نہ پڑھی۔ اگر اوائل عمری میں مفتی کو پڑھ لیتا تو زمانہ شباب یقینا اس قدر روکھا پھیکا نہ گزرتا۔ قصہ مختصر نسیم حجازی کی تحریروں نے زندگی پر گہرے اثرات چھوڑے اور اپنے آپ کو اس کے پیش کردہ ہیرو کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرتے رہے اور ممتاز مفتی نے زندگی کے مسائل کے ساتھ نمٹنے کا حوصلہ دیا

پڑھنے کے بعد اگلا مرحلہ لکھنا ہے۔ لکھ وہی سکتا ہے جس نے پڑھا بھی ہو۔ جو بھی تحریر آپ پڑھتے ہیں یا تو آپ اس سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ جن چیزوں سے آپ اتفاق کر لیتے ہیں۔ پھر انہی چیزوں کو اپنی تحریروں میں نمایاں مقام دیتے ہیں۔ پڑھ آپ کتاب بھی سکتے ہیں اور لوگوں کو بھی پڑھ سکتے ہیں۔

کسی ڈائجسٹ میں ایک سلسلہ وار کہانی 'اکا بلا' تھی غالبا۔ یہی نام تھا اس کا، آج بھی اپنی طرف بلاتی ہے۔

4: لائبریریوں میں بڑی باقاعدگی سے جایا کرتا تھا۔ بورے والا کی پبلک لائبریری ہو، کالج کی لائبریری ہو یا ایم سی ہائی سکول کی لائبریری ہو۔ سبھی کا نادھندہ ہوں آج بھی۔ لیکن آج کل لائبریری میں شاذ و نادر ہی جانا ہوتا ہے۔ پبلک لائبریری میں غالباً دو سال پہلے گیا تھا۔

(تجمل شاہ، مدیر "اخبار اردو"، ادارہ فروغ قومی زبان)

کتاب حکمت وہ واحد کتاب ہے جس کے ایڈیشنوں کی اشاعت کا ریکارڈ کوئی کتاب پوری نہیں کر سکتی اب تک کھربوں کی تعداد میں شائع ہوئی اور ہو رہی۔ قرآن مجید فرقان حمید وہ واحد کتاب ہے جو دنیا بھر میں صبح۔ دوپہر شام پڑھی جاتی اور اس کا ڈیٹا کبھی ضائع یا ہیک (اغوا) یا چوری نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ مواد اللہ تعالیٰ نے لوح محفوظ میں سنبھال رکھا ہے اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی رب کریم نے خود ہی لیا۔ راہ حق کی یہ واحد کتاب جو حضور ﷺ کی ذات گرامی کی وساطت سے ہم تک پہنچی۔ اسے با ترجمہ پڑھنے سے کئی غیر مسلم دانش ور بھی راہ راست پہ آئے، اور اللہ کریم کی واحدانیت اور بہتر زندگی بسر کرنے ترقی کرنے ذریعہ معاش۔ ثقافت۔ رہن سہن کے ڈھب سے آشنا ہوئے۔ قرآن مجید فرقان حمید سے سائنس دانوں اور زندگی کے دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والوں نے علم و ہنر سیکھا۔ قرآن مجید کے با ترجمہ پڑھنے سے میں نہ صرف متاثر ہوا بلکہ کائنات در کائنات ستاروں سے آگے اور جہانوں کے بارے آپ کو آشنائی ہوتی جاتی ہے۔ قلم اور کتاب کی اہمیت ہر دور میں رہی۔ حضرت موسی علیہ السلام۔ حضرت دؤاد علیہ السلام۔ حضرت عیسی علیہ السلام پر بھی کتابیں اور صحیفے اترے اللہ کریم نے قوموں کو زندگی بسر کرنے اور رہنمائی کے ڈھنگ سکھائے مگر اس کا انحصار آپ پہ ہے کہ اس سے پہلے کہ ہم دیر کر دیں اس آخری کتاب کو پڑھیں اور غور کریں کہ رب تعالیٰ کی کائنات کتنی وسیع اور کتنی بڑی ہے اور اتنی بڑی کائنات اللہ کریم کے کن فیکون کی محتاج ہے۔

'جہان دانش'
ڈاکٹر عارف حسین کی پسند

سلیم فرخی کو سلطان بشیر محمود کی کتابیں پسند ہیں

محترمہ غزالہ انجم، کالم نگار، شاعرہ

کلیات اقبال اور 'زاویہ' وہ دو کتابیں ہیں جن کو پڑھ کر ہمیشہ کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا۔ اطمینان یا خوشی۔

لکھنے کا عمل دراصل جذبات کے تحت ہوتا ہے بقول بانو قدسیہ یہ عمل ایسے ہے جیسے کیتلی میں ابلتا پانی۔۔۔۔ اگر ڈھکن بند کر دیا جائے دباو بڑھتا چلا جائے گا۔ اس دوران میں قلم چلتا رہے تو بہتر ہوتا ہے۔ مختلف کتابیں اور ان کے جملے یا مصرعے انسان کو متاثر کرتے ہیں۔

بانو قدسیہ کی راجہ گدھ۔ ممتاز مفتی کی لبیک اور قدرت اللہ شہاب کی شہاب نامہ۔

کالج میں لائبریری اکثر جاتے رہتے ہیں۔

محمد انور گریوال، کالم نگار

جب ایم اے کرنے کے بعد پبلک سروس کمیشن کا تحریری امتحان پاس کر لیا اور انٹرویو کے نتیجے کا انتظار تھا۔۔۔ ناکامی کی صورت میں بہت دل شکستہ ہوا۔۔۔ ان دنوں کرنل محمد خان کی "بسلامت روی" زیر مطالعہ تھی۔۔۔ غم غلط کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔

مختار مسعود کی کتاب "سفر نصیب"

میں دیہاتی طالب علم تھا۔۔ فرسٹ ایئر میں کنہیا لال کپور کی کتاب کالج لائبریری سے ایشو کروائی تھی۔۔۔ اس کا لمس اب تک محسوس کرتا ہوں۔

تبصروں وغیرہ کے لیے میرے پاس کتابیں اپنی باری کی منتظر رہتی ہیں۔۔۔ میرے آس پاس لائبریری والا ماحول ہی رہتا ہے۔

ڈاکٹر عارف حسین عارف (شاعر، پبلشر)

1: جہان دانش از احسان دانش

جب درجہ چہارم پاس کیا تو گھر میں کوئی پیتل کا برتن نہیں رہ گیا تھا جسے بیچ کر ماں پنجم میں داخلہ دلواتی لہٰذا سکول چھوڑ دیا اور مزدوری پہ چلا گیا۔

مظہر الاسلام کی کتاب باتوں کی بارش میں بھیگتی لڑکی پڑھی تو اس جیسا اسلوب اختیار کرنے کو جی چاہا۔

یادوں کی بارات از جوش ملیح آبادی

اخبار تو نہیں پڑھتا البتہ لائبریری ضرور جاتا ہوں۔۔۔۔۔ کل بھی گیا تھا۔۔۔ کبھی کبھی ناغہ ہو جاتا ہے۔

سلیم فرخی (مدیر ہمدرد نونہال)

1: کام ختم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اسے شروع کیا جائے۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں، بڑی گہری بات ہے۔

2: ایٹمی سائنس دان سلطان بشیر محمود صاحب کی مدلل کتابیں اس قابل ہیں۔

3: عبدالحلیم شرر کی کتاب فردوس بریں۔۔

4: لائبریری روز جاتا ہوں، بلکہ دفتر سے آنے کے بعد لائبریری ہی میں دیر تک رہتا ہوں، کیوں کہ وہ گھر میں ہی ہے۔ ❁

آپ کا پسندیدہ مصنّف کون؟

یہ کوشش تو ہر ناشر کو کرنی چاہئے۔ اور کتاب میلے کے منتظمین کو بھی۔ لیکن 'اطراف' اسے اپنا قومی فریضہ خیال کرتے ہوئے ہر سال اپنے اسٹال پر آنے والوں سے یہ معلومات حاصل کرنے کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ کتاب میلہ **2022** میں کتاب میلے میں آنے والے خواتین وحضرات سے ہم نے ان کے پسندیدہ مصنّفین کے نام حاصل کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ تفصیلات آپ کی نذر ہیں۔ پڑھئے۔ آپ بھی اپنے پسندیدہ مصنّف کے بارے میں واٹس ایپ کر سکتے ہیں۔ **0300-8210636**۔

زندہ لکھنے والوں میں مستنصر حسین تارڑ سب سے پسندیدہ

مرحومین میں اشفاق احمد۔ ابن انشاء۔ قدرت اللہ شہاب

شیخ ایاز۔ امر جلیل۔ تاج جویو بھی محبوب

خواتین میں عمیرہ احمد۔ قرۃ العین حیدر۔ بانو قدسیہ

☆ اطراف رپورٹ

نام	آپ کا پسندیدہ مصنّف
عفت سلطانہ	اقبال، قدرت اللہ شہاب، فیض احمد فیض، ابن انشا، محمود شام
جاوید حسین انصاری	ڈپٹی نذیر احمد
حامد عثمانی	ابن انشا، اشفاق احمد
ڈاکٹر یوسف خان عظیمی	مستنصر حسین تارڑ، اشفاق احمد
انور سعید صدیقی	قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، مولانا مودودی
سید احمد نقوی	تاریخ پاکستان، سائنس اور ادب
صلاح الدین غازی	محمود شام، مستنصر حسین تارڑ، میرزا ادیب
محمد رضوان	محمود شام، انور مقصود، ابن انشا
شیخ عبدالمالک	سب ہی پسند ہیں
احمد علی	حسن جعفر زیدی، ۔۔۔ خالد اختر
حافظ شیر محمد	مولانا مودودی
زیت اللہ	حضرت مولانا مفتی تقی
محمد بلال	حضرت مولانا احمد ممتاز
مفتی محمد عبداللہ نورانی	علامہ غلام رسول سعیدی، قدرت اللہ شہاب
مقبول خان	محمود شام، ابن انشا، اشفاق احمد
اطہر اقبال	محمود شام
ابن حسن عظیمی	ابن صفی

نام	آپ کا پسندیدہ مصنّف
ضیاء الرحمن	ابن انشاء
سید معراج جامی	ہر اچھا لکھنے والا
عبدالرحمن	ابن آس
حارث ظفر	Sports
ایاز خاصخیلی	محمود شام
عامر صابر	ابویحییٰ۔ غامدی
حارث منال	شاعری۔ ترجمہ
عشرت معین سیما	ادا جعفری۔ سعید نقوی
امینہ	ہر اچھا مصنّف
شبنم امان	شمس الرحمن فاروقی، شاعر مومن، ناصر کاظمی
شازیہ امان	حمیرا راحت
محمود حسین	رضا علی عابدی
نعیم الرحمن	محمد اقبال دیوان
لیاقت عباسی	رضا علی عابدی
منصور کھوکھر	شیخ ایاز
مرتضیٰ گوہر	سعادت حسن منٹو
علینہ علی	ممتاز مسعود، یوسفی، قبال، غازی صلاح الدین
ہمہ منصور	ابویحییٰ، مولانا مودودی، حسن البنا، قطب الدین، قانتہ رابعہ

آپ کا پسندیدہ مصنّف کون؟

نام	آپ کا پسندیدہ مصنّف
فریال سلیم	جان محمد دشتی، مستنصر حسین تارڑ
حسن جاوید	ڈاکٹر مبارک علی، ڈاکٹر جعفر، محمود شام
قاری قاسم جذیذی	شیخ عبداللہ ناصر رحمانی
ڈاکٹر شمع افروز	عرفان حبیب
انیلا ٹوانہ	محمود شام
ڈاکٹر صدف تبسم	حارث خلیق، قرۃ العین حیدر
انتخاب عالم	سعادت حسن منٹو، مولانا مودودی
عبدالصمد شمسی	اشفاق احمد
نجم الحسن عطا	سعادت حسن منٹو
فیصل سلطان	اشفاق احمد
محمد یاسر مبارک	فریحہ مبارک، مولانا مودودی، اشتیاق احمد
سیما لیاقت	ڈاکٹر عابدہ کاظمی، واصف علی واصف، زبیدہ مصطفی
اقراء	واصد علی واصف، عمیرہ احمد، نمرہ احمد
احمد سلیم صدیقی	اے حمید۔ عزیز احمد۔ کرشن چندر
انور سعید عثمانی	مولانا مودودی
ثروت	عمیرہ احمد۔ مستنصر حسین تارڑ
صباح الدین	مناظر احسن گیلانی، تقی عثمانی
ڈاکٹر حمزہ گلگتی	ابوالکلام آزاد، غبارِ خاطر
زاہد یعقوب عامر	محمود شام
شاہ فیصل	محمود شام
صلاح الدین	محمود شام
عبدالستار شیخ	محمود شام
پروین جمیل چھیپا	امجد ثاقب، محمود شام
عبدالرافع	ملا جیون
ذبیح اللہ	جون ایلیا
عنایت اللہ سومرو	ڈاکٹر اسرار احمد
محمد راشد علی خان	محمود شام
شائستہ اشفاق	میاں محمود نجمی
محمد وحید جنگ	ڈیل کارنیگی
عدیل شاہ	شیخ اکبر محی الدین ابن عربیؒ
محمد ایوب قائم خانی	امام احمد رضا خان، عبید الرحمن

نام	آپ کا پسندیدہ مصنّف
ظہیر احمد	محمود شام
یاسمین ظہیر	خان ظفر افغانی
قمر فاروق نظامی	پنجابی ادب
سید احمر حسن	قدرت اللہ شہاب، قاسم علی شاہ
تحریم اسلم	محمود شام، یوسفی صاحب
فرزانہ روحی اسلم	
صالحہ صدیقی	مشتاق یوسفی اور محمود شام
رضوان زیدی	اشفاق احمد، بانو آپا، مشتاق یوسفی
خلیل ناصر	سید ابوالاعلیٰ مودودی، مشتاق یوسفی
سید عبدالتواب ایڈووکیٹ	صدیق سالک، زیڈ اے سلہری، ابوشجاع ابووقار
صفیہ آدم جی	علامہ اقبال، سر سید احمد، مولانا الیاس قادری
ڈاکٹر یحییٰ انجم	طارق اسماعیل ساگر
صائمہ فراز	سعدیہ سیما
نظر محمد	تاج جویو
ڈاکٹر صبغت اللہ	امر جلیل
سیدہ فرحانہ بیگم	جاوید احمد غامدی
سیدہ ثمینہ بیگم	جاوید احمد غامدی، مشتاق احمد یوسفی، ابن صفی
سید افتخار حسین	مشتاق احمد یوسفی
انعم شاہد	اشفاق احمد
ریاض الدین منصوری	محمد طفیل (نقوش)
ڈاکٹر نوروز خان	محمود شام
گل بانو	مشتاق احمد یوسفی
شہنیلا نازنین	فرحت عظیم
اقبال یوسف	محمود شام
چوہدری ثاقب	سارے مصنّف
طاہر سواتی	منٹو، محمود شام
ڈاکٹر جمال نقوی	محمود شام
احمد حسن	مختار مسعود
شاہد محمود	ولیم ورڈز ورتھ، ڈپٹی نذیر احمد، سر سید احمد خان
اویس ادیب انصاری	محمود شام

❁❁❁

لاہور کی معزز اہل قلم

ہماری درخواست پر لاہور کی نامور مصنّفہ۔ سرگرم ادیب عطرت بتول لاہور کی ممتاز قلم کار خواتین سے متعارف کروا رہی ہیں۔ اردو کے ساتھ ساتھ خواتین پنجابی۔ ہندکو اور دوسری زبانوں میں بھی طبع آزمائی میں مصروف ہیں۔ پڑھئے اور اپنی رائے دیجئے۔

عطرت بتول، لاہور۔

ناہید اقرار، شاعر، قلم کار، اینکر پرسن

میرا نام ناہید اقرار ہے۔ سکول کے زمانے سے غیر نصابی سرگرمیوں کا حصہ رہی۔ شاعری کا شوق کالج کے زمانے سے ہوا اور پہلی نظم مس ناہید قاسمی نے اصلاح کی یوں شاعری کا شوق زیادہ ہوتا گیا۔ کالج میگزین کی ایڈیٹر رہی اور مختلف رائیٹرز سے انٹرویوز لیے۔ ایم اے فلسفہ میں کیا اور اس دوران صرف پڑھائی پہ توجہ دی ایم اے کے بعد شادی بھی ایک جرنلسٹ سے ہوئی۔ دوسرا ایم اے میں نے اردو لٹریچر میں کیا تو کالم نگاری کی طرف اور سکرپٹ رائیٹنگ پہ توجہ دی۔۔ ڈائریکٹر کے طور پر Atlas Honda کے تعاون سے ویمن بائیک رائڈنگ کا پروجیکٹ کیا جس میں خواتین کو موٹر سائیکل چلانی سکھائی گئی اور یہ بہت حوصلہ افزا رہا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہ پروگرام پاکستان میں پہلی دفعہ میں نے بطور ڈائریکٹر کیا۔ اینکر کی حیثیت سے Royal TV Kohinoor TV.Waqt TV پر کرنٹ افیئرز کے پروگرام کرتی رہی۔۔ شاعری کی کتاب۔۔ میرا عنوان تم ہو۔۔۔ کے نام سے

شائع ہوئی۔۔ یہاں میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ میرے میاں آغا اقرار ہارون ایک جرنلسٹ اور میڈیا پرسن ہیں انہوں نے ہر قدم میری رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

رہبران ادب کی مصنّفہ۔ روزینہ فیصل زرش بٹ

کتاب کا نام: رہبرانِ ادب مصنفہ: روزینہ فیصل زرِش بٹ تعارف مصنفہ: روزینہ فیصل کا بنیادی طور پر تعلق سرگودھا سے ہے لیکن خاندان کے لاہور منتقل ہونے اور شادی کے بعد آپ مستقل طور پر لاہور کی ہی مکین ہوگئیں۔ آپ انگلش کے مضمون میں ایم فل کر رہی ہیں اور بحیثیت استاد یونیورسٹی کی سطح پر پڑھا بھی رہی ہیں۔ روزینہ کی تحاریر مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ بحیثیت مصنفہ روزینہ مختلف ایوارڈز بھی اپنے نام کر چکی ہیں۔ روزینہ ایک ملنسار، خوش گفتار، باادب اور ہمہ جہت خاتون ہیں جو گھر داری کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی تعلیم و تدریس کو جاری رکھے ہوئے ہیں بلکہ ادبی سرگرمیوں کا حصہ بھی بنتی رہتی ہیں۔ رہبرانِ ادب روزینہ کی ایک منفرد تخلیق ہے جس میں ادب کے فروغ میں پیش پیش نہ صرف نامور ادیبوں کا تذکرہ ہے بلکہ ادب سے جڑی ایسی ہستیوں کا بھی ذکر ہے جن کی ادبی خدمات کو آج تک کسی بڑے ادبی پلیٹ فارم پر نہیں سراہا گیا۔ یہ کتاب عہدِ حاضر کی ان ادبی شخصیات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لئے لکھی گئی ہے جن کی زندگیوں کا مقصد صرف اپنی زندگی سنوارنا نہیں بلکہ ادب سے جڑے نوآمیز طالب علموں کو راستہ دکھانا ہے۔

اُردو اور ہندکو کی افسانہ نویس ناول نگار گل ارباب

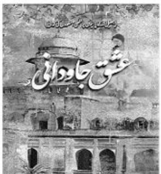

پہلی کتاب۔ خواتین کی مشترکہ مائیکروفکشن کی پاکستان میں پہلی کتاب تھی ''زمزمہ ادراک'' جس میں میری 18 کہانیاں تھیں دوسری کتاب اساطیری ناول تھا 'فسوں کدہ' 3 ناول 'عشق و عورت' اور 'عنکبوت' 4 'نورنگر کی جینا' ناول 5 'دنداسہ۔ افسانوں کا مجموعہ' 6۔ 'گل نوشت سوانح حیات' 7 'عشق جاودانی' ناول چار کتابیں ہندکو کی۔ پہلا سفر نامہ 'تتلی تریل تے تریمت' پہلی مائیکروفکشن کتاب 'چنی نال بنھی کہانڑیاں' پہلی بچوں کی کتاب 'ٹیٹارے' پہلا ہندکو ناول 'شاہ بانو تے شیخوف' زیر طباعت بچوں کی اردو کتاب 'چلبلی وادی'۔

شاہین اشرف علی

میرا نام شاہین رضوی ہے مگر شادی کے بعد شاہین اشرف علی اپنے شوہر کے نام کو اپنی پہچان بنا کر لکھا برسوں سے قلم کتاب سے وابستگی ہے میری کتاب چراغ در چراغ کی رسم اجراء پاکستان اور گلف کے بہت سارے شہروں میں ہوئی تھی پاکستان کے سفیر برائے کویت جناب سید ابرار حسین صاحب نے میری کتاب کی رسم اجراء میں شرکت کی تھی۔

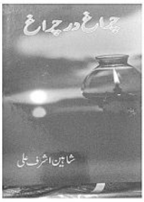

ناول نگار۔ افسانہ نویس۔ بچوں کی ادیبہ کنول بہزاد

کنول بہزاد ایک معروف فکشن رائٹر ہیں۔ آپ نے افسانے، بچوں کا ادب اور ناول نگاری میں طبع آزمائی کی ہے۔ ''نین ترے انجان'' ان کا پہلا ناول ہے۔ اس کا پیش لفظ نامور مصنفہ نیلم احمد بشیر صاحبہ نے لکھا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔۔۔'' یہ ناول کنول کے دل کی آواز ہے۔ جس میں احساس کی لطافت، درد کی لذت اور غموں کی تفسیر پنہاں ہے۔ درحقیقت غم کو زندگی سے منہا نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس ناول کو بہ یک وقت ایک المیہ شعر، المیہ مصوری اور ساتھ ساتھ مسحور کن موسیقی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔'' فلیپ پر ملک کے جانے مانے مصنف یونس جاوید اور مشہور لکھاری مسرت کلانچوی صاحبہ کی رائے بھی موجود ہے۔ ان کے مطابق یہ جنوبی پنجاب کے خطے

کا تہذیبی منظر نامہ ہے۔ ناول کا مجموعی پیغام زندگی، محبت اور امید ہے۔ یہ ناول تخلیقی رچاؤ، شدت فکر اور ندرت خیال کی نئی جہت کو آشکار کرتا ہے۔ یہ ناول اردو کے سب سے بڑے اخبار" جنگ" میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے۔ فکشن ہاؤس لاہور کے زیر اہتمام کتابی شکل میں سامنے آیا ہے۔ پاکستان بھر کے ادبی حلقوں نے نا صرف اسے سراہا ہے بلکہ ناول نگاری کی دنیا میں اسے ایک خوبصورت اضافہ قرار دیا ہے۔

17 سال کی عمر میں پہلی کتاب لانے والی فلک زاہد

تعارف فلک زاہد نے نہایت کم عمری میں ہی ادب کی دنیا میں اپنا نمایاں مقام اور ایک منفرد شناخت قائم کی۔ خداداد صلاحیتوں کی مالک اس کم عمر مصنفہ کا تعلق زندہ دلوں کے شہر لاہور سے ہے۔ آپ نے بچوں کے لیے ہارر کہانیاں لکھنے سے آغاز کیا اور بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے بے شمار طبع زاد ہارر کہانیاں لکھیں۔ آپ تراجم بھی خوب کر لیتی ہیں۔ کہانیوں سے شروع ہونے والا یہ سفر افسانہ نگاری، تبصرہ نگاری، ناول نگاری، آرٹیکلز، سوانح حیات اور سفر نامے تک پہنچا۔ اکادمی ادبیات اطفال کی جانب سے آپ کو پاکستان کی کم عمر ترین مصنفہ ہونے کے اعزاز میں ایوارڈ اور کیش پرائز دیا گیا کیونکہ آپ نے بارہ سال کی عمر سے لکھنے کا آغاز کیا اور پہلی کتاب سترہ سال کی عمر میں منظر عام پر آئی۔ آپ کی تحاریر پاکستان کے کئی معیاری جرائد و رسائل، اخبارات اور قومی اور بین الاقوامی ویب سائٹس کی زینت بن چکی ہیں۔ جن میں اخبار جہاں، ڈر ڈائجسٹ کراچی، خوفناک ڈائجسٹ لاہور، مارگلہ نیوز انٹرنیشنل، بچوں کا باغ، بچوں کی دنیا، جگنو اور پھول قابلِ ذکر ہیں۔ کئی نامور کتابوں کے اندر آپ کے تاثرات بھی محفوظ ہیں۔ آپ گولڈ میڈلسٹ ہونے کے ساتھ ساتھ کئی اعزازات، اعزازی سند اور متعدد ایوارڈز حاصل کر چکی ہیں جن کی تعداد چالیس کے لگ بھگ ہے۔ جن میں بہترین مصنفہ، بہترین کتاب، بہترین ہارر رائٹر جیسے ایوارڈز شامل ہیں۔ آپ کی اب تک پانچ کتب منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پہلی کتاب" 15 پراسرار کہانیاں" (ایوارڈ و کیش پرائز ونر) کے باعث آپ کو پاکستان کی کم عمر ترین مصنفہ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ دوسری کتاب" بھوتوں کا تاج محل"، تیسری کتاب" قدیم چرچ" (ایوارڈ یافتہ ناول)، چوتھی کتاب" داستان ہوشربا" اور پانچویں کتاب" وادی سحر کمراٹ" (ایوارڈ و کیش پرائز ونر سفر نامہ) ہیں۔ آپ کو ہارر رائٹر کے نام سے پہچانا جاتا ہے اسی پہچان کی بنیاد پر آپ کی چھٹی کتاب" ہارر رائٹر" کے نام سے اسی سال منظر عام پر آئی ہے جس کی تقریب رونمائی کی رپورٹ پی ٹی وی نے بھی نشر کی۔

ماہر نفسیات۔ سماجی مسائل پر لکھنے والی فوزیہ سعید

ڈاکٹر فوزیہ سعید ایک ماہر نفسیات ہیں، تھیلیسیمیا کے شکار بچوں کے لیے کالجز، اسکولز اور مختلف جگہوں پہ جا کر بلڈ کیمپ لگاتی ہیں، وہ انجمن ہلال احمر (ریڈ کریسنٹ) میں ایک اعلیٰ عہدیدار ہیں اور ان سب مصروفیات کے باوجود سماجی مسائل پر لکھتی ہیں۔

اُردو پنجابی کی نامور مصنّفہ شاہین زیدی

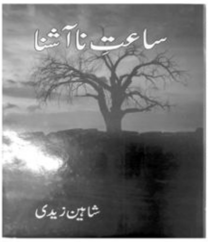

تعارف: ڈاکٹر شاہین زیدی سہ ماہی ،،نوادر،، کی مدیرہ ،کالم نگار ، مصنفہ تصانیف: جدا منزلیں جدا راہیں (ناول) پھر وہی دن کا اجالا ، کرم کی آس (افسانے) میں سفیر حج (حج کا سفر نامہ) اوکھے پینڈے (پنجابی افسانے) ابھی موسم نہیں بدلا (شعری مجموعہ) ساعت نا آشنا (شعری مجموعہ) درد وچھوڑے (پنجابی گورمکھی شعری مجموعہ) درود وسلام نعت دو ناول نور بانو اور زنجیر جنوں (زیر طبع)

مضمون نگار۔ بچوں کی ادیبہ۔ عطرت بتول، اطراف، کی قلمی معاون

پری گل، تصنیف: سیدہ عطرت بتول نقوی (پری گل کا دوسرا ایڈیشن حال ہی میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا) روزنامہ،، جنگ سے لکھنے کا آغاز کیا اور جنگ کے مختلف ایڈیشنز کے لیے ، ادبی ایڈیشن ، خواتین ایڈیشن ، چلڈرن ایڈیشن ، اسلامی ایڈیشن اقراء کے لیے مضامین اور کہانیاں لکھیں ادبی جریدے ،، فنون میں کئی مضامین شائع ہو چکے ہیں اُردو ڈائجسٹ میں بھی تحریریں شائع ہوئیں پھول میگزین میں اور اخبار جہاں میں کہانیاں شائع ہو رہی ہیں۔

آبی وسائل اور تنازعات پر پی ایچ ڈی۔ ڈاکٹر نوشین خالد

ڈاکٹر نوشین خالد کا آبائی شہر لاہور ہے۔ ڈاکٹریٹ پاکستان کے آبی وسائل اور آبی تنازعات پر ہے۔ تدریس سے تعلق ہے۔ پڑھانے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھتی بھی رہیں۔ جنگ اسپیشل ایڈیشن اور نوائے وقت میں انکی تحریر باقاعدگی سے چھپتی ہے۔ جامعہ کے طالب علموں کے لئے انٹرنیشنل ریلیشنز کی ٹیکسٹ بک لکھی، کالا باغ تنازع، قائداعظم اور رفقائے قائداعظم کی انکی تصانیف ہیں۔ وزارت ماحولیات کلین اینڈ گرین پروگرام میں پنجاب حکومت کی کوآرڈینیٹر رہیں اور منسٹری آف سوشل ویلفیئر اینڈ بیت المال سے بھی منسلک رہیں۔

فیس بک خزانے۔ اثاثے

ہم نے فیس بک پر احباب کو زحمت دی کہ وہ اپنے گھر میں موجود 60سال سے زیادہ پرانی اُردو سندھی پشتو بلوچی سرائیکی پنجابی انگریزی کتابوں کے سرورق کا عکس بھیجیں۔ اور ساتھ چند جملے۔ بہت ممنونیت کے ساتھ ہم قارئین 'اطراف' کے مندرجات زینت اطراف کر رہے ہیں۔

سید عزیز الرحمٰن۔ 60سال سے لے کر 5سو سال قدیم کتابیں

عرفان عباسی۔ 60 سے پانچ چھ سو سال پرانی کتابیں

اقتدار جاوید۔ دیوان حضرت علی۔ عبدالقادر جیلانی۔ معین الدین چشتی

عبدالحئی۔ بہت سے خزانے ہیں ان کے پاس

آفتاب میمن۔ انگریزی۔ سندھی۔ اردو کی بے شمار کتابیں

اطراف فیس بک رپورٹ

حسنین چوھدری۔ بہت ساری ہیں پانچ سو سے زائد ہوں گی۔ اس صورت میں کیا کیا جائے۔

❁ بہت خوش قسمت ہیں آپ۔

تعبیر احمد آگاھی۔

اس طبع دوم کے جملہ حقوق طباعت و فروخت بحق ناشر محفوظ

طبع اول : فروری ۱۹۴۷ء

طبع دوم : دسمبر ۱۹۶۳ء

ناشر : ایچ۔ ایم سعید کمپنی، ناشران و تاجران کتب۔ ادب منزل پاکستان چوک، کراچی

طابع : ایجوکیشنل پریس ادب منزل۔ پاکستان چوک، کراچی

خطاط : حافظ حبیب اللہ

رسم الخط : نستعلیق

سرورق : جمال یوسف

صفحات ۳۶۴۔ تعداد طبع : دو ہزار

قیمت : پانچ روپے

خواجہ زاھد۔ میرے پاس بھی سینکڑوں ہیں ماشااللہ سے۔

❁ کسی وقت ان کے بارے میں لکھیے۔

عرفان عباسی۔ سائیں ہمارے پاس بھی 60 سے لیکر 5.6 سو سال پرانی کتابیں بہت ساری ہیں۔

❁ کسی وقت ان سے ملوائیے۔

نثار نندوانی۔ کراچی

مقدس بائبل سندھی زبان میں 1954 حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر دیگر پیغمبروں سے متعلق ہے۔

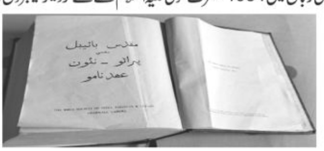

اقتدار جاوید۔

دیوان حضرت علی۔ دیوان عبدالقادر جیلانی۔ دیوان معین الدین چشتی۔ تصنیف مرزا صاحباں از مولوی سراج قادری بادشاہ پوری۔

❁ بہت شکر گزار۔

ولی خان مظفر۔

امجد حسین ایڈووکیٹ۔ سپریم کورٹ

کافی ہیں۔ حکم حاکم تعمیل ہوگی۔ انشااللہ۔

عبدالحئی

رگوانور۔

جی میرے پاس ہیں۔

❁ اطراف جذبات سے مغلوب ہے۔

فھیم شناس

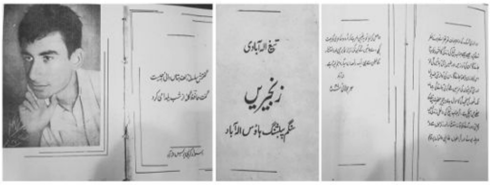

فیس بک خزانے۔ اثاثے

آفتاب میمن

دو دو تین تین کتابیں ہر ایک زبان یعنی انگریزی۔ اردو اور سندھی میں اب بھی رکھی ہوئی ہیں۔ اکثر اُردو

اور سندھی کی کتابیں پبلک لائبریریوں میں دیتا رہا ہوں۔ سندھی سے شروع کرتا ہوں۔
شاہ جو رسالو۔ مولف غلام محمد شاہوانی

اکرام الحق سرشار

میرے پاس بھی کچھ کتابیں پرانی ہیں۔ مختار صدیقی صاحب کی منزل۔ شب موجود ہے 1955۔ بہت جلد ٹائٹل بھیج دوں گا۔ پیش لفظ مختار صدیقی نے خود ہی لکھے ہیں۔ تعداد اشاعت 100 ہے۔ سویرا آرٹ پریس لاہور لکھا ہوا ہے۔ مکتبہ جدید انارکلی دوسری سائیڈ پر لکھا ہوا ہے۔ قیمت کا اندراج نہیں ہے۔ بڑی دیدہ زیب چھپی ہوئی ہے۔ نظمیں اور غزلیں ہیں۔

ریلوے اسٹیشنوں پر بک اسٹال

"اطراف' کتاب نمبر کے لیے ہم نے احباب سے التماس کی کہ وہ بتائیں ریلوے اسٹیشنوں پر اب بھی بک اسٹال نظر آتے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی کہ اب بھی ریلوے اسٹیشنوں پر کتابیں رسالے دستیاب ہیں۔ پڑھئے۔ آپ کا بھی کبھی ریل سے جانا ہو تو ریلوے اسٹیشن کے بک اسٹال پر کھڑے ہو کر اپنی تصویر بھیجیں۔"

بڑے شہروں کے ریلوے اسٹیشنوں پر اب بھی ہیں

ملتان ریلوے اسٹیشن پر کئی موجود ہیں

بڑے اسٹیشنوں پر۔ ڈائجسٹ۔ باسی اخبارات کچھ کتابیں رسائل بھی

پنڈی ریلوے اسٹیشن۔ بانگ درا۔ عشق کا عین۔ روحانی ڈائجسٹ

اطراف فیس بک رپورٹ

عبدالرحمٰن مجاہد۔

لالہ موسیٰ پر ہے۔

شبنم گل۔

حیدر آباد پر ہے۔

محمد رمضان۔

کچھ عرصہ قبل کینٹ اسٹیشن پر تھے۔ پلیٹ فارم نمبر سات آٹھ پر۔ جہاں سے گرین لائن روانہ ہوتی ہے۔
روہڑی کے پلیٹ فارم پر بھی دیکھا تھا۔

ایم احمد رضا انصاری۔

ملتان ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔

چوھدری رائد فوزان برار

ملتان ریلوے اسٹیشن۔ کراچی کینٹ

میر احمد کامران مگسی

ملتان

فائق ترابی

اٹک۔ لیکن الماریوں میں بند۔

اقبال یوسف

تمام بڑے اسٹیشنوں پر ٹک شاپس پر ہی ڈائجسٹ تازے باسی اخبارات کچھ کتابیں بسکٹوں چپس سوئٹ کھلونے وغیرہ کے ساتھ رسائل بھی مل جاتے ہیں۔ شاپ کے ساتھ کچھ کتابیں اور باسی اخبارات۔

صوفی رائو جاوید اختر

راولپنڈی ریلوے اسٹیشن پر بھی ہے۔ بانگِ درا۔ عشق کا عین۔ روحانی ڈائجسٹ نمایاں تھیں۔

اعجاز احمد نوری

تقریباً تمام ریلوے اسٹیشن پر بک اسٹالز بند کر دیے گئے ہیں۔ اب شاید نیشنل بک فاؤنڈیشن والے ہی صرف بک اسٹال لگا سکتے ہیں۔

حسن راشد

حیدر آباد ریلوے اسٹیشن پر

ذاکر اللہ حسنی

اب تو شہر سے اخبار کے اسٹال بھی ختم ہو رہے ہیں۔ ڈسکو بیکری پہ ایک اخبار بیچتے ہوئے بزرگ نظر آجاتے ہیں جن سے اکثر ہم بلاضرورت کوئی اخبار خرید لیتے ہیں۔

محمد عارف سومرو

راولپنڈی، کوئٹہ، کراچی، لاہور، فیصل آباد، پشاور، گجرات ریلوے اسٹیشن

رگّو انور

کراچی کینٹ اسٹیشن پر دیکھے تھے۔ مگر ایئرپورٹ پر دیکھے ہیں اور کراچی ایئرپورٹ پر بھی۔

فھد محمود

راولپنڈی اور لاہور پر تو موجود ہیں۔

تنویر شوکت

فیصل آباد ریلوے اسٹیشن نوید بٹ صاحب گزشتہ کئی دہائیوں سے چلا رہے ہیں۔

حیدرآباد میں کتابوں کی فروخت کے قدیم و جدید مراکز

ماہر تعلیم، محقق، صداکار، مضمون نویس 'جنگ' 'ایکسپریس' اور حیدرآباد میں 'اطراف' کے نمائندہ خصوصی پروفیسر شاداب احمد صدیقی کی خصوصی تحریر

عالمی کتب میلہ ایکسپو سینٹر کراچی میں ماہ دسمبر 2024 میں سجنے کو تیار ہے۔ جس میں شرکت اور کتب کی خریداری کے لیے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد، طلبا و طالبات مصنفین، ادیب اور دانشور بے چینی سے پورے سال انتظار کرتے ہیں عالمی کتب میلہ ایکسپو سینٹر کراچی خواندگی، تعلیم اور ثقافتی تبادلے کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ پبلشرز، مصنفین اور قارئین کو اکٹھا کرکے، میلہ کمیونٹی اور فکری ترقی کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔ یہ مکالمے، سیکھنے اور دریافت کرنے کے لیے ایک جگہ فراہم کرتا ہے، شرکا میلے میں دستیاب کتابوں کے متنوع انتخاب سے استفادہ کر سکتے ہیں، جس سے ان کے علم اور مختلف موضوعات کی سمجھ میں اضافہ ہوتا ہے۔

کتاب میلے کے دوران قارئین اپنی پسند کی کتابیں آسانی سے تلاش کر سکتے ہیں۔ قارئین اپنے پسندیدہ مصنفین کی کتاب پر ان کے آٹوگراف اور دستخط لے سکتے ہیں۔ سب سے اہم بات ان کے ساتھ سیلفی تصاویر بنا کر سوشل میڈیا پر اپلوڈ کر کے لائکس اور کمنٹس حاصل کر سکتے ہیں۔ عالمی کتب میں لوگوں کی بڑی تعداد کی شرکت سے اس تاثر کی نفی ہوتی ہے کہ پاکستانی معاشرے میں کتابوں کا دور ختم ہو گیا ہے۔ پاکستان میں نوجوانوں کا کتاب کی طرف مائل ہونا بہت مثبت پیش رفت ہے۔ کتب میلے کے انعقاد سے معاشرے کو اقدار، انسانیت برداشت اور تہذیب کا درس ملتا ہے۔

یہ کتاب میلہ ایک خاندانی منظر کو بھی پیش کرتا ہے جہاں لوگ اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ کتاب میلہ میں جوق در جوق آتے ہیں جس سے میلے کی رونقیں دوبالا ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب میلہ کا حقیقی مقصد محض کاروباری نہیں ہوتا بلکہ کتاب کی اہمیت اور فروغ کو اجاگر کرنا ہوتا ہے۔

کتب بینی میں کمی کے اسباب اور تلخ حقیقت

کتب بینی میں کمی کی بڑی وجہ کتابوں کی قیمتوں میں اضافہ ہے۔ میں نے کتابوں کی دکانوں پر سروے کر کے کتب بینی میں کمی کے رجحان پر قارئین اور والدین سے بات کی تو ان لوگوں اور قارئین نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مطالعے کا شوق تو ہے، مگر کتابیں اب عام آدمی کی قوت خرید سے باہر ہو گئی ہے والدین نے اسکول سلیبس کی کتابوں میں دلچسپی ظاہر کی۔ انہوں نے کہا کہ اس مہنگائی کے دور میں بچوں کو صحیح تعلیم دلوانا بھی بہت مشکل ہو گیا ہے۔

ایک طالب علم نے کہا کہ کتابیں پڑھنے کا شوق بہت ہے مگر مہنگی کتابیں دسترس سے باہر ہیں۔ میں کتابوں کو دیکھنے آیا ہوں اور میں CSS کی تیاری کر رہا ہوں مگر کتابوں کی قیمتیں دیکھ کر میرے ہوش اُڑے گئے۔ میں اپنی تیاری لائبریریوں میں کرتا ہوں اور باقی مدد سوشل میڈیا سے حاصل کرتا ہوں۔ کتاب میلہ کے متعلق نوجوان نے کہا کہ یہ بہت اچھی کاوش ہے۔ اس طرح کے میلے پاکستان کے تمام شہروں میں جلدی جلدی منعقد کیے جائیں۔ اس نوجوان نے مزید کہا کہ حکومتی سطح پر باقاعدہ طور پر ان میلوں کو کامیاب بنانے کے لیے وسائل مہیا کرنے چاہئیں تاکہ ملک سے تعلیمی محرومیاں جلد از جلد ختم ہو سکیں۔ ایک دوسرے نوجوان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لائبریریوں کو عوام الناس میں کتب بینی کے شعور کو اجاگر کرنے کے لیے خصوصی پروگرام

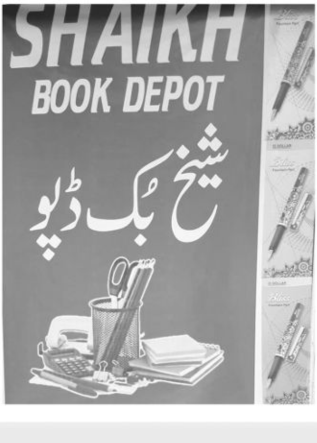

ترتیب دینے چاہئیں اور جدید دور کی کتابوں میں اضافہ کرنا چاہئے کہ جس میں سائنس و ٹیکنالوجی، اسلامی کرنٹ افیئرز۔ معلومات عامہ، تاریخ اور ادب و ثقافت شامل ہیں میرے مشاہدہ میں آیا ہے کہ اسکولوں کی کتابیں اور نصابی کتابیں فروخت زیادہ ہوتی ہے جس میں A لیول اور او لیول نمایاں ہیں۔ نجی تعلیمی اداروں کے اپنے اپنے اسکولوں میں کتابوں کی دکانیں کھول رکھی ہیں وہ ان کتابوں کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں۔ تعلیم کا حصول مشکل ہو گیا ہے۔

فکشن ہاؤس۔ یونیورسل بک ڈپو۔ حیدرآباد لاء ہاؤس۔ سندھ کتاب گھر شیخ بک ڈپو۔ ہر قسم کی کتاب دستیاب

کتاب، کتاب بینی اور ناشروں کی دہائی

پاکستان میں ایک طرف کتاب بینی کی کمی کا رونا رویا جاتا ہے، جبکہ دوسری طرف ناشروں اور لکھاریوں کو معاشی مسائل لاحق ہیں۔ صرف کتابوں کی تعداد پر مطمئن ہو جانا کافی نہیں بلکہ سوچنا اس بارے میں ہو گا کہ اچھی اور معیاری کتابیں ملک میں کتنی چھپ رہی ہیں، اچھے لکھنے والے کتنے ہیں اور کس حال میں ہیں؟ میں نے حیدر آباد میں ناشروں سے رابطہ کر کے ان کے مسائل جاننے کی کوشش کی جس پر ایک ناشر نے جذباتی لہجے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی کاغذ کتابوں کے لیے معیاری نہیں جبکہ درآمدی کاغذ کی قیمتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں اگر حکومت درآمدی کاغذ پر عائد ڈیوٹی کی شرح کم سے کم کر دے تو کتابوں کی قیمتیں 50 فی صد تک کم ہو جائیں گی۔ انہوں نے مزید کہا کہ پاکستان میں 80 فیصد آبادی دیہی علاقوں میں رہتی ہے جہاں انٹرنیٹ یا جدید ٹیکنالوجی سے استفادہ کسی صورت ممکن نہیں اس لیے مطبوعہ کتابوں کی اہمیت کم نہیں ہو سکتی، پاکستان میں ہماری معیشت ڈالر کی محتاج ہے۔ اس لیے پاکستان میں ڈالر کی قدر بڑھنے کے ساتھ ساتھ نئی درآمدی پالیسی میں کاغذ اور کتابوں پر بے انتہا ڈیوٹی لگا دی گئی ہے۔ مقامی مینوفیکچر کاغذ کی مانگ پوری نہیں کر پا رہے ہیں جس کے سبب پرائیویٹ پبلشرز کی نصابی کتابیں بہت مہنگی ہو گئی ہیں جبکہ ادبی کتابوں کا خریدار اب موجود ہی نہیں ہے کیونکہ یہ کتابیں

بھی مہنگی ہوچکی ہیں۔ پبلشرز کو سب سے اہم مسئلہ لوڈ شیڈنگ متاثر کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ مہنگی بجلی اور ملک میں بڑھتی ہوئی مہنگائی نے کاروبار کرنا بہت مشکل کر دیا ہے۔ حکومت ہمارے مسائل پر سنجیدگی سے غور کرے اور ان کے حل کے لیے عملی اقدامات کرے

کتابوں کی بقا کے لیے اقدامات:-

کتاب اور کتب بینی کے رجحان میں بہتری کے لیے معاشرہ کو اہم کردار ادا کرنا ہوگا۔ میری خواہش تو یہ ہے کہ تمام سیاسی پارٹیاں اور رکن اسمبلی اپنے اپنے حلقوں میں لائبریریوں کے قیام کو یقینی بنائیں۔ شہروں میں لوگ اپنے اپنے علاقوں میں بک بینک قائم کریں۔ پبلک مقامات پر لائبریریوں کو قائم کیا جائے۔ نیشنل بک فاونڈیشن کو دوبارہ سے فعال اور ممبر سازی کی جائے۔ نیشنل بک فاونڈیشن کی کتابوں کی قیمتوں میں کمی کرے یہ موبائل لائبریریاں بنائی جائیں جو شہر کے ہر کونے میں جاکر مطالعہ کے لیے کتابیں فراہم کی جائیں۔

حیدرآباد کی کتابوں کی دکانوں کی سیر

فکشن ہاؤس حیدرآباد

فکشن ہاؤس رابعیہ اسکوائر حیدر چوک کا قیام 2001 میں ہوا۔ اس برانچ کا بنیادی مقصد اندرون شہر جہاں کتابوں کی رسائی مشکل ہے جیسے میر پور خاص، عمر کوٹ اور تھر پارکر کے ریجن یا سکھر، گھوٹکی، بدین، ٹھٹھہ اس مقصد کے لیے فکشن ہاؤس کو حیدرآباد میں شروع کیا گیا۔ یہاں بھی ادبی، علمی اور تحقیقی کی کتابیں 50 فیصد پر دستیاب ہیں۔ اندرون سندھ کے کئی شہروں میں فکشن ہاؤس کی طرف سے کتاب میلے منعقد کیے جاتے ہیں۔ فکشن ہاؤس کا ہیڈ آفس مزنگ روڈ لاہور میں واقع ہے۔ میں نے فون پر فکشن ہاؤس کے مالک شہزاد ظہور سے خصوصی بات کی تو انہوں نے بتایا فکشن ہاؤس لاہور کا سنگ بنیاد 1991 میں ان کے والد ظہور احمد خان نے رکھا تھا۔ آج کل فکشن ہاؤس کی چار برانچیں ہیں۔ کراچی۔ حیدرآباد، گجر خان اس کی ذیلی برانچیں ہیں۔ فکشن ہاؤس کا منشور ہے کہ پاکستان کے اندر روشن خیالی اور ترقی پسندی کو فروغ دیا جائے۔ اسی وژن کے تحت یہ ادارہ 1991 سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہے اور ظہور صاحب اس مشن کو آگے لے کر چل رہے ہیں۔

یونیورسل بک ڈپو حیدرآباد

یونیورسل بک ڈپو حیدرآباد کے وسط میں بہت پرانا واقع ہے۔

اس کے اطراف میں تعلیمی ادارے قائم ہیں جس میں مشہور بونا ونچر اسکول تلک چاڑی اور گورنمنٹ نذرت گرلز کالج تلک چاڑی ہے۔ اس کے مالک عابد صاحب تعلیم کے لیے بہت سرگرم ہیں اور ہر قسم کی کتابوں کی فراہمی کو یقینی بناتے ہیں۔

> **شیخ بک ڈپو پر مہنگی کتابیں 10 روپے روزانہ کے حساب سے کرائے پر بھی مل جاتی ہیں**

اس کے علاوہ اسٹیشنری اسکول کالج بیگ اور اسکول کچھ تمام اشیاء موجود ہیں۔ یہاں ماہنامہ اطراف بھی دستیاب ہے۔ یہ تمام کتابیں اور تعلیمی استعمال کی اشیا آن لائن بھی فراہم کرتے ہیں یونیورسل بک ڈپو کا مکمل پتہ فوجداری روڈ، ڈاکٹرز کالونی نزد تلک چاڑی حیدرآباد۔

حیدرآباد لاء ہاؤس

حیدرآباد لا ہاوس شفیع چینی والا نے 1963 میں قائم کیا۔ ان کی وفات کے بعد 1992 سے ان کے صاحبزادی عرفان چینی والا اور کامران چینی والا سنبھال رہے ہیں۔ یہ اسٹیشن روڈ حبیب بینک کے سامنے اور ریشم گلی کے قریب واقع ہے۔ یہاں لاء کی ہر قسم کی کتابیں موجود ہیں اس کے علاوہ Css, spse، جنرل نالج، ناول، ادب کی کتابیں دستیاب ہیں۔ ماہنامہ اطراف بھی باقاعدگی سے ہر ماہ دستیاب ہوتا ہے۔

سندھ کتاب گھر، پریس کلب حیدرآباد

یہ 30 سال پرانا کتابوں کا مرکز ہے۔ اس کے مالک طارق صاحب طلبا اور نوجوانوں کی علمی خدمت کر رہے ہیں۔ ان کی دکان پر نوجوانوں کا ہر وقت ہجوم نظر آتا ہے زیادہ تر نوجوان css اور spse کی کتابوں کے متلاشی ہوتے ہیں۔ سندھ کتاب گھر پر ناول، اردو اور سندھی ادب کی کتابیں، بچوں کی کتابیں، جنرل نالج، ای کیٹ اور ایم ڈی کیٹ ٹیسٹ کی تیاری کی کتابیں اور دیگر علوم کی کتابیں دستیاب ہیں۔

شیخ بک ڈپو لطیف آباد حیدرآباد

یہ جامع کلاتھ مارکیٹ نمبر 8 لطیف آباد کے عقب میں واقع ہے۔ 1990 میں قائم ہوا اور اس کے مالک عبدالسلام شیخ ہیں۔ یہاں ہر قسم کے علوم کی کتابیں دستیاب ہیں جس میں اسکول کالج سلیبس، میڈیکل اور انجنیئر نگ کی کتابیں، جنرل نالج css، spse ناول بچوں کی کہانیاں ہر قسم کی کتاب موجود ہے۔ یہاں مہنگی سے مہنگی کتاب کی قیمت جمع کرا کر کتاب 10 روپے روزانہ کے حساب سے کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں اور جب طلباء کی ضرورت پوری ہوجاتی ہے تو واپسی پر ان کو کتاب کی پوری قیمت واپس کر دی جاتی ہے۔ اس سے غریب طلباء اچھی طرح فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ یہاں طلبا اور والدین کا بہت ہجوم ہوتا ہے۔

آپ حیدرآباد کی کتابوں کی دکانوں کے بارے میں جان کر یقینا محظوظ ہوئے ہوں گے۔ ہمارے حیدرآباد کے قارئین جواَب بیرون ملک اور بیرون شہر رہائش پزیر ہیں ان کی بھی پرانی یادیں تازہ ہوگئی ہوں گی۔ کتابوں کی دکان پر جائیں تو یہ کتابیں گرمجوشی سے آپ کا استقبال کرتی ہیں۔ رنگ برنگ ٹائٹل کی کتابیں دل کو بھاتی ہیں۔

کتاب گھر۔ کتاب محل۔ فیاض بک ڈپو۔ قیام پاکستان سے پہلے کی رونقیں

تحریر: نازیہ آصف، گجرات

ہمارے ملک میں ایک وقت تھا جب آپس میں مکالمے کی ریت تھی۔ کتابوں کی دکانیں محض دکانیں نہیں تھیں بلکہ کتاب پڑھنے والوں کا مرکز ہوتی تھیں اور کتاب سے محبت کرنے والے بطور خاص وقت نکال کر کتابوں کی دکانوں کا رخ کرتے، کئی دکانوں پہ کتاب پڑھنے کے لیے باقاعدہ جگہیں بھی بنائی گئی تھیں۔ جہاں بیٹھ کر اہل

انگریز دَور کی کنگز لائبریری۔ پارسک باغ۔ اب کچھ نہیں

علم کتابوں سے اپنی پیاس بجھاتے، رات گئے تک یہ علمی ادبی محفلیں جاری رہتیں، مکالمہ ہوتا، بحثیں ہوتیں اور دلیل کو ثبوت اور دلیل کے ساتھ رد کیا جاتا۔ نئی جہتیں تلاش کی جاتیں۔ بڑے شہروں کی ایسی مجلسوں نے نام کمایا، چند ایک نے تو دوام کمایا اور قیام پاکستان سے قبل سے لے کر آج تک بھی وہ قائم ہیں۔ مگر بدقسمتی سے چھوٹے شہر ایسی ناموری سے تو محروم رہے۔ مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ چھوٹے شہروں میں ایسی محفلیں یا ادبی لوگ نہیں تھے۔

ہمارے شہر گجرات میں بھی ایسی کئی دکانیں اور علم پرور لوگ موجود تھے۔ گجرات میں 1947 سے پہلے کی بک شاپس کی بات کی جائے تو زیادہ تر دکانیں اندرون شاہدولہ گیٹ سے 'کھاری کھوئی' تک تھیں۔ جن میں ایک مشہور نام 'کتاب گھر' تھا. جو محلہ غریب پورہ چوک میں واقع تھا۔ جہاں مختلف علوم وفنون کی ہندوستان بھر سے شائع ہونے والی کتابیں دستیاب ہوتی تھیں۔

اہل گجرات کو کتب سے روشناس کرنے میں ایک اہم کردار اور نام اردو کتاب محل کا بھی آتا ہے قبل از تقسیم سے قائم اردو کتاب محل لکھاریوں ادیبوں اور شاعروں کی محفلوں اور بیٹھکوں کا مرکز تھا۔ جو شام کو اس قدر پر رونق ہو جاتا کہ معروف سیاستدان چوہدری ظہور الٰہی بھی اہل قلم وقرطاس سے ملنے اکثر وہاں چلے جاتے۔ قدیم کتب بینوں کی بہترین خدمت کرنے میں فیاض بک ڈپو، واقع مسلم بازار نزد شیشا نوالہ دروازہ نے بھی اہم کردار ادا کیا اور قیام پاکستان سے ماضی قریب تک نصابی وغیر نصابی کتب کی فراہمی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔

ابن خلدون نے تو قوموں کے بارے میں یہ کہا تھا کہ وہ ابتدا، نشونما اور عروج وزوال کے ادوار سے گزرتی ہیں مگر میرا ماننا یہ ہے کہ اس کلیے کو اگر انفرادی یا شخصی حوالے سے دیکھا جائے تو بھی ایسا ہی کچھ نظر آتا ہے۔ جیسے کہ متحدہ ہندوستان میں تعینات سیشن جج سید رفاقت حسین شاہ صاحب جن کا تعلق گجرات سے تھا۔ ان کے انگریزی ادب اور فلسفے سے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ پاکٹ سائز کتاب ہمہ وقت ساتھ رکھتے تھے۔ جب اور جہاں فرصت ملتی، مطالعے میں منہمک ہو جاتے۔ ان کے پاس کتب کا ایک تاریخی ذخیرہ موجود تھا۔ ان کی رحلت کے بعد ان کے بیٹے پیر سید غلام عباس نے ان کی خواہش کے مطابق ہزاروں کتب پہ مشتمل نایاب علمی وادبی ذخیرے کو موجودہ سرور گولڈ پلازہ کے بالمقابل ایک عمارت میں منتقل کر کے انھیں کتاب خانہ کی صورت میں تبدیل کر دیا، جو دہائیوں تک علم و ادب کی پیاسوں کی ساقی گیری کرتا رہا۔ البتہ اس علم وادب کے رسیا خاندان کی تیسری پیڑھی نے اس انمول خزانے کو کباڑی کے ہاتھوں بیچ کر ابن خلدون کے قول کو انجام تک پہنچا دیا۔ یوں علم وادب کے اس وسیع ذخیرے کو حرص وہوس نے نگل لیا۔ ممتاز قانون دان اور المیر ٹرسٹ لائبریری کے بانی عارف علی میر صاحب نے کف افسوس ملتے ہوئے بتایا کہ ان سے متعدد بار درخواست کی گئی تھی کہ یہ انمول خزانہ زمیندارہ لائبریری کے حوالے کر دیں مگر افسوس۔

اس کے علاوہ تمبل بازار میں مذہبی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ شیخ شفقت اللہ صاحب کے پاس بھی ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ بلدیہ گجرات کی دکانوں میں ملک بک ڈپو جو ملک عبدالسلام اور ملک یوسف صاحب کی ملکیت تھا، طویل عرصے تک عاشقین کتب کی پیاس بجھاتا رہا۔

رام طلائی روڈ پہ ماسٹر غلام حسین شوق صاحب کی بہت بڑی دکان تھی، جہاں نصابی غیر نصابی کتب کا وسیع ذخیرہ موجود تھا۔ اسی طرح قدیم گجرات کے انتہائی مغرب میں واقع ریلوے روڈ پر سرسید والی گلی میں 1946 سے کتابوں کی دکانیں ہیں، جن میں آصف بک ڈپو اور مطلوب بک ڈپو وغیرہ اسی عہد کی یاد تازہ کرتی ہیں۔ مزید یہ کہ شیخ رحیم صاحب کا کنڈہ کتابوں کی ایک معروف جگہ تھی، جہاں کنڈے کے ساتھ انھوں نے پرانی و سستی کتابوں کا سٹال رکھا ہوتا تھا۔ جو غریب اور تنگدست عشاق کی پہنچ میں تھا۔ شیخ رحیم خود تو ایک معذور انسان تھے مگر کتابوں کے رسیا، بہت خوش پوش اور زندہ دل انسان تھے۔

گجرات کے اکبری قلعے کے باہر کابلی گیٹ کے پاس ایک تالاب ہوتا تھا جو کسی ہندو کی ملکیت تھا اس جگہ پہ بھٹو دور میں نیشنل سنٹر بنایا گیا جہاں کتابیں بھی تھیں اور کتابوں سے جڑے رہنے والے لوگ بھی بیٹھتے تھے۔ مگر اب دونوں چیزوں کا وجود ہی ندارد ہے۔ احمد حسین قریشی قلعہ داری گجرات کی ایک معروف علمی وادبی شخصیت تھے ان کی لائبریری مخطوطات ومسودات کا ایک ضخیم ذخیرہ تھی۔ ان کی لائبریری میں مغل عہد کے نسخے بھی موجود ہوتے تھے۔

انگریز عہد سے ہم سو اختلافات کر سکتے ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ انھوں نے مغل عہد سے کہیں بڑھ کر ہندوستان کو عمارات بخشیں، ایسی ہی ایک بلڈنگ گجرات میں کنگز لائبریری کی بھی تھی جس کے ساتھ پارسک باغ بھی تھا مگر افسوس جہاں باغ کے نام پہ ایک چھوٹا سا قطعہ تو موجود

آج کے کتاب گھر۔ گجرات بکس۔ اشفاق بک ڈپو۔ آکسفورڈ بکس۔ البدر کتاب گھر۔ منور بک ڈپو

ہے مگر لائبریری یا کسی بک شاپ نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔

کھلی کتاب کے صفحے اُلٹتے رہتے ہیں
ہوا چلے نہ چلے دن پلٹتے رہتے ہیں

ایسے ہی گزرتے دنوں کے ساتھ کتابوں کے صفحات پلٹنے والے لوگ بھی پلٹتے اور بدلتے گئے اور ان دکانوں کے مالکان نے یہ عمارتیں بھی گرا دیں ان کی جگہ بڑے مالز بن گئے۔ جہاں کپڑے جوتے اور پیزا برگر ہٹس بن چکے ہیں۔ علمی، ادبی تھڑوں کی ریت تو جانے کیا ہوئی، کتابوں کی دکانیں بھی سمٹ کر صرف نصاب کے مواد تک آ چکی ہیں۔ بلکہ ان میں سے بھی زیادہ تر ای بک کی شکل اختیار کر کے ابدی نیند سلا دی گئی ہیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم اپنے ہاتھوں اپنی آنے والی نسلوں کو کتاب کی اس سوندھی سوندھی سی خوشبو محروم کر رہے ہیں وہ اس سے کبھی آشنا ہی نہیں ہوں گے۔

مگر مایوسی کی بات نہیں ان حالات میں بھی چند ایسے لوگ ہیں جو علم کی

گجرات میں کتب خانے

شمع روشن کیے بیٹھے ہیں اور ہمارے طلباء ہماری امید کی ڈوری پکڑے ہوئے ہیں ۔صبح صبح اور رات گئے تک کتابوں کی دکانوں پہ رش اس بات کا آئینہ دار ہے کہ کتب بیچی بھی جا رہی اور خریدی بھی جا رہی ہیں اگر چہ ان کے مہنگا ہونے کا شکوہ ہر کسی کی زباں پہ ہے " ۔آجکل گجرات شہر میں کتابوں کے بڑے بڑے مراکز میں سب سے پہلے ذکر کروں گی بارہ دری روڈ پہ گجرات بکس کا، جو دو منزلہ عمارت ہے اور وہاں انگنت کتابیں ہیں ۔اس کے بعد بھمبر روڈ پہ گجرات کے بہت معروف بج ڈپوز میں اشفاق بک ڈپو، آکسفورڈ بکس اینڈ بکس ہیں۔ جلالپور روڈ پہ البدر کتاب گھر اور سبزی منڈی روڈ پہ مسٹر بکس کے نام پہ ایک بڑا بک سٹور ہے۔ اسی طرح گجرات کے اکلوتے سٹیڈیم کے اندر منور بک ڈپو اور فوارہ چوک کالج کے آس پاس سعید بک ڈپو، رام پیاری ہاسٹل کے بالمقابل مکتبہ المدینہ اور مسلم آباد میں خان بک ڈپو واقع ہیں ۔ چوک پاکستان میں قمر بک سینٹر ، بلال بک گجرات وغیرہ طالب علموں کی ضروریات پوری کر دیے ہیں۔اس کے علاوہ بے شمار چھوٹی موٹی بک شاپس ہیں جو شہریان گجرات کی ہی نہیں آس پاس کے اہل دیہہ کی ضروریات بھی پوری کر رہی ہیں۔

حکیم الامت نے بالکل بجا فرمایا تھا کہ

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

خالق کائنات نے ہر چیز کا ایک دور حیات متعین کیا ہے۔کاغذ بنالینا انسان کی ایک بہت بڑی کامیابی تھی مگر اب اس کا دور اختتام کو پہنچ رہا اور اس کا متبادل ای بک کی صورت میں ظہور پزیر ہو رہا ہے۔یعنی کتاب کا وجود رہے گا، کاغذ کی صورت نہ بھی ہوا تو کمپیوٹر اور موبائلز کے سٹورتج میں ہوگا مگر قابل فکر پہلو یہ ہے کہ وہاں سے کتاب ڈھونڈ کر پڑھنے سے پہلے بھی انسان کو پڑھنا ہوگا۔

پروفیسر کلیم احسان بٹ۔
علم ودانش کا استعارہ

انسان کی خوش نصیبی ہے کہ ہر دور چاہے وہ پر فتن ہوا ہو یا پر امن، کتاب کے داعی ہر عہد میں اپنی دھن میں لگے رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہی لوگ معاشرے میں اعتدال اور ٹھہراؤ لاتے ہیں ، دنیا کو معاشرے کا خوبصورت چہرہ دکھاتے ہیں ۔ایسی ہی ایک شخصیت کا میں ذکر کرنا چاہوں گی وہ ہیں پروفیسر کلیم احسان بٹ صاحب،علم ودانش کا یہ استعارہ ، مردم خیز دھرتی جلالپور ضلع گجرات کا ہونہار سپوت ہے ۔ساٹھ کی دہائی میں جنم لیا، مقامی تعلیم اس عہد کے تقاضوں کے مطابق مدرسے سے لی پھر زمیندارہ کالج گجرات تشریف لے آئے ۔مطالعے سے لگاؤ والدہ کی طرف سے ملا ۔ آجکل آپ جلالپور جٹاں کے گورنمنٹ عبدالحق اسلامیہ ایسوسی ایٹ کالج میں بطور پرنسپل خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے آپ راولپنڈی اور گجرات کے زمیندار کالج میں بھی خدمات سر انجام دے چکے ہیں۔آپ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے والے دنیا بھر میں علم وفن کے پرچار میں مصروف عمل ہیں ۔آپ استاد ہونے کے ساتھ ساتھ معروف شاعر ، نقاد، نثر نگار اور محقق بھی ہیں۔آپ نے ادبی خدمات کی ابتدا تحقیق سے کی اور گجرات میں چار سو چوالیس سالوں پہ محیط اردو شاعری پہ مشتمل کتاب بعنوان 'گجرات میں اردو شاعری' لکھ ڈالی۔ جو بلاشبہ گجرات کی ادبی تاریخ میں ایک گرانقدر کاوش ہے جیسے صدیوں یاد رکھا جائے گا۔آپ کا شمار ان معدودے چند اہل فکر و دانش میں ہوتا ہے جو کسی جذبے اور ستائش کی پرواہ کیے بغیر تخلیق و تحقیق میں سرگرداں رہتے ہیں۔آپ نے تخلیقات کا آغاز بچپن سے ہی کر دیا تھا۔ بقول آپ کے آپ رئیس امروہوی سے قلمی طور پہ اصلاح لیا کرتے تھے۔آپ کی شاعری کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔جن میں ۔موسم گلی حیران ہے ۔چلو جگنو پکڑتے ہیں۔'حیرت باقی' ۔'کارزیاں'۔'پس دیوار آئینہ'۔'خدوخال خاک ہوئے' شامل ہیں۔

بطور شاعر آپ نے اپنے کلام میں ظلم ، بربریت اور جبر واستعداد کا کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔آپ ایک ایسے معاشرے کے خواہاں ہیں جہاں امن ، خواب اور مساوات کا راج ہو۔یہی وجہ ہے کہ شریف کنجاہی صاحب نے آپ کو''خواب اور یاد کا شاعر'' قرار دیا ہے۔آپ لکھتے ہیں۔

جس کے دیکھے تھے خواب آنکھوں نے
اس نے آنکھوں سے نیند بھی لے لی
ہر طرف رات ہو گئی جیسے
ایک سورج کی آنکھ لگتے ہی
اس کو چھوتے ہی میرے پوروں سے
دھوپ سارے بدن میں پھیلے گی

آپ ایک اور جگہ اس طرح سے ہمکلام ہوتے ہیں کہ اندر کا سارا دکھ عیاں ہوتا ہوا نظر آتا ہے

میری آنکھوں میں آج آنسو ہیں
میرے ہاتھوں میں آج بخشش تھی
میرے دشمن شکست کیا دیں گے
اس میں دوستوں کی سازش تھی
(بحوالہ کتاب ''آو جگنو پکڑتے ہیں)"

مقالات کلیم اور تفہیم و تحسین " کے نام سے تنقیدی و تحقیقی مضامین پر مشتمل دو کتب چھپ چکی ہیں ۔شاعری ، تحقیق وتنقید کے بعد آپ نے سوانح نگاری میں بھی بھی قدم رکھا ہے اور اپنی والدہ کی محبت کو موضوع بناتے ہوئے " ماں بیتی " کے عنوان سے والدہ کی سوانح عمری بھی لکھی ہے ۔اس کے علاوہ ''ابر رحمت " اول اور" ابر رحمت " دوم کے نام سے شیخ غلام محی الدین جو ایک نامور بزرگ تھے ، ان کی کتب کی تدوین کی۔آپ کی سیلانی طبیعت نے اس پر ہی اکتفا نہی کرنے دیا بلکہ آپ نے آگے بڑھتے ہوئے غالب سے اپنے عشق کا ثبوت اس طرح دیا ہے کہ آپ نے ''غالب سرائی" کے نام سے غالب پر لکھی منظومات کو مرتب کیا ہے۔آپ کی یہ تحقیقی کاوش بلاشبہ غالب جیسے عہد ساز شاعر کا اعتراف فن ہی نہیں بلکہ یہ کتاب غالب فہمی میں عاشقان غالب کے راستے مزید آسان کرے گی ۔آپ کی کاوشوں پر ایم اور کئی دوسری یونیورسٹیوں میں ایم اور ایم فل سطح کے مقالے لکھا جانا آپ کی علمی ادبی تحقیقات و تخلیقات کی پذیرائی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

آپ درویش صفت انسان ہیں ۔دنیاوی علمی و ادبی بکھیڑوں میں نہیں پڑتے بلکہ ان سے دور اپنے کنج دانش میں محو خالق کائنات کی تخلیقات میں غور کرتے اور اپنے خیالات کو لفظوں میں پرو کر ہمارے سامنے رکھتے ہیں ۔اللہ پاک انھیں ان کاوشوں میں کامیاب و کامران کرے آمین

اختتام کرتی ہوں پروفیسر کلیم احسان بٹ صاحب کے ان دو اشعار کے ساتھ

اس نے سجدے میں سر کٹا ڈالا
حق ادا کر دیا امامت کا
میرے شانوں پہ سر نہیں ہے کلیم
بوجھ ہے بس میری ندامت کا
بحوالہ کتاب " ، حیرت باقی رہ جاتی ہے "۔

❀❀❀

مسعود جھنڈیر ریسرچ لائبریری۔ ایشیا کی سب سے بڑی نجی لائبریری

تحریر: محمد طارق جمال فریدی

قلم اور کتاب کی دوستی صرف محاوراتی ہی نہیں بلکہ حقیقی اور عملی زندگی میں بھی ہے۔ چاہے یہ تدریسی عمل میں ہو یا پھر وقت گزاری ہو۔

محسن بکس اور میلسی کتاب گھر ابھی کتابوں سے محبت قائم کیے ہوئے

اس کے علاوہ ان کی دوستی اس کتاب گھر میں بھی ہے جدھر اس کی فروخت کا عمل جاری رہتا ہے۔ کتاب کی جگہ چونکہ اب جدید دور کے موبائل اور کمپیوٹر نے لے لی ہے۔ پھر بھی اس کی فروخت مختلف جگہوں پر ہو رہی ہے اور ہوتی رہے گی

اب اگر کتب کی فروخت اور اس دور کی ضرورت کو مدنظر رکھا جائے تو کتب اب بک سٹالز پر یا فٹ پاتھ پر ملتی ہے۔ جب کہ زندگی کی باقی ترجیحات اونچے اور شیشے کے بنے مالز میں ملتی ہیں۔

میرا شہر میلسی جو ایک قدیمی شہر ہے۔ تین سو عیسوی کے قریب آباد ہونے والے اس شہر کا ذکر اطراف کے شہر نمبر میں کیا جا چکا ہے۔ اس شہر میں موجود "مسعود جھنڈیر ریسرچ لائبریری" جو جنوبی ایشیاء کی سب سے بڑی نجی لائبریری ہے۔ اس سے ہزاروں سکالرز ہر سال مستفید ہوتے ہیں۔ اس شہر کے کتاب گھر یا کتب خانوں کی بات کی جائے تو ان میں بہت سے مشہور نام ہیں جن میں سے کچھ اب بند ہو گئے اور کچھ ترقی کرنے کے لیے اپنی ترجیحات کو بدل رہے ہیں۔ ان میں سب سے قدیمی کتب خانہ

پرانی کتابوں کی دکانیں۔ انوار اولڈ بک۔ ملتان اولڈ بک سینٹر۔ پاکستان اولڈ بک

"ارشد کتاب گھر" اب جنرل سٹور بن گیا ہے یہ شہر کے سب سے پرانے بازار میں اب بھی موجود ہے۔ دوسرے نمبر پر "عبدالرزاق بک سیلر" کے نام سے تھا پر یہ اب ختم ہو گیا ہے۔ تیسرے نمبر پر "نعیم کتاب گھر" ہے یہ بھی اپنی جگہ تبدیل کر گیا ہے

میلسی میں کتاب خانے اور اہلِ قلم

ان کا مشہور کتب کے علاوہ عینک کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی دکانیں بنیں اور ختم ہوئی جن میں مسٹر بکس، ضیاء بکس، اختر کتاب گھر ان کے علاوہ اور کچھ چھوٹی دکانیں جو اپنا کام چھوڑ کر دیگر شعبوں میں مصروف ہیں۔

موجودہ کتاب گھروں میں سب سے بڑا نام محسن بکس اور میلسی کتاب گھر ہے، ان کے ساتھ ساتھ نعیم بکس، ہنی بکس، حسنین بکس، ممتاز بکس اور خان بکس وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ ایک نام ریاض بک سیلر جو ہول سیل ڈیلر بھی ہے۔ ان سب کی ترجیحات صرف کتابیں، کاپیاں اور قلم نہی رہی بلکہ اب سپورٹس کا سامان، یونیفارم/ وردیاں، بیگ، تحائف، کھلونے اور کچھ میں کاسمیٹکس بھی شامل ہے۔ وقت کی ضروریات اور نفع کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ سب دکانیں اب کتابوں سے زیادہ ان کو ترجیح دے رہے ہیں۔

اس مہنگائی کے دور میں کتاب لینا ہر کسی کی دسترس میں نہیں ہے۔ اس کے لیے اولڈ بک سینٹرز بھی قائم ہوگئے ہیں۔ جو استعمال شدہ کتابوں کی خرید وفروخت کرتے ہیں۔ ان دکانوں پر وہ کتابیں بھی دستیاب ہیں جو بڑے اور نئے کتاب گھروں میں بھی نہیں ملتیں۔

ان میں مشہور نام " انوار اولڈ بکس، ملتان اولڈ بک سینٹر، پاکستان اولڈ بکس " جو ہمارے شہر میں موجود ہیں۔ اب قریباً تمام دکانیں اور سکول، کالج، دکانیں ایک ہی علاقہ میں ہیں۔ اس لیے تمام تعلیمی ضروریات اور سہولیات کا مرکز بھی ایک ہے۔

حکومتی سطح پر شائع ہونے والی کتب کے علاوہ ہر پرائیویٹ/نجی ادارہ اپنے نام اور اپنا پبلشر شائع کرواتے ہیں اور اس کا ٹھیکہ مختلف دکانوں کو دے کر اپنی جیب بھرتے ہیں جن کا بوجھ طلبا کے والدین پر پڑتا ہے۔

میلسی کے صاحب کتاب ادیب:

میلسی شہر میں بہت سے ادیب مختلف اصناف میں اپنا نام روشن کر چکے ہیں۔ جن کا مختصر ذکر شہر نمبر کے مضمون میں کیا جا چکا ہے۔ بہت سے نام پرانے اور نئے ہیں جن میں سے کچھ کا تعارف پیش کیے دیتا ہوں۔ مرزا خورشید بیگ میلسوی ایک شاعر اور کالم نگار تھے۔ ان کی بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، اور ان پر مکالہ جات بھی لکھے گئے اور اب بھی بہت سے سکالرز لکھ رہے ہیں۔ مرید عباس خاور جن کا تعلق نواحی گاؤں خان پور سے ہے ان کی شاعری کی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ان کے دو صاحبزادے محسن اور یاسر بھی اردو سکالر ہیں۔ پروفیسر شفیق الرحمٰن الہ آبادی گورنمنٹ کالج میلسی میں اپنا تدریسی کام

> **مرزا خورشید بیگ میلسوی۔ مرید عباس خاور۔ پروفیسر شفیق الرحمٰن۔ افضل تحسین یزدانی۔ شاہد حفیظ۔ میلسی کے ادبی ستارے**

سرانجام دے رہے ہیں، شفیق صاحب نقاد ہیں ان کی اس صنف میں کتابیں شائع ہوئی ہیں اور ان کی کتب اور ان کی زندگی پر اسکالر اپنے مقالے لکھ چکے ہیں۔ افضل تحسین یزدانی صاحب میلسی کے مشہور شاعر اور نثر نگار صاحب کتاب بھی ہیں۔ یہ بھی اسکول ایجوکیشن میں مختلف عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ اب یزدانی صاحب گورنمنٹ ہائی سکول کے پرنسپل ہیں۔ اس سے پہلے ڈپٹی ڈی ای او بھی تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مظہر حسین مظہر صاحب ایس ایس ہیں۔ بہت اچھے شاعر ہیں ان کا نعتیہ مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔ شہزاد راؤ نجی کالج کے پروفیسر ہیں۔ ان کی شاعری کی دو کتب ہیں۔ پرفیسر شاہد حفیظ صاحب سکول کے استاد رہے اب گورنمنٹ کالج میلسی میں لیکچرار ہیں۔ انہوں نے بچوں کے لیے بہت سے اخبارات اور رسائل میں لکھا اب بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کی اب تک دو کتب شائع ہوئی ہیں۔ جن میں بچوں کے لیے مٹی کی محبت اور ایک تحقیقی کتاب 'نثر زبان معانی' کے نام سے ہے۔ یہ پی ایچ ڈی سکالر بھی ہیں۔ ان کے سسر الطاف بسمل کی بھی شاعری کی کتابیں شائع ہوئی ان پر مقالے بھی لکھے گئے۔ ❁

لاہور میں کتابوں کی دکانیں

دکانیں جہاں کتابیں پڑھیں۔کافی نوش کریں

تحریر: عطرت بتول، لاہور

لاہور میں ڈیفنس کے علاقے میں ایک شاندار بک شاپ، ،ریڈنگز، ، (Readings) کے نام سے موجود ہے جس میں اردو ادب اور شاعری کے علاوہ تاریخ اور مختلف موضوعات پر کتب موجود ہیں قدیم وجدید لکھنے والوں کی کتب کے علاوہ نصاب کی کتب کا علیحدہ حصہ ہے یہ خوبصورت دکان ہے جس میں ایک گوشہ ایسا ہے جہاں کتابیں خریدنے کے ساتھ ساتھ بیٹھ کر پڑھ بھی سکتے ہیں اور چائے کافی سے لطف اندوز بھی ہو سکتے ہیں، یہاں وزٹ کے دوران ہم نے کتب خریدنے والوں کی کافی تعداد دیکھی۔

لاہور میں انارکلی بازار، سیکرٹریٹ کے اطراف میں، بہت عرصے سے تھڑوں اور فٹ پاتھ پر کتابیں فروخت کی جاتی ہیں اتوار کو خاص طور پر فٹ پاتھ پر کتابیں بچھانے گاہکوں کے منتظر کتابیں بیچنے والے کبھی

کتابوں کی مشہور دکانوں کی جگہ جوتوں کی دکانیں بھی

بھی مایوس نہیں ہوتے، ریسرچ کرنے کے لیے متعلقہ کتابیں تلاش کرنے والے طلباء، ادبی، سیاسی، سماجی موضوعات پر بہترین اردو اور انگریزی کی کتابیں پڑھنے کے شوقین حضرات سستی کتابیں خریدنے کے لیے اس جگہ کا رخ کرتے ہیں، یہاں بعض اوقات نایاب اور اعلیٰ کتب بھی مل جاتی ہیں اور ایسی کتب بھی جو مصنفین نے اپنے دستخط کے ساتھ عطا کی ہوتی ہیں، نصف قیمت پر ملنے کی وجہ سے یہاں ہمیشہ خریدنے والے کتابیں کھنگالتے نظر آتے ہیں۔

اردو بازار:

لاہور میں اردو بازار کتابوں کا مشہور بازار ہے جہاں کتابوں کی بہت سی دکانیں ہیں اردو ادب، شاعری، مذہبی، سیاسی، تاریخ یعنی ہر قسم کی کتب یہاں سے خریدی جاتی ہیں۔

کورس کی کتابیں بچوں کے ادب پر کتابیں بھی یہاں موجود ہوتی ہیں اور اردو بازار میں کتابوں کی دکانوں پر رش ہوتا ہے۔

ماورا

لاہور میں ماورا بھی ایک مشہور پبلشنگ ہاوس ہے جس کے مالک مشہور شاعر خالد شریف ہیں انہوں نے مشہور ادیبوں اور شاعروں کی کتب چھاپی ہیں، مال روڈ لاہور میں یہ ایک بڑا شوروم ہے جہاں سے کتابیں خرید سکتے ہیں۔

لاہور میں لبرٹی بکس، اولڈ بکس ہاؤس انارکلی اور کئی اور کتابوں کی دکانیں کامیابی سے چل رہی ہیں کتابیں خریدنے والے ان دکانوں پر موجود رہتے ہیں۔

کتابوں کی وہ دکانیں جو بند ہو چکی ہیں

فیروزسنز

کتابوں کی قدیم اور مشہور دکان فیروز سنز جس سے سینئر ادیبوں کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں بند ہو چکی ہے لوگ ابھی تک اس کا نام نہیں بھولے۔

کلاسیک

لاہور میں کسی زمانے میں کلاسیک کے نام سے کتابوں کی مشہور دکان تھی جس کے مالک آغا امیر علی تھے سینئر ادیبوں اور شاعروں کا یہاں آنا جانا تھا یہ بھی اب قصہ پارینہ ہوا۔

لاہور میں آئیڈیل بک سٹور، امپیریل بک سٹور، مرزا بک ایجنسی کے نام سے کتابوں کی دکانیں تھیں جو اب بند ہو چکی ہیں ان کی جگہ اب کھانے پینے کی یا جوتوں کی دکانیں کھل گئی ہیں۔ ❁

ڈیرہ غازی خان میں کتابیں

دنیا پر سب سے زیادہ حکومت کتابوں نے کی

تحریر: حرا خان، ڈی جی خان

کرن شبیر کے چاچا کی لائبریری

کتابیں ایک انسان خصوصاً ایک مسلمان کی زندگی کا بہت اہم حصہ رہی ہیں اور ہمیشہ رہیں گی، کتابیں تفریح ہیں سنگی ہیں یہ ہدایت کی رسی بھی ہیں، کتابوں کا ایک بلند درجہ ازل سے رہا ہے یہ پیغمبروں پر اتاری گئی ہیں یہ لوح محفوظ میں سے لائی گئی ہیں یہ مندروں میں گنگنائی گئی ہیں یہ گرجوں میں سنبھالی گئی ہیں یہ محربوں کے نیچے اٹھائی گئی ہیں یہ طاقچوں پہ سجائی گئی ہیں۔ یہ تحقیق کے پیمانے سے گزری ہیں یہ علم کے خزانے کی کنجی ہیں یہ وقت کے سفر کا دریچہ ہیں یہ عظمت پانے کا ایک وظیفہ ہیں، ایک مفکر کا قول ہے کہ پوری دنیا پر زیادہ حکومت کتابوں نے کی ہے۔ کتابوں کا ایسا رعب رہا ہے کہ دلوں کو جکڑ لیتی ہیں یہی وجہ ہے کہ جنگ کے دوران کتابوں پر قبضہ خزانوں سے بھی پہلے کیا جاتا تھا۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کا میری زندگی میں دخل نہ ہو؟ آج کل یا یوں کہوں کچھ سالوں سے جو کتاب میرے زیرِ مطالعہ ہے وہ 'عرش معلیٰ' سے لاکھوں فرشتوں کے زیر نگرانی خاص طور پر ہمارے لیے رب عرش کی طرف سے بھیجی گئی تھی جسے کچھ لوگ رب کا ہمیں بھیجا جانے والا ذاتی خط بھی کہتے ہیں۔ یہ سفر استاد نعمان علی خان کے کورس 'آخری معجزہ' سے زیادہ مضبوط ہوا جو انہوں نے اسلام آباد میں بنفس نفیس آ کر کیا تھا فروری میں جبکہ بعد میں یوٹیوب پر بھی اپلوڈ کر دیا گیا تھا، اللہ کی ذات کی پہچان اور قرآن کے الہامی ہونے کے دلائل جو میرے رب نے

> **اخبار رسائل کی ایجنسیاں**
> **تو بند ہو رہی ہیں، مگر**
> **کچھ کتاب گھر ابھی موجود ہیں**

بذات خود اپنی ہی کتاب میں دیے ہیں وہ ذہن اور دل پر لگے تالوں کو ایک ایک کر کے کھولتے چلے جاتے ہیں اور اختتام پر جب آپ ایک گہری سانس ہوا کے سپرد کرتے ہیں تو یوں لگتا ہے تمام زنجیریں ٹوٹ کر کہیں بکھر گئی ہیں اور آپ کئی سالوں میں پہلی بار آزاد ہوئے ہیں اس کورس کا کتابی ورژن انگریزی میں Divine Speech by Nouman Ali Khan کے نام سے موجود ہے جس کے کل اکیس باب ہیں اور یہ کتاب قرآن کے حوالے سے ہر اس سوال کا جواب دیتی ہے جو عقلِ انسانی نے قرآن کی غلطیاں قرار دے کر خود پہ اور اپنے علم و حکمت پر ناز کیا تھا لیکن وہ رب جو ساتوں آسمانوں کو اور ارض کو بنانے والا، دن اور رات کو ایک ترتیب آگے پیچھے گزارنے والا، کہکشاؤں، چاند، تاروں اور سورج کو مرتب انداز سے چلانے والا کیا اس کے بلند درجہ کے کلام میں کوئی کسر ہو سکتی ہے۔۔۔؟

بہت وقت کے بعد اندازہ ہوا لفظوں سے محبت تو جیسے میری روح کی غذا ہو جب تک نہیں ملتی تب تک بے کلی سی رہتی ہے یہ اور بات ہے کہ ٹیکنالوجی نے آپ کی زندگی کے کمرے میں اس قدر کھڑکیاں کھول دی ہیں کہ کتابیں اب الماریوں کی زینت بن کر رہ گئی ہیں اور یہی تشنگی آج کل مجھے بہت بے چین رکھتی ہے۔ بچپن کے وہ دن یاد آتے ہیں جب گرمیوں کی دوپہروں میں اور سردیوں کی راتوں میں ایک کے بعد دوسری کتاب پڑھی جاتی تھی اور ایسی تڑپ ہوتی تھی کہ ایک کتاب ابھی ختم نہیں ہوئی ہوتی تھی اور دوسری کا انتظام پہلے سے کیا جاتا تھا۔

انہی دنوں کے یادوں کے پنوں پر وہ شخصیت بھی ہے جنہیں میں نے سب سے پہلے کتابوں کے عشق میں پور پور ڈوبا دیکھا "کرن شبیر" میری خالہ زاد کزن، جہاں کہیں بھی آپ کو کتاب نظر آتی ارد گرد ان کی موجودگی نہ ہو یہ ممکن ہی نہیں تھا عمرو عیار کے قصوں سے بچوں کا اسلام، نونہال اور الف لیلوی کہانیاں تو بہت بچپن سے ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھیں چچا کی لائبریری نے محبت کو دو آتشہ کیا، اور یہ سفر پبلک سے پرائیویٹ لائبریریوں اور پھر بک بینکس کے زیر سایہ نمو پانے لگا ایک ایک وقت میں چار چار جگہوں کی ممبر شپ تھی 'ایک کتاب، ایک دن' اسی فارمولے پہ ڈگر تھی۔ کتابیں ان کے لیے آکسیجن تھیں اور پھر ٹیکنالوجی نے ہاتھ میں موجود ڈبہ میں ہر کتاب لا کر دسترس میں رکھ دی لیکن ساتھ ہی ساتھ وقت گلوبلائزیشن کے سپرد کر دیا اور بہت کتاب دوستوں کو فیس بک، انسٹاگرام اور یوٹیوب وغیرہ کے وینٹیلیٹر پر منتقل کر دیا گیا آکسیجن تو اب بھی مل رہی ہے لیکن مصنوعی۔۔۔!

میرا شہر اور اس میں موجود کتب خانہ اور کتاب گھر بھی کسی نہ کسی حد تک اس کی زد میں آ گئے ہیں پہلے ایجنسیاں ہوا کرتی تھیں جہاں اخبارات رسائل اور کتابیں ملا کرتی تھیں جو کچھ تو بند ہو گئی ہیں اور کچھ اس دوڑ میں اب بھی شامل ہیں۔ ڈیرہ غازی خان بدقسمتی سے اس سفر میں تنزلی کا شکار ہو گیا ہے اب کتاب دوست لوگ شاذ شاذ ہی نظر آتے ہیں پرائیوٹ چھوٹے چھوٹے بک سٹال بند ہو چکے ہیں عام کتاب گھروں میں سے بھی صرف دو کتاب گھر مکتبہ زکریا اور پاکستان بک اسٹال ایسے ہیں جہاں سے چیدہ چیدہ مشہور کتب دستیاب ہو سکتی ہیں اگر موجود نہ ہو تو مکتبہ زکریا آپ کو منگوا دینے کی سہولت دیتا ہے پورے شہر میں صرف ایک اولڈ بک سٹور علی اولڈ بک سٹور ہے جہاں سے چند ادبی کتب برآمد کی جا سکتی ہیں وہ بھی آٹے میں نمک کے برابر۔۔۔! جبکہ خواتین کے رسائل اور ناول اب بھی مل جاتے ہیں رانی بازار کے سٹال سے، کلمہ چوک سے اور ٹریفک چوک کی ایک عادا ایجنسی سے۔ ایک وقت تھا جب ٹریفک چوک پر چار پانچ ایجنسیاں ایک قطار میں ہوا کرتی تھیں جبکہ اب صرف دو ہی رہ گئی ہیں۔ کتاب جس سے دوستی بڑھنی چاہیے تھی وہ جیسے تنہائی کا شکار ہو گئی ہیں۔ لائبریریوں میں رکھی کتابیں حسرت و آس لئے الماریوں سے دریچوں کو تکتی ہیں لیکن صرف گنتی کے ہی لوگ ہیں جو گرد جھاڑ کر ان کو سینوں سے لگاتے ہیں دلوں میں بساتے آنکھوں میں سجاتے ہیں روح میں اتارتے ہیں وہ لفظوں سے عشق نبھاتے ہیں اور بے آواز کہتے ہیں چلو کتابوں کو ایک بار پھر سے دوست بناتے ہیں اس دور اس ریت کو جگاتے ہیں جب کتابیں اثاثہ تھیں کل۔۔۔۔!!!

انسان اور کتاب کا رشتہ

انٹرنیٹ۔ کیبل۔ موبائل نے نوجوان کو تنہا کر دیا ہے

تحریر: صدام ساگر

دنیا میں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں کتابیں تخلیق ہوتی ہیں جب کہ ہزاروں کتابیں تدوین کی جاتی ہیں۔ کتابیں انسان کی دوست ہوتی ہیں جو انسان کی تنہائی میں بہترین معاون ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے زندگی میں بہت سی کتابیں پڑھی لیکن میری پسندیدہ کتاب ''قرآن مجید'' ہے۔ جس کے نزول سے مسلمانوں پر خیر و برکت کے سبھی

پرانی عدالت کے باہر ندیم بک اسٹال
40 سال سے پرانی کتابوں کا خزانہ

دروازے کھل گئے اس مقدس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے اُٹھایا۔ قرآن مجید کے علاوہ دنیا میں بہت سی اسلامی اور دیگر موضوعات پر مبنی کتب بھی ہمارے مطالعے کا حصہ ہیں۔ پروفیسر محمد حسن چگی لکھتے ہیں کہ ''ہر اچھی کتاب انسان کا دوست ہے ساری زندگی میں انسان اخلاقیات کو سنوارتی رہتی ہے کتاب زندہ ہے پڑھنے والے بھی زندہ ہیں۔'' میرے نزدیک کتابوں کا مطالعہ جہاں انسان کو مہذب بناتا ہے وہیں اس کی شخصیت میں نکھار اور وقار بھی عطا کرتا ہے۔ کتاب سے دوستی انسان کو شعور کی نئی منزلوں سے روشناس کرواتی ہے۔ اسی لئے کسی مفکر نے کیا خوب کہا ہے کہ ''اگر دو دن تک کسی کتاب کا مطالعہ نہ کیا جائے تو تیسرے دن گفتگو میں وہ شرینی باقی نہیں رہتی، یعنی اندازِ تکلم تبدیل ہو جاتا ہے۔'' اس بات کا مقصد یہ ہے کہ کتابوں کے مطالعے سے ہمیں ٹھوس دلائل دینے اور بات کرنے کا سلیقہ آتا ہے۔ آج کے دور میں جو بھی ترقی ہو رہی ہے وہ مرقوم علم اور کتابوں کی بنیاد پر کی جا رہی ہے۔ کتاب پڑھنے کے لئے صاحبِ کتاب ہونا لازمی نہیں علامہ اقبالؒ کے اس شعر کے مصداق:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

آج کے جدید دور میں اگرچہ مطالعے کے لئے نئے نئے ذرائع متعارف کروائے جا رہے ہیں اور پھر ٹیکنالوجی کے باعث علم کے حصول میں انقلاب برپا ہو چکا ہے مگر یہ کہنا غلط نہیں کہ کتابوں کی دائمی اہمیت اور افادیت اپنی جگہ قائم و دائم ہے اور اس میں مزید اضافہ ہو رہا ہے کہا جاتا ہے کہ انسان اور کتاب کا رشتہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود انسانی تہذیب و تمدن کا سفر اور علم و آگہی کی تاریخ قدیم ہے۔ اگر ہم ترقی یافتہ ممالک کی بات کریں تو وہاں آج انٹرنیٹ کے دور میں بھی کتابیں پڑھنے کے رجحان میں غیر معمولی کمی نہیں ہوئی۔ وہاں زیادہ تر گھروں میں کتابوں کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ کھائی دیتا ہے۔ مگر کچھ عرصے سے ہمارے معاشرے میں نوجوان کتابوں سے کوسوں دور ہوتے جا رہے ہیں جس کی وجہ انٹرنیٹ، کیبل، جدید موبائل وغیرہ ہیں۔ انہوں نے آج کے نوجوان کو بالکل تنہا کر دیا ہے۔ اس لئے ہمیں چاہیے نئی نسل کی نظر کتب بینی کی طرف متوجہ کروانے اور ان کی تسکینِ قلب کے لئے ہر محلے میں عوامی کتب خانے قائم کئے جائیں جہاں تمام موضوعات پر کتب موجود ہوں۔ اس حوالے سے ''قلم فاؤنڈیشن'' کے چیئرمین علامہ عبدالستار عاصم کے اشاعتی ادارے اور اُن کے تمام اراکین کی خدمات قابلِ ستائش ہیں کہ جنہوں نے پاکستان کے ہر شہر میں لائبریری کے قیام کا عزم کر رکھا ہے جس کے لئے وہ 101 کتب جن کی مالیت دو لاکھ روپے ہے انہیں تیس ہزار میں مہیا کر رہے ہیں۔

اسی طرح آدمی جب دلچسپ موضوعات پر کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اس کا دل یہ چاہتا ہے کہ کتاب کو ختم کر لیا جائے اور ہم صفحہ بہ صفحہ پلٹتے جاتے ہیں اور کب کتاب ختم ہوئی ہمیں اس بات کی خبر ہی نہیں ہوتی۔ دنیا کی کوئی بھی ایجاد کتاب کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے نونہالوں کو جو کل کے معمار ہیں، کتب بینی کا عادی بنائیں۔

کتاب کے مطالعے سے ہم بلند پایہ مصنفوں کے خیالات، عظیم شعرا کے کلام اور بزرگوں کے حالاتِ زندگی کے بارے میں آگہی حاصل کر سکتے ہیں جو ہمارے لئے علم کی لازوال دولت محفوظ کر گئے۔ ان ہستیوں نے دنیا کو اپنی آنکھوں سے نہ صرف دیکھا بلکہ اس دنیا کو پرکھا اور دنیا کی تلخیوں کے گھونٹ پیے، ملکوں ملکوں کی مسافرت طے کی، قوانین قدرت کا مطالعہ کیا اور پھر برسوں کے غور و فکر کے بعد فطرت کے سربستہ رازوں کو منکشف کیا اور اپنے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ کتابوں کی صورت میں ہمارے سامنے رکھا تاکہ ہم ان کے مشاہدات و تجربات سے مستفیض ہو سکیں۔

کتاب جتنی پُرانی اور بوسیدہ ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ مارکیٹ میں کتابوں کی قیمتیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ پہلے ایک کتاب کی قیمت دس روپے تھی اب ایک دو ہزار روپے ہے کمپیوٹر پرانا ہوتا ناکارہ ہو جاتا ہے لیکن کتاب جتنی

پرانی ہو گی اُتنی قیمتی ہو گی۔ گوجرانوالہ، لاہور کے اُردو بازاروں میں مجھے بہت سے پُرانی کتابوں کے سٹال پر جانے کا اتفاق ہُوا ہے جہاں فٹ پاتھ پر پڑی نایاب کتب کی قیمت آج کی نئی کتاب جتنی وصول کی جاتی ہے۔ گوجرانوالہ پرانی عدالت کے باہر ندیم بک سٹال چالیس سال سے پرانی کتابوں کا سٹال فٹ پاتھ پر لگا رہے ہیں۔ جہاں دیگر لکھاری کے کوچ کرنے کے بعد آنے والی نایاب کتب کو خریدتے اور پڑھتے وقت دل خون کے آنسو روتا ہے کہ جانے والوں نے اسے کس محبت اور نازوں سے سنبھال کر رکھا ہو گا اور اس کے لواحقین نے چند سکوں کے عوض سرمایہ کتب بیچ دیا۔

انسان اور کتاب کا رشتہ

کراچی میں ہر سال منعقد ہونے والے کتابی میلے میں ہزاروں کی تعداد میں شرکت ظاہر ہوتا کہ کتابوں کی اہمیت تو اپنی جگہ ہے کہ ٹیکنالوجی ہر روز نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔اس میلے میں نئے کتب کے سٹالز لگائے جاتے ہیں اور دنیا بھر سے کتاب سے محبت کرنے والے تشریف لاتے ہیں۔اسی طرح لاہور کے ایکسپو سنٹر میں تین روزہ کتاب میلے لگایا جاتا ہے جس میں مجھ خاکسار مقبول شاعر وسیم عالم مرحوم کے ہمراہ جانے کا موقع میسر آیا۔اس سے پہلے کی ہمارے وطن کی فضاؤں اور ہمارے ہاتھوں میں بارود کی بُو آئے ہمیں کتاب سے رشتہ جوڑ کر خود کو آنے والے وقت میں ثابت کرنا ہوگا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔کیوں کہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو محبت اور وفا کے بیج کتابوں کے مطالعہ سے بوتے ہیں اور اس سرزمین کو امن کا گہوارا بناتے ہوئے اس کی فضاؤں کو خوشبو دار بناتے ہیں تا کہ یہاں سب سکھ کا سانس لے سکیں۔آخر میں اپنے شہر کی ایک ایسی صاحبِ کتاب شخصیت جان کاشمیری کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو پاکستان کے ہر فرد کی جان مانے جاتے ہیں۔

گوجرانوالہ کے سخن ور انہیں گوجرانوالہ کے ادبی اکھاڑے کا رستمِ پاکستان پہلوان کے نام سے پکارتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں، ان کے ابتک حروفِ تہجی کی ترتیب سے چوبیس شعری مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ان کا شمار پاکستان کے اُستاد

جان کشمیری کے مطلع پر مشتمل
پانچ شعری مجموعے

الشعرا میں کیا جاتا ہے کچھ لوگ ان کی شاعرِ مزدور حضرتِ احسان دانشؔ سے مشابہت کرتے ہیں۔جان صاحب نے مطلع پر مشتمل پانچ شعری مجموعے لاکر ادب میں ایک منفرد ریکارڈ قائم کرلیا ہے۔کہتے ہیں کہ غزل کا مطلع کا یعنی پہلا شعر کمزور نہیں ہونا چاہیے، اس بات سے اندازہ لگالیں کہ جان صاحب کتنی سہولت کے ساتھ مطلع در مطلع کہتے چلے جاتے ہیں۔ان کی ادبی خدمات کا اعتراف حکومتِ وقت کو کرنا ہوگا۔آخر میں کتاب کے حوالے سے ان کی ایک نظم سے دو بند پیش کرتا چلوں کہ:

تاریخ کی اداؤں کا محور کتاب ہے
ہر علم کی بقا کا مقدر کتاب ہے

....

پل پل بدلتی رُت کی نشانی اسی میں ہے
لکُنت بدست ہے یہ، روانی اسی میں ہے
بچپن ہے اس میں زندہ، جوانی اسی میں ہے
قوموں کے زیرو بم کی کہانی اسی میں ہے
ہر علم کی بقا کا مقدر کتاب ہے

....

مخلوق کی پہنچ میں فراست کا باب ہے
لوحِ ہَوا پہ لکھا مکمل نصاب ہے
مانے نہ مانے کوئی حقیقت جناب ہے
سب لوگ پڑھ رہے ہیں زمانہ کتاب ہے
قدرت کی سب عطاؤں سے برتر کتاب ہے
ہر علم کی بقا کا مقدر کتاب ہے

❀❀❀

’ملتان شریف‘ میں کتابوں کی دکانیں

ہر قسم کی کتابوں کی دکانیں 500 سے زائد

تحریر: غلام مصطفیٰ (ملتان)

ہمارے شہر میں نئی اور پرانی کتابوں کی خرید وفروخت کا مرکز بوسن روڈ پر گلگشت کالونی میں موجود کتابوں کی دکانیں ہیں۔نئی کتابوں کی کے لیے سب سے مشہور دکان ”ملتان کتاب گھر“ ہے۔اور پرانی کتابوں کے لیے ”مدینہ اولڈ بکس سنٹر“ مشہور ہے۔ گلگشت بازار میں نئی اور پرانی کتابوں کی تقریباً 50 سے زائد

اسلامی کتب کی الگ مارکیٹ
شاہین مارکیٹ

دکانیں ہیں۔

اس کے علاوہ ملتان میں پرانی کتابوں کے لحاظ سے سب سے بڑی اور مشہور دکان ”ماجد اولڈ بک سنٹر“ ہے جو بوہڑ گیٹ کے قریب پیپل والی مسجد کی گلی میں موجود ہے۔اس دکان کو دیکھتے ہی محسوس ہوتا ہے جیسے انسان کتابوں کی دنیا میں آگیا ہو۔

ممتاز آباد بی-سی-جی چوک پر بھی کچھ کتابوں کی بڑی دکانیں موجود ہیں۔

اس کے علاوہ مختلف چھوٹے بازاروں میں اور سکول و کالجز کے قریب دکانیں موجود ہیں۔جہاں سے بچوں اور بڑوں کی کتابیں باآسانی مل جاتی ہیں۔

ہر قسم کی کتابوں کی دکانوں کی کل تعداد 500 سے زائد ہے مگر 400 کے قریب وہ دکانیں ہیں جہاں سے صرف سکول و کالج کی کتابیں ملتی ہیں۔اور صرف 100 کے قریب وہ دکانیں ہیں جہاں سے شاعری، ناول، افسانے، سفرنامے وغیرہ مل جاتے ہیں۔

سکول و کالج کی کتابوں کے لیے تو نئی دکانیں کھلتی رہتی ہیں مگر دوسری کتابیں جو نثر اور شاعری وغیرہ پر مبنی ہوں ان کی نئی دکانیں نہیں کھلتی۔

کیوں کہ کتابوں کے مطالعہ کا رجحان کافی کم ہو چکا ہے۔

ملتان میں اسلامی کتابوں کی علیحدہ مارکیٹ ہے۔سرکلر روڈ بوہر گیٹ کے قریب ”شاہین مارکیٹ“ میں ہے۔یہاں سے آپ تمام قسم کی اسلامی کتب، تفاسیر، اور قرآن مجید خرید سکتے ہیں۔مکتبہ المدینہ اور تاج کمپنی اس لحاظ سے زیادہ مشہور ہیں۔ ❀

بوریوالہ میں کتابوں کی دکانیں

طاہر نیوز ایجنسی۔ملک نیوز ایجنسی۔اور راہی نیوز ایجنسی

رانا محمد شاہد، بورے والا

ہمارے شہر بورے والا میں ویسے تو کتابوں کی بے شُمار دکانیں ہیں۔مگر ظاہر ہے زیادہ تر نے نصابی کتب کے ساتھ کچھ اسلامی ادبی تاریخی اور تحقیقی کتابیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔مگر تین دکانیں یا نیوز ایجنسیز ایسی ہیں۔جن سے میرا بچپن سے تعلق رہا۔انہی سے کتابیں رسالے وغیرہ خریدا کرتا تھا۔ان میں طاہر نیوز ایجنسی ملت نیوز ایجنسی اور راہی نیوز ایجنسی شامل ہیں۔کبھی یہاں روزانہ کی بنیاد پر اخبارات ڈاک سے رسالے اور کتابیں آیا کرتی تھیں۔مجھے یاد ہے میری پہلی ترجیح طاہر نیوز ایجنسی ہوتی تھی۔اس لیے کہ یہ ہمارے سکول کی دیوار کے بالکل ساتھ تھی۔یہاں رسالے اور کتابیں سٹال کی صورت میں رکھے ہوتے تھے۔یوں وہاں کھڑے ہو کر تسلی سے دیکھنے اور پسند کرنے میں سہولت رہتی تھی۔ملت نیوز ایجنسی اور راہی نیوز ایجنسی میں ایسا نہیں تھا۔ملت نیوز ایجنسی مچھلی بازار کے کونے پر ایک چھوٹی سی دکان تھی۔جبکہ راہی نیوز ایجنسی کھوکھا نام کالج روڈ پہ گول چوک کے نزدیک ایک پرانے گھر کے بالکل سامنے تھی۔اس کے مالک منظور راہی تھے۔اب یہ دونوں ایجنسیز ختم ہو چکی ہیں۔صرف طاہر نیوز ایجنسی باقی ہے۔

ملت نیوز ایجنسی کے مالک کا نام صوبیدار منظور احمد تھا۔ان کا ایک بیٹا چھٹی سے آٹھویں تک میرا کلاس فیلو رہا۔صوبیدار منظور احمد سے ابو کی بہت دوستی تھی۔یہ ایجنسی 1990ء میں بنائی گئی۔91ء92ء میں ابو

طاہر نیوز ایجنسی نے 4 سال پہلے ساتھ ہی چاٹ اور جوس پوائنٹ بھی بنالیا ہے

ان کے ہاں بطور ہاکر بھی کام کرتے رہے۔یوں ان سے خاص پیار تھا۔مجھے اکثر وہ خصوصی رعایت پر رسالے دے دیا کرتے تھے۔

ان دکانوں سے بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔اب صرف طاہر نیوز ایجنسی باقی ہے۔اس کے موجودہ مالک زاہد اقبال، جنہیں ہم پیار سے منا بھائی کہتے ہیں۔انہوں نے تقریبا 4 سال پہلے کتابوں اور رسالوں کا کام محدود کر کے چاٹ اور جوس پوائنٹ بنالیا ہے۔

طاہر نیوز ایجنسی کی بنیاد منا بھائی کے والد چوہدری غلام رسول نے 1968ء میں رکھی۔منا بھائی نے 1980ء میں اپنے والد کی دکان پہ بیٹھنا شروع کیا۔

میں نے تمام مشہور رسالوں کی تعداد کے حوالے سے پوچھا تو انہوں نے بتایا۔"جاسوسی اور سسپنس ڈائجسٹ تین، تین سو جبکہ خواتین، شعاع وغیرہ پانچ، پانچ سو کی تعداد میں آتے تھے۔آداب

ملت نیوز ایجنسی

عرض، جواب عرض بھی تین تین سو کی تعداد میں آتے تھے۔اب تو صرف خواتین کے رسالے، جاسوسی اور سسپنس وغیرہ آرہے ہیں اور ان کی تعداد اب بہت کم ہوگئی ہے۔یعنی خواتین کے رسالے 80 اور باقی صرف 40 کی تعداد میں۔90ء کی دہائی میں بورے والا کے مضافاتی علاقوں میں بھی یہ بڑی تعداد میں جاتے تھے۔

چوہدری غلام رسول کا 2010ء میں انتقال ہوگیا۔2012ء میں یہ ایجنسی ایم سی ہائی سکول کی دیوار سے سامنے موجود ایک دکان میں منتقل ہوگئی۔یوں وہ جگہ جہاں ہم برسوں آتے جاتے رہے، کئی کئی گھنٹے کھڑے ہو کر رسالوں کی ورق گردانی کیا کرتے تھے، وقت کی گرد میں کھوگئی۔

مجھے یاد ہے 94ء سے 98ء تک یعنی اپنے سکول دور میں بچوں کے رسالے یہیں سے خریدا کرتا تھا۔نونہال، آنکھ مچولی، تعلیم و

اپنے اسکول کے دَور میں بچوں کے رسالے طاہر نیوز ایجنسی سے ہی خریدا کرتا تھا

تربیت، پھول کے ان سالوں کے شمارے اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔جب وہ رسالے نظروں کے سامنے آتے ہیں تو وہ دور، چوہدری غلام رسول صاحب، جنہیں ہم چاچا جی کہتے تھے، یاد آتے ہیں۔چہرے پر لمبی اور بھاری مونچھیں ان کی شخصیت کو بارعب بناتی تھیں۔

منا بھائی نے 2016ء میں اس سکول کے گیٹ سے دو دکانیں چھوڑ کر ایک دکان خرید لی اور اس میں منتقل ہوگئے۔2020ء میں انہوں نے اخبارات، کتابوں اور رسالوں کا کام محدود کر کے جوس پوائنٹ بنالیا۔

میں اب بھی منا بھائی کے پاس جاتا ہوں۔ہر مہینے ایک، دو رسالے خریدتا ہوں، کچھ دیر وہاں بیٹھتا ہوں اور کتابوں اور رسالوں کے اس سنہری دور کو یاد کر لیتا ہوں۔

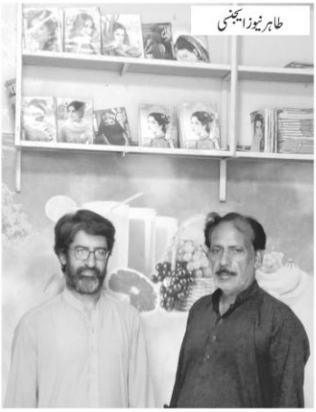

طاہر نیوز ایجنسی

پیراماؤنٹ بکس اب 76ویں سال میں

اب کتاب دوستی کی مشعل پیراماؤنٹ کی تیسری نسل کے ہاتھ میں

1948میں پرانی کتابوں کی چھوٹی سی دکان اب کراچی۔لاہور۔اسلام آباد۔پشاور میں ایک بڑا پبلشنگ ہاؤس

☆اطراف رپورٹ

پیراماؤنٹ بکس اب تمام نا مساعد حالات کے باوجود ڈائمنڈ جوبلی مناکر 76ویں سال میں داخل ہورہاہے۔ادارے کے ڈائریکٹراور اسٹاف نے 2025 کی مبارکباد ارسال کردی ہے۔خوبصورت بیاض۔اورمیز کے لیے کیلنڈر۔

پی ای سی ایچ ایس کی سرسبز آبادی میں خالد بن ولید روڈ اور طارق

صالح محمد یوسف سے اقبال صالح اوراب صلاح الدین اقبال۔زین العابدین اقبال

روڈ کے درمیان پیراماؤنٹ بکس کی تین منزلیں انگریزی اُردو زبان کی نصابی اورغیر نصابی کتابوں سے مزین ہیں۔ جب بھی وہ اپنے فیسٹیول کا انعقاد کرتے ہیں بچے بچیاں اپنے والدین کا ہاتھ تھامے کتابوں کے اوراق الٹنے پلٹنے۔اور جاتے وقت تھیلے بھر کے لے جانے آتے ہیں۔

یہ حرف مطبوعہ کی وراثت ہے۔اب تیسری نسل اس کو بہت محبت پیار سے سنبھال رہی ہے۔کراچی میں یہ مشعل صلاح الدین اٹھائے ہوئے ہیں۔لاہور میں زین العابدین۔کتابوں کی فضیلت سے واقف ہیں۔ اوراس کے ساتھ ساتھ بزرگوں کا احترام اور خاص طور پر مصنفوں کی لیے دیدہ و دل فرش راہ۔اپنے دادا کے عشق کی خوشبو ملک بھر میں

بچوں۔بڑوں۔مردوں خواتین سب کے لیے مقامی اور عالمی کتابیں

پھیلا رہے ہیں۔

صالح محمد یوسف۔بہت دردمند پاکستانی 1948میں صدر میں انہوں نے پرانی انگریزی کتابوں کی ایک دکان کھولی۔انگریز ملک چھوڑ کر جارہے تھے۔صالح یوسف کی نظران کی کتابوں پرتھی۔کراچی اس خطے کا ایک مرکزی شہر تھا۔بندرگاہ تھی۔غیر ملکی سیاح اس پُر امن شہر میں عافیت کی تلاش میں آتے تھے۔برطانوی فوجیوں کو پڑھنے کا شوق ہوتا تھا۔ان کے پاس بھی نادر کتابیں تھیں۔یہ دکان مشہور ہوگئی۔کتابوں کے عاشق کشاں کشاں آنے لگے۔اس سال میں ہی صالح صاحب نے ساتھ ہی ایک دکان پر پہلی منزل خریدلی۔دیوار بہ دیوار انڈیا کافی

اقبال صالح محمد

صالح محمد یوسف

زین العابدین اقبال

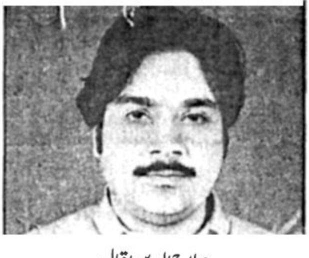

صلاح الدین اقبال

ہاؤس بھی تھا۔جہاں پروفیسرز۔ناول نگار۔شاعر۔صحافی کافی نوش کے لیے آتے تھے۔ان دنوں صالح محمد یوسف کے صاحبزادے اقبال صالح اپنے عظیم والد سے تربیت حاصل کرنے کے لیے دکان پر بیٹھتے۔ والد کی شفقت۔کتابوں کی سنگت نے اقبال صالح کا اقبال بلند کرنے اورانہیں مزید صالح بنانے میں بنیادی کردار ادا کیا۔ثقافت کے مرکز لاہور میں 1962 میں پیراماؤنٹ کی ایک شاخ کھولی گئی اوراس کے بعد اسلام آباد میں بھی۔

صدر سے پی ای سی ایچ ایس میں آنا ہوا۔1983 میں۔جہاں بچوں بچیوں۔خاندانوں کواطمینان سے کتابیں دیکھنے خریدنے کا موقع ملتا تھا۔ یہاں ہر سال پیراماؤنٹ کا اپنا کتاب میلہ لگتا ہے۔توکئی دن تک کراچی کے کتاب دلدادگان کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔ اقبال صالح صاحب نے 1987میں یہ مہذب کاروبار پورا سنبھال لیا۔ والد صاحب نے ان کی ایسی مکمل اور اطمینان بخش تربیت کی تھی کہ وہ پیرا ماؤنٹ کا معیار۔ بین الاقوامی ناشرین کے برابر لے آئے۔اب وہ کتابیں درآمد کرنے کے ساتھ ساتھ خود بھی پبلشنگ کرنے لگے تھے۔ مشکلات آتی ہیں۔سب سے زیادہ یہ کہ پاکستانی روپیہ مسلسل اپنی وقعت کھورہاہے۔اس لیے ڈالراور روپے میں دوریان کتابوں کی قیمتیں زیادہ کرنے کا محرک بنتی ہیں۔میلوں میں 50فی صد تک رعایت دی جاتی ہے۔اقبال صالح خوش قسمت ہیں کہ دونوں صاحبزادگان کتاب کی قدر سے آگاہ ہیں۔کتابوں کی بین الاقوامی وقعت سے بھی ناشنا ہیں۔وہ دنیا بھر میں کتابوں کی صنعت اور تجارت کے نشیب وفراز پر نظر رکھتے ہیں۔اسکولوں کالجوں یونیورسٹیوں میں کن کتابوں کی ضرورت ہے۔وہ خود بھی بعض نصابی کتب شائع کررہے ہیں۔لیڈی برڈ۔لانگ مین۔ کیمبرج۔آکسفورڈ۔اوردوسرے پبلشرز سے وہ کتابیں منگواتے ہیں۔ پاکستان میں معلومات بانٹتے ہیں۔پاکستانیوں کے ذہنی آفاق میں پیرا ماؤنٹ وسعتیں پیدا کررہاہے۔ ❁

اشتیاق احمد سے ملاقات نے اٹلانٹس پبلی کیشنز کی بنیاد ڈالی

راشد اشرف کی زندہ کتابیں ’بچوں کا کلاسیکی ادب‘ اٹلانٹس کا فخر

تحریر: فاروق احمد

’’آپ نے ناول لکھنا کیوں چھوڑ دیئے۔‘‘

’’میرے جاسوسی ناول ہزاروں کی تعداد میں ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے... وقت کے ساتھ ساتھ بچوں اور بڑوں کی دلچسپیاں بدل چکی ہیں ... وی سی آر اور کیبل ٹی وی نے قارئین کی توجہ کھینچ لی ہے ... لہٰذا میرے جاسوسی ناولوں کی طلب اب اتنی نہیں رہی کہ ان پر اٹھنے والی لاگت ہی نکل سکے ... مجھے گھرانے کے اخراجات بھی پورے کرنے ہوتے ہیں جو کہ اب ناولوں کی فروخت سے پورے نہیں ہو پا رہے... ان حالات میں ناولوں کی اشاعت جاری رکھنا میرے لیے ممکن نہیں رہا... مایوس ہو کر میں اپنا اشاعتی ادارہ بند کر چکا ہوں۔‘‘ اشتیاق احمد یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئے۔ جاسوسی ناول اشتیاق احمد کا اوڑھنا بچھونا تھے۔ سنہ انیس سو بہتر سے سنہ دو ہزار دو، یعنی پورے تیس سال بعد اردو ادب کا ایک روشن باب تمام ہونے جا رہا تھا۔

’’لیکن ضروری تو نہیں کہ آپ اپنے ناول خود ہی چھاپیں... دیگر لکھنے والے بھی تو ہیں... ہر کوئی خود تو نہیں چھاپ رہا۔‘‘

’’دو چار سے میری بات ہوئی ہے لیکن انہوں نے خاص دلچسپی ظاہر نہیں کی... ایک پبلشر نے اتنے کم معاوضے کی پیشکش کی جس سے ٹیلی فون کا بل بھی نہ ادا ہو۔‘‘ اشتیاق احمد مسکرائے۔

’’اور اگر میں شائع کرنا چاہوں اور معاوضہ بھی آپ کی مرضی کا ہو ...‘‘

اس بار وہ ہنس پڑے۔ ’’تم کیسے یہ سب کرو گے۔‘‘

’’یہ مجھ پر چھوڑ دیجئے۔‘‘

یہ بات چیت کئی گھنٹے جاری رہی۔ وہ ٹالنے کی بھرپور کوشش کر رہے تھے۔ دوپہر سے سہ پہر ہوئی اور پھر شام ہو گئی۔

کہنے لگے: ’’کراچی واپس کب جاؤ گے۔‘‘

’’جب آپ ہامی بھر لیں گے کہ میرے لیے ناول لکھیں گے۔ ناولوں کی تشہیر، اور تقسیم کیسے ہو گی یہ مجھ پر چھوڑ رکھئے۔‘‘

> **اٹلانٹس پبلی کیشنز۔ اٹلانٹس کیمیکلز کے کاروبار کا ایک فی صد بھی نہیں۔ مگر دل کا معاملہ ہے**

’’تم کو نقصان ہو گا۔‘‘

نقصان کا تو مجھے بھی اندازہ تھا۔ لیکن ایک سودا تھا جو سر میں سمایا تھا۔ لیکن سودے سے زیادہ محمود فاروق فرزانہ سے بچھڑنے کا اندیشہ اور اس سے جڑا دکھ تھا جو دامن گیر تھا۔ اس لمحے میں دماغ سے نہیں دل سے سوچ رہا تھا۔ ایک passion تھا پاگل پن تھا۔

پھر میری مسمسی صورت دیکھ کر کچھ برف شاید پگھلی۔ بولے: ’’اچھا اب یہیں رک جاؤ، رات کو بس کا سفر نہیں کرنا چاہیئے، صبح نوید تمہیں بس اڈے تک چھوڑ آئے گا۔ صبح تک مجھے بھی سوچنے کا موقع مل جائے گا۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ میں نے امید کی کرن روشن ہوتے دیکھ کر کہا۔ اور پھر واقعی امید کی کرن اس اتوار کی صبح کو یقین کے سورج میں ڈھل گئی۔

سات بجے ناشتے کی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئے اور بولے: ’’یار تم بہت پرانے دوست ہو... دل نہیں مانتا کہ تم کو نقصان کے اس سودے میں الجھایا جائے... لیکن خیر! مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے منوائے بغیر نہیں ٹلو گے ... لیکن یار دیکھو! معاوضہ میں ایسا بتاؤں گا کہ تم سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ لو گے۔‘‘ یہ کہہ کر اپنے مخصوص انداز میں ہنسے۔

’’آپ معاوضہ بتایئے۔‘‘ اس لمحے میں واقعی ڈر گیا تھا۔ لیکن ہنس کر کہا۔ ’’سرکار آپ بتایئے تو سہی۔‘‘

وہ مجھے گھورنے لگے جیسے میرے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہو رہے ہوں۔ پھر چشمہ لگایا اور ناک کی نوک تک لے آئے۔ چشمے کے اوپر سے مجھے گھورتے ہوئے انہوں نے جو رقم بتائی وہ میری توقع سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں نے رقم جیب سے نکال کر گنی اور ناشتے کی میز پر رکھ دی۔ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے:

’’ٹھیک ہے بھائی! جب تم نے نقصان کی ٹھان ہی لی ہے تو کوئی کیا کر سکتا ہے... بہرصورت میں تمہیں ایک آخری موقع دیتا ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر چشمہ اتارا۔ میز پر رکھا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ عجب طمانیت تھی اس انداز میں بھی۔ میں وہ اطمینان آج بھی محسوس کر سکتا ہوں جو ان کے چہرے پر موجزن تھا۔ اپنے کرداروں سے دوبارہ ملنے کا احساس ان کے ماتھے پر دمک رہا تھا۔

پھر میں رخصت ہو کر چلا آیا۔ راستے میں نوید سے کہا ہیر رانجھا کے مزار پر لے چلو۔ کہنے لگا لے تو چلتا ہوں اندر نہیں جاؤں گا۔ ہیر رانجھا کے مزار پر فاتحہ پڑھ کر بس اڈے پہنچا۔ وہاں سے لاہور اور اسی رات واپس کراچی۔ یہ بات ہے غالباً چھبیس یا ستائیس اپریل دو ہزار تین کی۔

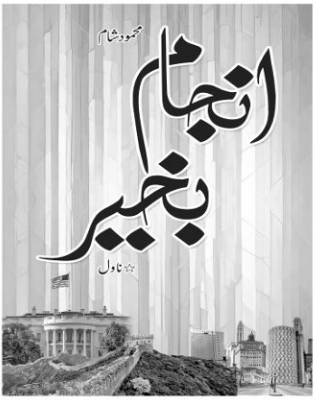

یہ وہ دن تھا جب اٹلانٹس پبلی کیشنز کی بنیاد پڑی گو کہ اس وقت تک سوچا نہ تھا کہ اشاعتی ادارے کا نام کیا ہوگا۔ اٹلانٹس کیمیکل انڈسٹریز سے کشید کیا کہ اٹلانٹس پبلی کیشنز بہتر رہے گا۔ ایک ہفتے بعد ٹی سی ایس سے ناول کا مسودہ آ گیا۔ مہربانی ایک اور اشتیاق بھائی نے یہ کی کہ ناول کی کمپوزنگ بھی کروادی اور ٹریسنگ بھی نکلوادی۔ یہ پلندہ لے کر میں اپنے بزرگ اور مہربان خواجہ قمرالحسن کے پریس پر پہنچا۔ انہوں نے اس کے بعد سارا بار خود سنبھال لیا۔ سوچ رکھا تھا کہ اس کام کو جدید پیشہ ورانہ طرز پر انجام دینا ہے۔ جیسے کوئی پروڈکٹ ہو۔سرورق اور تشہیر کے لیے اپنے آئی بی اے کے زمانہ طالبعلمی کے دوستوں عمران اسلم اور احمد لطیف کپاڈیا کی اشتہاری کمپنی Synergy سے معاہدہ کیا۔ اور اس طرح ''فائل کا دھماکا'' دھماکے دار انداز میں منظر عام پر آیا۔ اسٹیڈیم روڈ اور اردو بازار کے علاقوں میں بل بورڈ لگائے گئے۔ ایف ایم چینلز پر اشتہار چلوائے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوا پہلا ایڈیشن چار دن میں فروخت ہو گیا اور مزید دو ہزار چھاپنا پڑا۔ آغاز اچھا تھا لیکن اس کے بعد چھ سات سال کا عرصہ بڑے نقصانات اور کچھ دیگر شاعتی اداروں، جن میں سرفہرست ایک دینی اشاعتی ادارہ ہے، کی سازشوں سے عبارت تھا۔ لیکن اللہ نے ہاتھ تھامے رکھا اور ناولوں کی اشاعت ڈگمگا کر دوبارہ ٹریک پر آ گئی۔ سات سال حوصلہ شکن بھی تھے اور سیکھنے کے بھی۔ بار بار پیسہ اور دل دونوں ڈوبے۔ لیکن چوں کہ کیمیکل کے بزنس سے سرمائے کی فراہمی کا تسلسل جاری رہا تو دکان بند کرنے کی نوبت نہ آنے پائی۔ اٹلانٹس کا سفر اور اس سفر کے مصائب اور قہقہے بیشمار ہیں۔ تفصیل لکھی جائے تو ایک عدد طلسم ہوشربا بن جائے۔ اور شاید میگزین کے صفحات اس کی اجازت نہیں دیتے۔

اشتیاق احمد کے جاسوسی ناولوں کی نشاۃ ثانیہ کے لیے قائم اٹلانٹس پبلی کیشنز آج ایک ہمہ جہت ادارہ ہے۔ اٹلانٹس کی جملہ مطبوعات کی فہرست دو ہزار کا ہندسہ عبور کر چکی ہے۔ اس سفر کی کامیابی میں راشد اشرف جیسے مخلص اور بے لوث دوستوں کا غیر مشروط ساتھ قیمتی ہے۔ راشد اشرف نے زندہ کتابیں کا آغاز آج سے سات سال پہلے کیا تھا۔ زندہ کتابیں کے تحت ساڑھے تین سو ادبی شہ پارے شائع کیا جا چکے ہیں۔ اٹلانٹس کا ایک اور بڑا کام ''بچوں کے کلاسیکی ادب'' کا ریوائیول ہے۔ گذشتہ سوا سو برس کے دوران برصغیر میں بچوں کے لیے اردو میں بہت ہی شاندار کام ہوا تھا جو زمانے کی گرد میں گم ہو چکا تھا اور فٹ پاتھوں کی ڈھیریوں میں کبھی کہیں رلتا پایا جاتا تھا۔ اٹلانٹس نے تادمِ تحریر اس خزانے میں سے تیس سے زائد موتی چن کر زندہ کیے ہیں۔ تیسرا پروجیکٹ چالیس

ہماری بیٹی آشا فاروق اب اس ادارے کی منتظم ہیں

پچاس ساٹھ اور ستر کے عشروں کے مقبول عام بچوں کے رسالوں کے چیدہ چیدہ شماروں کی از سر نو اشاعت کا ہے۔ کئی عہد اور رہن سہن ان رسالوں میں ایستادہ ہیں مگر زمانے کی نظروں سے اوجھل ہیں۔ تاریخ اور ماضی کو حال پر منطبق کرنا کسی طرح بھی درست نہیں لیکن تاریخ اور ماضی سے رشتہ استوار رکھنا اور سبق سیکھنا یوں ضروری ہے کہ ہم یہ جان سکیں کہ اپنے اصل سے کتنی دور اور اپنی راہ سے کتنا بھٹک چکے ہیں۔

اٹلانٹس پبلی کیشنز کا آغاز دل کا فیصلہ تھا کاروباری دماغ کا نہیں۔

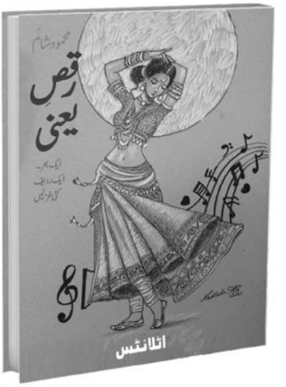

اس ''دھندے'' میں کمائی کشید کی جا سکتی ہے لیکن کیمیکل کے کاروبار کہ نسبت ایک فیصد بھی نہیں۔ بے درد زمانے والے یہ کہنے کا حق رکھتے ہیں کہ ''میاں پھر چھوڑ دو پبلشنگ، ہم پر کا ہے کا احسان گانٹھتے ہو۔'' نہیں بھیا ہم احسان نہیں گانٹھتے۔ نفع نقصان ہمارا سودا ہے۔ اٹلانٹس ہمارا شوق ہے اور شوق کا مول نہیں۔

اٹلانٹس کا سفر جاری ہے۔ اور اب اس سفری بیڑے کی کمان اگلی نسل کو منتقل ہونے جا رہی ہے۔ ہماری بیٹی آشا فاروق اب اس ادارے کی منتظم ہیں۔ اٹلانٹس اب جدید خطوط پر استوار ہے۔ چار سال پہلے اٹلانٹس پرنٹنگ ورکس کی بنیاد رکھی گئی تھی جس کے تحت ایک اسٹیٹ آف دی آرٹ جدید ڈیجیٹل کمپیوٹرائزڈ سسٹم پر نہ صرف اٹلانٹس کی جملہ مطبوعات کی تمام کتابیں شائع کی جا رہی ہیں بلکہ دیگر پبلشرز اور مصنفین کے لیۓ بھی خدمات فراہم کی جاتی ہیں۔ یہاں تعدادِ اشاعت کی کوئی قید نہیں ہے۔ کسی بھی کتاب کے دو عدد نسخے بھی شائع کیے جا سکتے ہیں۔ اٹلانٹس ڈیجیٹل پرنٹنگ ورکس کی ضرورت اشاعت کو بہترین معیار کے مطابق رکھنے کے لیے محسوس کی گئی تھی۔

اٹلانٹس ڈیجیٹل پرنٹنگ ورکس کو پایۂ تکمیل تک لانے، اس کے لیے تمام تکنیکی مہارت بہم پہنچانے، اور اس دوران تمام تر محنت و کاوش اٹلانٹس پبلی کیشنز کی ایڈمنسٹریٹر آسیہ عزیز کا کارنامہ ہے۔ کتابوں کی ڈیلوری یعنی قارئین تک پہنچانے کے لیے معروف کوریئر سروس سے معاہدہ کیا گیا تھا جو کامیابی سے بلا تعطل پورے ملک میں کتابوں کی ترسیل میں ماہر ہے۔

اٹلانٹس کی داستان میں زیبِ داستاں کچھ بھی نہیں بس سیدھی سادی کہانی ہے۔ بائیس سالہ طویل جدوجہد کی کہانی جس کے نہ تو میڈل ہی ان دو صفحات میں دکھائے جا سکتے ہیں اور نہ زخم۔ میدانِ جنگ کی ہولناکیاں اور فتوحات کی تابناکیاں الفاظ میں بیان نہ ہو سکی ہیں تو ہو سکتی ہیں۔ شام جی کا شکریہ کہ طلسم اٹلانٹس ہوشربا کا یہ پیش لفظ آپ کو سنانے کا موقع دیا۔ ❀

1951۔ مستونگ میں ابتدا 1965۔ کوئٹہ میں بھی

تحریر: وحید زہیر

بلوچستان میں ترقی پسند عملی ونظریاتی ادب وسیاست کوتحریر و تقریر کے ساتھ جوڑنے میں قلات پبلشرز کے نام سے ایک مثالی ادارہ ابھی تک ذہنوں پر اپنے نقوش کے ساتھ تر و تازگی کے ساتھ زندہ و تابندہ ہے۔ نوجوانوں کی بلاغت اور سنجیدہ بلوغت کو پروان چڑھانے، علمی وعملی مقام بنانے میں اس ادارے کے مالک سنیٹر زمرد حسین کا معتبر نام صحافت،

> زمرد حسین کی مشعل کو ان کے فرزند روشن رکھے ہوئے ہیں

سیاست۔ نشرواشاعت کے حوالے سے مثبت اور شاندار تاریخی حیثیت کا حامل مانا جاتا ہے۔ انہوں نے 1951 میں کوئٹہ سے پچاس کلومیٹر دور شہر کو اپنی بے غرض خدمات پیش کیں۔ کیونکہ یہ علاقہ سیاست، علم و ادب سے وابستہ جہد علماء سیاستدانوں دانشوروں اور صحافیوں کا مسکن کہلاتا تھا۔ انسانی اقتدار کے ساتھ زندہ ذہنی زرخیزی میں پیش پیش مقامی دوست سیاستدان اور صحافیوں کے بیچ زمرد حسین نے 1951 میں قلات پبلشرز کی داغ بیل ڈالی، اور 1962 میں پہلی کتاب شائع کی۔ کشادہ دل اہل علم وسیاست سے وابستہ عوام کی محبت وقبولیت پر خود کو نچھاور کرتا رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انسانی اقتدار میں دراڑیں ڈالنے والے اپنی پسپائی میں مقید تھے۔ ملک میں ون یونٹ کے خلاف سیاستدان و دانشور یکجا وہم آواز تھے 1965 میں وہ بی ڈی ممبر کے طور پر منتخب ہوئے اور جب وفاقی حکومت کے غیر جمہوری عزائم کھلتے گئے تو ملک میں سنجیدہ سیاستدانوں نے ملکر ہر غیر سیاسی عمل کی ببانگ دہل مخالفت کی۔ جس کے لیے علم وادب کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی روایت کو تسلسل کے ساتھ بڑھاوٗ دیا گیا دوستوں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے بعد 1965 میں قلات پبلشر کا داہرہ وسیع کرنے کے ارادے سے مرکزی شہر کوئٹہ میں اہم شاخ تائم کرنے کا فیصلہ ہوا جس کے بعد ون یونٹ کے خاتمے کی تحریک نے زور پکڑا آخرکار 1970 میں عام انتخابات کا اعلان ہوا نیشنل عوامی پارٹی کے مشورے اور وطن دوست رہنماؤں کی شہرت عام ہوئی۔ یہی وجہ تھی انتخابات میں زیادہ سے زیادہ نشتیں حاصل کرنا انکا مقدر ٹھہرا دوسری طرف عوامی لیگ نے اتحادی کے طور پر میدان مار دیا۔ ون یونٹ کی

KALAT PUBLISHERS

ہمارا نصب العین

علم کی روشنی میں مستقل مزاجی

قلات پبلشرز

ناراضگی پر جمہوریت مخالف عناصر نے سازشی رویہ اپنایا مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے باوجود ان کا تلملانہ ختم نہ ہوا وہ ملک میں افراتفری پیدا کرنے کے لیے مختلف حربے استعمال کرنے کی منصوبہ بندی کے ساتھ جمہوریت کشی کی راہ پر چل پڑے تھے۔ صوبے میں عطاء اللہ مینگل کی حکومت تھی پارٹی کی جانب سے زمرد حسین بھی سنیٹر منتخب ہوئے تھے۔ چونکہ بلوچستان کی مخلص،

ایماندار اور قابل قیادت مخالفین کو ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی یوں اپنے مذ1موم مقاصد کے لیے سرحد اور بلوچستان حکومت کے خلاف مختلف محاذ کھولے گئے اس عوامی قیادت کو غدار ثابت کرنے کیلئے قومیتوں کا معاملہ اٹھایا گیا زہریلے پروپیگنڈوں سے نفرت اور دوریاں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی آخر کار خواہ مخواہ کے الزامات لگا کر نیب کی صوبائی حکومت کو ختم کیا گیا انکی قیادت کو جیلوں میں ڈالا گیا ترقی و جمہوریت پسند ادیبوں، صحافیوں، طلباء پر زمین تنگ کر دی گئی۔ ایک موقع پر زمرد حسین نے کہا عجیب بات ہے وفاقی حکومت کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلانا عوامی مسائل کی نشاندہی، جمہوری انداز میں سوچنا، علم کی آبیاری اس ملک میں جرم ٹھہرا ہے۔ اگر یہ باتیں جرم کے زمرے میں آتی ہیں تو مخلص رہنماؤں اور اہل علم کو ایسا کرنے سے روکنا اور بلاوجہ طاقت کا استعمال نقصان کے علاوہ کچھ نہیں۔

اسی دوران ملک بھر میں ہمت اخبار سمیت بعض اخبارات، رسائل، جرائد کے ڈیکلریشن منسوخ کیے گئے۔ قلات پریس کو بند کیا گیا 80 کے عشرے میں قلات پبلشرز نے بلوچی، پشتو، پنجابی اور براہوئی زبان کی کتابیں چھاپیں۔ اس صنعت کو زندہ رکھا قلات پبلشرز کا یہ اعزاز ہمیشہ قائم رہا کہ اس نے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کی علم و ادب کا چراغ روشن رکھا۔ میر گل خان نصیر، سیال کاکڑ، عین سلام، ڈاکٹر عبدالرحمن براہوئی، ڈاکٹر تاج رئیسانی، وحید زہیر، پروفیسر انور رومان، عزیز بگٹی، پروفیسر خلیل صدیقی، محمود شام، خورشید امروز، پروفیسر رشید احمد، سلیم گمی، پروفیسر سعید احمد رفیق، امان اللہ شادیزئی، خواتین میں یاسمین صوفی شاہین روحی بخاری، رفعت زیبا، شاہدہ بخاری، عذرا مرزا، تسنیم صنم، غزالہ بٹ، نازیہ اکرم، سمیرا ساجد، نزہت جہاں ناز سمیت اور بعض نامور ادباء شعراء کی کتابیں شائع کیں چھپنے والی ان کتاب میں مختلف موضوعات جن میں یہ کتابیں شامل ہیں (۱) تاریخ بلوچستان (۲) تاریخ مذاہب (۳) بلوچستان سے بے وفائی (۴)

> **نذر حسین تمام مشکلات کے باوجود اس کتاب گھر کو جاری رکھے ہوئے ہیں**

زبان کا مطالعہ (۵) بلوچستان آپ بیتی (1) دل کی صدا بلوچستان (۷) گہر گہر ستارگی (۸) مزین ہیں میرے خواب (۹) امتزاج ((۱۰) بازگیر (۱۱) روشنی کا سفیر برملا یہ کتابیں شامل ہیں۔ اس وقت تک چھپنے والوں کی کتابوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔ زمرد حسین کی رحلت کے بعد انکے بھائی صدیق بھٹہ نے بھی علم دوستی کا ثبوت دیا اپنے بھائی کے مشن کو مزید تقویت دی۔ 2001 میں روزنامہ 'ہمت' کا دوبارہ سے اجراء کیا گیا انکے فرزند نادر حسین زمرد کی ادارت میں اب بھی چھپ رہا ہے۔ دوسرے فرزند کوثر حسین زمرد ''بلسم'' کے نام سے ایک رسالہ نکال رہے ہیں۔ بڑے بیٹے، میجر ریٹائرڈ نذر حسین زمر ''دشاد'' رسالہ نکالنے کے علاوہ قلات پبلشرز کے زیر اہتمام نہ صرف کتابیں چھاپ رہے ہیں بلکہ قلات پبلشرز کے اسی نام سے بک شاپ چلا رہے ہیں۔ صدیق بھٹہ کے بیٹے یاسر صدیق اور عدنان صدیق بھی اپنا پبلشنگ ادارہ قائم کر چکے ہیں۔ ایک پرائیوٹ اسکول بھی انکے زیر انتظام چل رہا ہے۔ ان کی بچیاں صحت اور تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہیں اب تو انکے نواسے بھی مختلف شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ نذیر حسین زمرد اپنے والد محترم کے بلوچستان کے اکابرین کے ساتھ خاندانی تعلقات کو یہاں مزید مستحکم کیا اور یہاں کے ادبی، علمی فضاء کو حتی الوسع قائم دائم رکھنے کے لیے نامور ادیبوں اور نوجوان ادباء و شعرا کی کتابوں کی اشاعت کو مزید یقینی بنایا اس قدر مہنگائی کتاب دوستی پر بلاوجہ کی کڑی نگرانی، چھپائی و ترسیل پرستی کی پرواہ کیے بغیر وہ اپنے والد کے مشن پر کاربند نظر آتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت اکثر پبلشنگ اور کتاب مراکز بند ہو چکے ہیں، جناح روڈ کے سنگم پریس کلب کے بالمقابل اس اہم تجارتی مرکز پر دیگر کاروبار عروج پر ہیں۔ اس اہم عمارت کو کاروباری عناصر شروع سے نظروں میں رکھتے آ رہے ہیں۔ مختلف طریقوں سے اس خانوادے کو کاروبار بدلنے اور عمارت کو اچھی قیمت پر بیچنے کی ترغیب دی جاتی رہی ہے۔ نذر حسین سب کو سمجھنے کے باوجود پیغام رسانوں کو زمرد حسین کی طرح میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ چائے پلا کر رخصت کرتے رہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ابا حضور کی قوم کے لیے دی جانے والی قربانیوں کی ہماری قربانیوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں۔ شہر کے پڑھے لکھے افراد کے لیے یہ واحد ایک تاریخی ٹھکانہ ہے۔ بقول انکے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ تمام روحیں جو اس اشاعتی و سیاسی مرکز سے وابستہ تھیں۔ وہ میرے اردگرد ہمیشہ رہتی ہیں۔ انکی تازہ روحوں کے ساتھ میل ملاپ میں رخنہ ڈالنا ایک قومی بدیانتی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ جب تک یہ محبت قائم ہے قلات پبلشرز اس محبت کی ضامن رہے گی۔ ❁

پشاور میں کتابوں کی دکانیں

پشاور کینٹ کی محبوب۔ کتب مینار۔ کہاں گئی

تحریر: ممتاز شاعر۔ مصنّف ناصر علی سید

جاں نثار اختر نے کہا ہے کہ

پتا نہیں کہ مرے بعد ان پہ کیا گزری
میں چند خواب زمانے میں چھوڑ آیا تھا

گزشتہ دو برسوں میں مجھے غیر متوقع طور پر پشاور سے غیر حاضر رہنا پڑ گیا تھا گزشتہ برس کے جون کے پہلے دن میں تین ہفتوں کے لئے رومی سوسائٹی کی دعوت پر لندن پہنچا اور پھر اگست کی آخری شام تک دوستوں کی محبت اور ادبی تقریبات نے نکلنے نہ دیا ستمبر میں میری پہلے سے نیوجرسی میں ڈاکٹر عامر بیگ کی کتاب کی رونمائی میں شریک

ادب محل۔ جہاں اُردو پشتو کی نایاب کمیاب کتابیں بھی دستیاب

ہونے کی کمٹمنٹ تھی سو یکم ستمبر کو لندن سے امریکا پہنچا اور پھر پندرہ نومبر وہاں سے نکل کر عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہوئے نومبر کے آخری ہفتے میں پشاور پہنچا رواں سال اسی ادبی دورہ کا ایک طرح سے ایکشن ری پلے تھا مئی کے دوسرے ہفتے ادبی تقریبات کے لئے پہلے برطانیہ اور وہاں سے اگست کے تیسرے ہفتے امریکا پہنچا اور اکتوبر میں پشاور واپسی ہوئی اور آتے ہی بیگانی شادیوں میں عبداللہ دیوانہ بنا پھر رہا ہوں، محمود شام جی نے پشاور میں کتابوں کی دکانوں کا پوچھا تو گویا

اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

کیونکہ کچھ دکانیں جو باقی تھیں ان میں سے بھی چند ایک مزید بھی میری غیر ملکی یاترا کے دوران اپنی جون بدل چکی تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پشاور میں بھی تو کم و بیش ہر بازار میں چھوٹی بڑی بک شاپ ہوا کرتی تھیں حتیٰ کہ بعض علاقوں میں پرانی کتابوں کی بھی کئی دکانیں موجود تھیں پھر آنہ لائبریریاں بھی پاپولر ادب اور ادب عالیہ کی کتب سے بھری رہتیں۔ مگر پھر، قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ، دلچسپی کی کچھ اور چیزیں نکل آئیں اور سماجی زندگی سے کتاب کو یکسر منہا کر دیا اور تو اور اسکول اور کالجوں میں بھی چپکے سے علم کو تعلیم میں سے نکال دیا گیا اور یوں ایجوکیشن ود آوٹ نالج کا چلن عام ہو گیا، ظاہر ہے پھر کتب اور ادبی کتابوں کی چنداں ضرورت نہ رہی حافظ نے کہا تھا

دو یار ازیرک واز بادہ کہن دو منے
فراغتے و کتابے و گوشہ چمنے

المیہ یہ بھی ہوا کہ فی زمانہ حافظ کے شعر میں جن اشیا کا ذکر کیا ہے ان میں سے فقط بادہ کہن کے اور کچھ بھی میسر نہیں، کتاب ہے بھی تو دیکھنے کی فرصت کہاں سے لائیں۔ اور پھر یاران زیرک نے کب کی مجلسی زندگی ترک کر رکھی ہے اور چمن سکون بھلا کر ہنگامہ خیز فن لینڈز میں بدل گئے ہیں، مان لیں کہ تہذیبی زندگی میں یہ بگاڑ کتابوں سے دوری کی وجہ سے آیا ہے، کسی بھی شہر میں بک شاپس ایک طرح سے تہذیبی مراکز کا کردار ادا کر رہی تھیں جو امتداد زمانہ سے بتدریج بند ہوتی گئیں۔ مجھے یاد ہے کہ پشاور کینٹ میں ایک دکان مجھے بہت پسند تھی اس کا نام، کتب مینار تھا جہاں میں صرف جاتا نہیں دیر تک بیٹھا بھی رہتا، پہلے وہ ختم ہوئی پھر فیروز سنز اور ایم جے بکس نے شٹر گرا دیئے لندن بک ایجنسی نے کتابوں کے ساتھ ساتھ پہلے پہل عید کارڈز اور گفٹس کارڈ رکھے پھر گفٹ بھی رکھنا شروع کر دیئے اور یوں ادبی کتب کے شیلف سمٹتے سمٹتے ختم ہو گئے سعید بک بنک ایک بہت بڑی دکان تھی انہیں دارالحکومت کی فضا راس آ گئی وہ کتابیں اٹھا کر وہاں چلے گئے ادھر یہ بھی ہوا قصہ

سعید بک ڈپو۔ لندن تک ایجنسی۔ قصہ خوانی کی بختیار سنز

خوانی میں معروف بک شاپ بختیار سنز تھی جو دکان تو بہت بڑی نہ تھی مگر ادبی کتب سے بھری رہتی۔ دکان کے مالک ممتاز عسکری سے جب کسی کتاب کا پوچھتے اور وہ موجود نہ ہوتی تو کہہ دیتے اگلے ہفتے مل جائے گی وہ لاہور کراچی کہیں سے بھی منگوا لیتے۔ وہ کتاب دوست اور علم دوست شخص تھے۔ شعرا اور ادبا کا تواتر سے آنا جانا رہتا۔ قہوہ اور سوپ بھی پلاتے نئی بکس کا تعارف کراتے اور جانے کیسے سمجھ جاتے کہ خریدنے کی سکت نہیں ہے یا پھر ان کی خواہش ہوتی کہ یہ کتاب ضرور پڑھی جائے

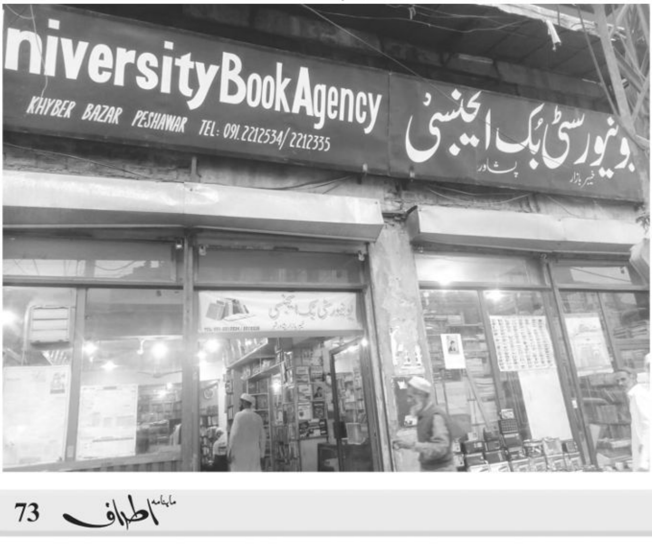

پشاور میں کتابوں کی دکانیں

کیونکہ وہ خود پہلے پڑھ چکے ہوتے تھے اس لئے کتاب زیر دستی حوالے کر کے کہتے کہ آپ لے جائیں ہفتہ دس دن میں پڑھ کر واپس کر دیں۔ دراصل اس کتاب کے حوالے سے میرے ذہن میں کچھ سوال ہیں آپ کتاب پڑھ لیں تو پھر آپ سے پوچھ لوں گا۔ پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ۔ مگر ممتاز عسکری کی وفات کے بعد پہلے پہل اسے بھی ٹیکسٹ بکس تک محدود کر دیا گیا غنیمت تھا کہ چند ادبی کتابیں بھی ایک آدھ شیلف میں تھیں، پھر سننے میں آئے کہ ان کے برخوردار نے دکان بیچ دی ہے اور کل جب میں برخوردار ابتسام علی سید کے ساتھ قصہ خوانی گیا تو بختیار سنز کی دکان دو دکانوں میں بٹی ہوئی تھی ایک شوز کی اور دوسری گارمنٹس کی دکان تھی بختیار سنز سمیت کتابوں کی کئی ایک دکانیں اب سٹیشنری اور دوسرے سامان کی دکانوں میں بدل گئی ہیں لے دے کے شہر میں بس کتابوں کی ایک ہی پرانی دکان یونیورسٹی بک ایجنسی رہ گئی ہے۔ البتہ اب ایک دکان ہمارے دوست اردو پشتو کے افسانہ نگار ایاز اللہ ترکزئی کی ادب محل کے نام سے بھی ہے ان کا اپنا پبلشنگ ہاؤس بھی ہے شعرا ادبا زیادہ تر ان سے یا پھر صدارتی ایوارڈ یافتہ شاعر و افسانہ نگار اور محقق اسیر منگل کے "منگل کور" سے کتابیں شائع کراتے ہیں مگر ایاز اللہ ترکزئی نے ایک قدم آگے بڑھ کر ادب محل کے نام سے بک شاپ بھی بنا دی ہے جہاں اردو پشتو کی بہت اہم اور کمیاب کتب بھی مل جاتی ہیں ابھی تک تو دلجمعی سے کام کر رہے ہیں لیکن آئے دن ڈسکاؤنٹ کی پوسٹس ادبا شعرا کے گروپس میں شیئر کرتے رہتے ہیں جو اچھا شگون نہیں ہے پشاور کینٹ اور یونیورسٹی میں بھی اب بہت کم دکانیں ہیں بہت سی بک شاپس بند ہو گئیں یا پھر دکان مالکان نے کتب کی جگہ دیگر منفعت بخش اشیا سے یہ سوچ کر راہ و رسم بڑھائی ہے

کوئی جنوں کوئی سودا نہ سر میں رکھا جائے
بس ایک رزق کا منظر نظر میں رکھا جائے
(افتخار عارف)

ہیر کا قصہ بیسیوں شاعروں نے منظوم کیا ہے۔ وارث شاہ کے قریب تو کوئی نہیں پہنچا لیکن کچھ اشعار دوسروں کے بھی مشہور ہوئے۔ مثلاً

ڈولی چڑھدیاں ماریاں ہیر چیکاں

وارث شاہ کا نہیں تر گڑ کا ہے لیکن ہیر وارث شاہ گانے والے اسے بھی شامل کر لیتے ہیں۔
پھر پبلشرز نے بھی دوسرے شاعروں سے لکھوا کر ہزاروں الحاقی شعر شامل کیے۔
میرے پاس یہ کتاب 136 سال پہلے ایک سکھ شاعر جوگ سنگھ کی لکھی ہوئی قصہ ہیر ہے۔
آج کے زمانے کا 80 گرام آفسٹ پیپر نہ ہونے کے باوجود کتاب میں کوئی فرق نہیں آیا۔

میرا پسندیدہ ناول ''انجام بخیر''

'انجام بخیر' میں مصنّف نے اپنے عہد کی ترجمانی کی ہے

تحریر: سعیدہ افضل

ماضی قریب وعہد حاضر میں اب تک۔
اُردو کے جتنے مشہور ناول نظر سے گزرے ہیں' اپنے موضوع اور طرزِ تحریر کے اعتبار سے جناب محمود شام کا تحریر کردہ ناول ''انجام بخیر'' میرا سب سے پسندیدہ ناول ہے۔
بے شک موضوع بڑا نازک ہے۔

یہ ناول پاکستان کی تاریخ۔ بامقصد تخلیق

پاکستان میں یہ انتہا پسندی کب سے اور کیسے آئی؟ ہر محب وطن پاکستانی خصوصاً کراچی کے باسیوں کے لیے یہ ایک بڑا اہم سوال تھا۔ میرا تعلق کراچی اور کچھ عرصہ صحافت سے رہا ہے۔ اس وجہ سے بھی یہ ناول میرے نزدیک ایک آئیڈیل تحریر ہے۔ جب میں 'انجام بخیر' کو پڑھ رہی تھی سوچ رہی تھی اے کاش میں بھی ایسا کچھ لکھ سکتی۔
جناب محمود شام جیسے منجھے ہوئے زیرک صحافیوں پر مجھے رشک آتا ہے کہ جن کے سامنے دنیا ایک کھلی ہوئی شاہراہ کی طرح ہے جس پر وہ عمر بھر ذوق وشوق سے رواں دواں رہتے ہیں اور اس سفر کی بدولت ان کا ویژن وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ دنیائے صحافت کے یہ کہنہ مشق قلم کار جب ادب تخلیق کرتے ہیں تو عہد ساز شخصیت ثابت ہوتے ہیں۔
ناول انجام بخیر بھی ادبی دنیا کے جدید فکشن میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ پاکستان کے بارے میں ایک تاریخی دستاویز بھی ہے۔

ناول میں محمود شام نے حقائق یکجا کردیے ہیں

اس ناول کے مصنّف بلاشُبہ دانش ور طبقے میں صف اول کے شہسوار ہیں۔ اپنے ملک وملت کے ان معماروں کو میں ادب وصحافت کا ایک گراں قدر سرمایہ سمجھتی ہوں۔ اس تصنیف میں جناب محمود شام نے اپنے عہد کی کماحقہ ترجمانی کی ہے۔ یہ صرف کراچی شہر کے روز وشب کا ابتلا نامہ ہی نہیں' وطنِ عزیز کی تاریخ کا جیتا جاگتا منظر نامہ بھی ہے' ناول پڑھتے ہوئے لگتا ہے کسی سچی کہانی پر مبنی فلم دیکھ رہے ہیں' ایک ایسی تاریخی فلم جس کے اکثر مناظر کے ہم خود چشم دید گواہ ہیں۔

پاکستان کی تہذیبی ثقافتی، سماجی بربادی۔ سیاسی حالات کی ظالمانہ کارکردگیاں۔ اور بیرونی طاقتوں کی وطن پر استبدادی اثر اندازی۔ ناول کے کرداروں کی زبانی کچھ اس طرح عیاں کی گئی ہے کہ قاری خود کو ان کرداروں کے ساتھ چلتا پھرتا ماضی وحال مستقبل میں سفر کرنا محسوس کرتا ہے۔ بطور صحافی و ادیب۔ محمود شام صاحب کی ذہنی بلاغت Richness نے اس ناول کو چار چاند لگادیے ہیں۔ ان کا تجربہ اور بھرپور معلومات قاری کو پاکستان کی تاریخ سے حقوق آشنا کرتی ہے۔ یہ آگہی دے کر انہوں نے خود کو ایک کامیاب مورخ کے طور پر منوایا ہے۔
میرے خیال میں یہ ناول محض تفننِ طبع کے لیے نہیں لکھا گیا ہے۔ یہ ایک بامقصد تخلیق ہے جو ان طالب علموں کے لیے مشعل راہ ہے جو پاکستان کی تاریخ سے حقیقی واقفیت چاہتے ہیں۔
یوں تو ہر تخلیق میں مقصدیت ہوتی ہے تاہم یہ بیشتر ڈھکی چھپی ہوتی ہے، شام بخیر، میں مگر یہ مقصدیت عیاں اور واضح ہے جو عام قاری کی کھلم کھلا رہنمائی کرتی ہے اور اس کی سوچ کے ابہام کو دور کرتی ہے۔
میرے نزدیک ایک خاص طبقہ' فکر کے لوگوں کے لیے یہ ناول زیادہ

خلیل۔ سدرہ۔ احمد حماد۔ تین کردار۔ ہر لمحے دردمند

بامعنی اور پُرکشش تصنیف ہے، خصوصاً جن کا اوڑھنا بچھونا، صحافت رہی ہو۔ یا کہ جو تاریخ کے طالب علم ہیں۔
ناول کے مرکزی دو کردار (میں تین کہوں گی) خلیل۔ سدرہ اور احمد حماد ہیں۔ یہ تینوں ہی دریائے صحافت کے پُرشوق شناور ہیں، وطن، دیانت دار اور اپنے پیشے سے مخلص، ان کا اوڑھنا بچھونا بھی صاف وشفاف صحافت ہے اور ان کی زندگی کا مقصد اپنے وطن میں خیر وسلامتی کی ترویج ہے۔ تبھی وہ ان عناصر کی تلاش میں ہمہ وقت مستعد رہتے ہیں جن سے ان کے وطن عزیز کو خدشات، خطرات اور تحفظات لاحق ہیں۔ اسی فکرمندی کا کرب انہیں بے چین رکھتا ہے اور سفیدی میں سیاہی تلاش کرنے پر اکساتا ہے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو بذریعہ میڈیا، ٹی وی چینل واخبارات سے روزمرہ واقعات اور انتہا پسند عناصر کی منفی سرگرمیوں کے بارے میں باخبر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ ملک وملت کو نقصان پہنچانے والوں سے محب وطن پاکستانی ہوشیار رہیں۔
آزادی کے پہلے دن سے دور حاضر تک ہمارا ملک کن کن بحرانوں سے گزرا اور ان بحرانوں کے ذمہ دار کون سے مفاد پرست یا کہ بااثر غدار تھے۔ پاکستان کی تاریخ مرحلہ وار کس طرح بنتی گئی اور ترقی تنزلی میں تبدیل ہوتی گئی۔ وطن دولخت ہوا۔ جو وطن سے باوفا تھے کس طرح تاریک راہوں میں مارے گئے۔

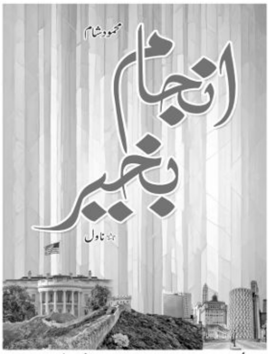

یہ سب حقائق۔ سینئر صحافی احمد حماد اپنے شیدائی شاگرد، نوجوان صحافی رپورٹرز' خلیل اور سدرہ کی زبانی، کبھی تیکھی کبھی دھیمی اور کبھی میٹھی گفتگو میں قاری کو ذہن نشین کراتے ہیں۔ ناول میں ایک جگہ تحریر ہے۔
''سدرہ خیال ہی خیال میں خبر کا تانا بانا تیار کررہی ہے۔ حماد صاحب سدرہ کو ایک روز بعد آنے کا کہتے ہیں تاکہ پاکستان کی تاریخ کا سفر مکمل کیا جاسکے۔''
ایک اور صفحے (نمبر 153) پر ملاحظہ ہو۔
(نوجوان صحافی خلیل امریکہ پینٹا گون، اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے کمرے میں بیٹھا سوچ رہا ہے)
''خلیل رپورٹر کو سب سے زیادہ نکات کاؤنٹر ٹیررازم کی بریفنگ سے ہی ملے اس نے وہیں سوچ لیا تھا کہ وہ اس دورے کی رپورٹ کتابی شکل میں اپنے پاکستانی نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے شائع کرے گا۔''
ناول کے اس اقتباس سے مصنّف کی نیت اور ناول کا مقصد واضح ہوجاتا ہے' یہ ناول ہم کو ''ایجوکیٹ'' کرتا ہے کہ آگہی ہی وہ طاقت ہے جس کے بل بوتے پر کسی بھی ملک کا باشندہ اپنے وطن کی سلامتی میں مثبت کردار ادا کرسکتا ہے آگہی بنا۔ خیر وشر اور دوست ودشمن میں تمیز کرنا ایک مشکل امر ہے۔
انجام بخیر کے مطالعے سے میں نے بہت کچھ جانا پہچانا اور سیکھا ہے۔ یہ کتاب معلومات کا ایک خزانہ ہے اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ پاکستان اور پاکستانیوں پر گزشتہ 76 سالوں میں کیا بیتی ہے تو اسے ''انجام بخیر'' کا مطالعہ ضرور کرنا چاہئے۔ اس مطالعے کے بغیر ہم میں سے اکثر پاکستانی ادھورے اور بے خبر ہی رہیں گے۔
اپنے ناول ''انجام بخیر'' میں جناب محمود شام نے نہ صرف پاکستان کی تاریخ رقم کی ہے۔ اس کاوش نے ان کو ایک معتبر مورخ ایک محب وطن اور اعلیٰ پائے کا ادیب بھی ثابت کیا ہے۔ ❁

احتشام ارشد نظامی کی ’’نیرنگی سیاست دوراں‘‘ اور ’’وہ رفاقتیں۔وہ حکایتیں‘‘

تحریر :جمیل عثمان

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

اس شعر پر احتشام ارشد نظامی سو فیصد پورے اترتے ہیں۔احتشام ارشد کے دل میں اللہ نے اوروں کا درد کوٹ کوٹ کر بھر دیا ہے۔کہیں بھی کوئی تکلیف سے کراہ رہا ہو، احتشام تڑپ اٹھتے ہیں۔کہیں بھی کسی کا حق مارا جا رہا ہو، احتشام اس حق تلفی کا ازالہ کرنے کے لئے سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔کہیں بھی کوئی فرد یا جماعت کسی مشکل کا شکار ہوا احتشام اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے کمر باندھ لیتے ہیں۔یہ جذبے ان کے دل میں بچپن ہی سے موجود ہیں۔ان کے دردمند دل کو کبھی قرار نہیں آتا۔ وہ مستقل فلاحی کام کرتے رہے ہیں اور اب بھی کر رہے ہیں۔وقت گزرنے کے ساتھ نہ تو ان کے قدم ڈگمگائے اور نہ ہی رفتار میں کمی آئی۔

احتشام الدین ارشد سیاست کے طالب علم ہیں۔خود ہی کہتے ہیں کہ ”میں نے ایک ایسی سرزمین پر آنکھ کھولی جہاں بچے ماں کے پیٹ سے سیاست سیکھ کر پیدا ہوتے ہیں“۔مراد مشرقی پاکستان ہے جو بنگلہ دیش بن چکا ہے۔انٹرمیڈیٹ تک تعلیم ڈھاکہ کالج میں حاصل کی۔1970 کے اواخر میں والدین نے اعلیٰ تعلیم کے لئے انہیں مغربی پاکستان بھیج دیا جہاں انہوں نے کراچی یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور وہیں سے سیاسیات میں بی اے آنرز اور ایم اے کی اسناد حاصل کیں۔

احتشام ارشد صاحب ایک علمی ادبی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔والد گرامی سید نظام الدین ایک کاشتکار تھے۔گندم اور گنے کی کاشت کیا کرتے تھے۔کاشتکاری کے علاوہ وہ ملازمت بھی کرتے تھے۔ان کو سیاست سے بھی دلچسپی تھی۔انہوں نے گاؤں اور قصبے کی سطح پر سیاست میں بھی لیا اور الیکشن بھی لڑا۔وہ جلسوں میں احتشام صاحب کو اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔پھر ان کے بڑے بھائی سید قیام نظامی انہیں ادبی محفلوں اور مشاعروں میں بھی لے جایا کرتے تھے جس سے احتشام صاحب کا ادبی ذوق اجاگر ہوا۔قیام صاحب خود ایک اچھے ادیب اور کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔افسوس کہ ابھی پچھلے سال ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

احتشام ارشد صاحب دو کتابوں کے مصنف ہیں۔ایک ”نیرنگی سیاست دوراں "جو 2009 میں شائع ہوئی اور دوسری ”وہ رفاقتیں وہ حکایتیں " جو 2020 میں منظر عام پر آئی۔پہلی کتاب ان کے کالموں کا مجموعہ ہے اور دوسری کتاب میں ان شخصیات کا تذکرہ ہے جن سے وہ ملے ہیں (رفاقتیں) اور کچھ قصے ہیں (حکایتیں)- احتشام نے اپنی کتاب ”وہ رفاقتیں وہ حکایتیں " کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ”نہ جانے کالم کو ادب کا حصہ سمجھا جاتا ہے یا نہیں“۔تو میں یہ کہوں گا کہ ان کے کالموں میں ادب کی چاشنی ملتی ہے۔ان کا مطالعہ وسیع ہے اور وہ اپنی تحریروں میں جابجا اشعار نقل کرتے ہیں اور ادب پاروں کے حوالے دیتے ہیں۔

ڈاکٹر ستیہ پال آنند سے اپنی کتاب پر مضمون لکھوانا آسان کام نہ تھا۔

آنند صاحب ہر کس و ناکس کے لئے نہیں لکھتے۔لیکن احتشام صاحب کی کتاب ”وہ رفاقتیں وہ حکایتیں " میں ان کا مضمون ہے جس سے ایک مختصر اقتباس میں آپ کو سناتا ہوں : "احتشام ارشد نظامی کی یہ احتیاط قابل قدر ہے کہ ان خاکوں میں خود پر روشنی مرکوز کیے بغیر انہوں نے احباب کے خدوخال ابھارے ہیں۔ پڑھتے ہوئے اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ قلمی تصویریں ایک ایسے فوٹوگرافر نے کھینچی ہیں جو قلمی فوٹوگرافی کے فن میں ماہر ہے۔کہیں خودستائی یا خودنمائی نہیں ہے اور نہ ہی دوست پروری یا دشمن کشی، چوں کہ یادوں کی گرفت رسا میں آنے والے واقعات صرف شنیدنی ہی نہیں ہیں، بلکہ دیدنی ہیں، اس لئے معتبر ہیں“۔

ایک اور بہت بڑا نام –محمود شام صاحب۔ ان کی کتاب ”نیرنگی سیاست

بنگلہ دیش میں محصور پاکستانیوں کے لیے ان کی جدوجہد تاریخی ہے

دوراں " پر مضمون میں لکھتے ہیں، ارشد صاحب کے ہاں موضوع کا چناؤ منفرد بھی ہے، بروقت، برملا اور برمحل بھی۔زبان میں روانی اور ادبی چاشنی آج کے بہت سے کالم نویسوں کی طرح اکھڑی اکھڑی اور بے ربط نہیں "

معروف صحافی اور کالم نگار ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں: "احتشام ارشد کی خصوصیت ان کی تحریر کا منطقی اور استدلالی انداز ہے۔وہ اپنی تحریروں سے جذبات کو نہیں عقل کو مخاطب کرتے ہیں اور لفظوں کو سادگی کے ساتھ محض ابلاغ کے لئے استعمال کرتے ہیں۔لفظوں سے کھیلنا انہیں نہیں آتا۔“

احتشام ارشد نظامی کی شخصیت کے کتنے پہلو ہیں، اتنے مختصر وقت میں ان سب کا احاطہ کرنا ممکن نہیں۔لیکن میں مختصراً میں چند باتوں کا ذکر کروں گا۔ احتشام ابھی یونیورسٹی کے طالب علم ہی تھے کہ ان کی اور ہم سب کی زندگیوں کا عظیم سانحہ رونما ہوا۔دسمبر 1971 میں پاکستان کے دو ٹکڑے ہوئے اور مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن گیا۔آپ اس نوجوان کی کیفیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس کے والدین مشرقی پاکستان میں پھنس کر رہ گئے ہوں اور وہاں سے غیر بنگالیوں کے قتل عام کی خبریں آ رہی ہوں۔مگر وہ صرف اپنے خویش و اقارب کے لئے فکرمند نہیں تھے، مشرقی پاکستان کے سارے غیر بنگالیوں کی انہیں فکر تھی۔ جب پاکستان اور بنگلہ دیش کے درمیان آبادی کا تبادلہ شروع ہوا تو یہاں سے تو جہاز بھر بھر کے بنگالی ڈھاکہ جا رہے تھے مگر وہاں سے جہاز خالی آ رہے تھے۔احتشام اپنے ساتھیوں کے ساتھ بار بار اسلام آباد کے چکر کاٹتے تھے ، وزیروں، سکرٹریوں اور دوسرے ارباب اقتدار سے ملاقاتیں کرتے تھے اور ان سے استدعا کرتے تھے کہ بنگال سے تمام پاکستانیوں کو لایا جائے، مگر افسوس کہ ڈھائی لاکھ افراد وہاں چھوڑ دیے گئے جو آج بھی وہاں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔احتشام نے ان لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے کیا کچھ نہیں کیا۔ Friends of Humanity کا قیام اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ انہوں نے فنڈ ریزنگ کی ، بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں قائم کیمپوں میں اسکول بنوائے ، ڈسپنسریاں قائم کیں، ٹیوب ویلز لگوائے ، باتھ رومز اور بیت الخلا بنوائے ، بقرعید کے موقعے پر ہزاروں جانور قربان کروائے اور ان لوگوں میں گوشت جنہیں سال بھر گوشت کھانا نصیب نہیں ہوتا تھا۔آج آپ جا کر ان کیمپوں کو دیکھیں تو آپ کو معلوم! کہ وہاں حالات پہلے سے بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ احتشام کے ادارے کے ساتھ اب دوسرے ادارے بھی کیمپوں کی حالت سدھارنے کا کام کر رہے ہیں۔

احتشام صاحب کے اندر خدا نے بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ بینک میں ملازمت کے ساتھ ساتھ یہ سب کام کرنا آسان نہ تھا۔ وہ برسوں نیویارک سے نکلنے والے سب سے بڑے اخبار اردو ٹائمز اور شکاگو سے نکلنے والے اخبار پاکستان ٹائمز میں کالم لکھتے رہے۔معروف صحافی رانا عبدالباقی صاحب کے ویب سائٹ ساؤتھ ایشیا پلس "(South Asia Pulse) میں بھی ان کی تحریریں پوسٹ ہوا کرتی تھیں۔وہ مختلف ٹی وی چینلز پر بہ حیثیت تجزیہ نگار بلائے جاتے ہیں۔

اب احتشام صاحب نے یوٹیوب پر اپنا پروگرام ”ہم اور آپ " کے نام سے شروع کیا ہے۔اب وہ بہ طور ایک پرسن اور ماڈریٹر کے سامنے آئے ہیں اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے ہیں۔ وہ ہفتے میں دو پروگرام کرتے ہیں۔ایک تو سقوط ڈھاکہ کے تعلق سے، کہ یہ موضوع ان کے دل سے بہت قریب ہے اور وہ نئی نسل کے دلوں میں اس سانحے کے متعلق آگاہی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان لوگوں کو اپنے پروگرام میں بلاتے ہیں جو اس سانحے کے چشم دید گواہ ہیں یا ان شاعروں اور ادیبوں کی ملاقات ناظرین سے کرواتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر لکھا ہے۔

دوسرا پروگرام خالصتاً ادبی ہوتا ہے جس میں وہ ناظرین کی ملاقات پاک و ہند کے مختلف ادباء اور شعرا سے کرواتے ہیں۔ان سے مزے مزے کی گفتگو بھی کرتے ہیں اور ان کی تخلیقات بھی سنتے اور سناتے ہیں۔ان پروگراموں کے ناظرین میں دن بہ دن تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور ان کی ریٹنگ بڑھتی جا رہی ہے اللہ انہیں مزید کامیابیاں عطا کرے۔ان کی کامیابی کا ایک راز اور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب مرد کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔اور بلاشبہ احتشام بھائی کی کامیابی کے پیچھے ہماری ہما بھابی کا ہاتھ ہے۔

اقبال اے رحمٰن مانڈویا کی ''اس دشت میں ایک شہر تھا''

تحریر: پروفیسر ڈاکٹر رئیس احمد صمدانی

کتابوں میں افضل کتاب قرآن مجید، اس سے اچھی کوئی کتاب نہیں۔ میری سب سے پسندیدہ کتاب تو قرآن کریم ہی ہے جو مکمل ضابطہ حیات ہے۔ میری ہی پسندیدہ کیا یہ تو دنیا میں بسنے والے ہر مسلمان کی پسندیدہ کتاب ہے۔ کتاب کا خالق کائینات کا خالق ہے۔ جس نے یہ دنیا بنائی، اپنی کتاب قرآن مجید جن وانس کی رہنمائی کے لیے اسے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر وحی کے ذریعہ نازل فرمایا۔ قرآن مجید کی سورۃ البقرہ آیت 185 میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ترجمہ: ''(روزوں کا مہینہ) رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن (اول اول) نازل ہوا جو لوگوں کا رہنما ہے اور (جس میں) ہدایت کی کھلی نشانیاں ہیں اور (جو حق و باطل) کو الگ الگ کرنے والا ہے، تو جو کوئی تم میں سے اس مہینے میں موجود ہو چاہیے کہ پورے مہینے کے روزے رکھے''۔

دنیاوی اعتبار سے ہم اپنی زندگی میں مختلف علوم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بعض علوم کا مطالعہ نصابی ضروریات کے لیے اور دیگر علوم کا مطالعہ اپنے علم میں اضافہ کے لیے، اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے کرتے ہیں۔ یو تو ہر کتاب اچھی ہی ہوتی ہے، بہ شرط کہ اس میں اسلام کے حوالے سے کوئی منفی بات نہ ہو، ہمارا وطن پاکستان ہے اس کے بارے میں منفی مواد نہ ہو، قائداعظم محمد علی جناح کے بارے میں منفی بات نہ ہو، بیہودہ گوئی، اخلاق سے گری ہوئی تحریر نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ میری مطالعہ میں بے شمار کتابیں آئیں، بے شمار کتابوں پر اظہار خیال بھی کیا۔ ان میں ایک کتاب جو بنیادی طور پر کراچی شہر کی قدیم تاریخ اور اس دور کی صورت حال کا نقشہ خوبصورت انداز سے پیش کرتی ہے اسے میں اپنی پسندیدہ کتاب سمجھتا ہوں۔ وہ مجھے کیسے ملی، اس کے مصنف کون ہیں؟ اس کتاب میں میرا ذکر اور ان علاقوں، بستیوں، محلوں، گلیوں، سڑکوں، عمارتوں، اسکولوں، کالجوں، تعلیمی اداروں، اس دور کا ٹریفک کا نظام جس میں سرکاری بسوں کے علاوہ، ٹرام، سرکلر ریلوے، گھوڑا گاڑی، سائیکل رکشا، اونٹ گاڑی، گدھا گاڑی

مساجد، وہاں رہائش پذیر مختلف برادریوں، تفریح گاہوں الغرض اس دور کی ایسی تصویر اس میں دکھائی دی کہ میں اس کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب میری پسندیدہ کتاب ہے۔

جناب اقبال اے رحمن مانڈویا کراچی کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کا فون آیا، سلام کا تبادلہ ہوا، انہوں نے اپنا نام بتایا، میں ان سے واقف نہیں تھا، البتہ وہ میرے فیس بک دوستوں کی فہرست میں شامل تھے، ان سے کبھی ملاقات نہیں ہو پائی تھی، فرمایا کہ میں اپنا پوسٹل ایڈریس بتادوں وہ کوئی کتاب بھیجنا چاہتے ہیں۔ میرے اکثر احباب مجھ پر اس قسم کی کرم فرمائی کرتے رہتے ہیں۔ میں نے اپنا پتہ واٹس اپ کر دیا۔ اگلے روز رات ہی میں میسیج ملا کہ انہوں نے اپنے کسی نمائندے کے ہاتھ کتاب مجھے بھیجی، وہ نمائندہ مجھے فون کرتا رہا، اقبال صاحب نے بھی فون کیا لیکن میری جانب سے خاموشی رہی، ان کی یہ بات سن کر مجھے بہت

افسوس ہوا، معذرت چاہتے ہوئے ان سے کہا کہ مجھے اپنا پتہ بتادیں میں خود آکر آپ سے کتاب لے لوں گا، میں ان کے ایڈریس کا انتظار ہی کر رہا تھا کہ دوسرے ہی روز ان کا کوئی نمائندہ ان کی کتاب ''اِس دشت میں اِک شہر تھا'' میرے گھر دے گیا۔ کتاب ہاتھوں میں تھی، میں کتاب پر انتہائی مسرت کے عالم میں شفقت اور محبت سے کبھی ایک ہاتھ کبھی دوسرا ہاتھ کتاب کے سرورق پر پھیرتا رہا، میرے شہر کراچی پر اتنا تحقیقی اور ضخیم کام کرنے والے شخص کے لیے دل سے دعا نکل رہی تھی، اس لمحہ اس کے مصنف کی علمیت، قابلیت اور دریا دلی کا بھی خیال آیا کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ 800 صفحات پر مشتمل بڑے سائز کی کتاب جس کی قیمت /2000 روپے درج تھی مجھے اپنے خصوصی نمائندہ کے ہاتھوں عنایت فرمائی، یہی وہ لمحات بھی تھے جب میرے ذہن میں میری 70 سے زیادہ سال کی زندگی کے نشیب و فراز کی فلم ذہن میں چلنے لگی۔ میں نے اسی لمحے کتاب پر اپنے خیالات کا اظہار کرنے کا بھی فیصلہ کیا۔ تاریخ دان و مصنف گل حسن کلمتی جنہوں نے کتاب کا مختصر فلیپ لکھا اس کتاب کو ''تحقیقی کے بجائے کراچیائی کا کراچی کی گلیوں کا سفرنامہ قرار دیا ہے''، ساتھ ہی اس کی وجہ یہ بیان کی کہ ''اس کتاب میں پورے تحقیقی یا ادارتی آداب نہیں ملیں گے''۔ کلمتی صاحب کی رائے میں وزن ہے لیکن میری رائے میں جستجو، تحقیق، سخت محنت، احباب سے میل ملاقات کے بغیر ایسی کتاب مرتب نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے کراچی کی گلیوں، شاہراہوں، مختلف بستیوں اور مختلف رہائش پذیر برادریوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں مصنف نے جان جوکھوں میں ڈالی ہے۔ اس سے عام قاری ہی نہیں بلکہ مستقبل کا محقق بھی استفادہ کرے گا، نیز کراچی کے کسی بھی پہلو پر تحقیق کرنے والے کے لیے یہ کتاب اہم حوالہ قرار پائے گی۔ کتابوں میں عام طور پر تحقیقی آداب اس انداز سے فراہم نہیں کیے جاتے جیسے کسی تحقیقی مقالے میں ہوتے ہیں۔ لیکن کسی بھی موضوع پر تحقیق کی بنیاد کتاب ہی ہوا کرتی ہے۔

کتاب کے مطالعے کا اصول یہ ہے کہ ہم پہلے کتاب میں درج فہرست مضامین پر ایک نظر ڈالتے ہیں، سو میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ اندازہ ہوا کہ اس میں کراچی کی مختلف بستیوں، علاقوں، جگہوں جیسے بندرگاہ، کلفٹن، ویسٹ وہارف، جزائر، ہاکس بے روڈ، ماری پور روڈ، سائٹ، لیاری، کھارادر، ہر چند رائے وشنداس روڈ، نشتر (لارنس روڈ)، چاند بی بی روڈ (پرنسس اسٹریٹ)، شہراہ لیاقت، آئی آئی چندریگر روڈ، ڈاکٹر ضیاء الدین احمد روڈ، مولوی تمیز الدین روڈ، صدر، ایم اے جناح روڈ، جمشید روڈ۔ اس فہرست کو دیکھ کر میں اپنی یادوں کے سمندر میں غوطے مارنے لگا، یہ سب تو وہ علاقے، بستیاں، شاہراہیں جہاں پر میں صبح و شام گزرا کرتا تھا، کبھی تانگے میں، کبھی سائیکل رکشا میں، کبھی گھوڑا گاڑی میں، کبھی بسوں میں، کبھی ٹرام میں پھر رکشا کا زمانہ آیا، موٹر سائیکل خرید لی تو اس پر انہی سڑکوں پر دوڑتا وقت یاد آ گیا۔ کلفٹن سیر و تفریح، ساحل سمندر کے حوالے سے ہاکس بے جانا، لیاری جس میں میرا بچپن، میری جوانی گزری یہاں تک کے بڑھاپے کی پہلی دہلیز پر بھی یہیں قدم رکھا، مختصر یہ کہ اس کتاب کی فہرست سے اندازہ ہو گیا کہ اس میں بیان کردہ ذیلی موضوعات میں جو کچھ بھی لکھا ہو گا وہ سب میری یادداشتوں میں محفوظ ہے اسے پڑھ کر یقیناً مجھے مسرت ہی نہیں ہو گی بلکہ میرے دل و دماغ کو ایسی آکسیجن میسر آئے گی جو مجھے آج تک کسی اور کوئی کتاب سے حاصل نہ ہوئی ہو گی۔ اب میں نے اگلا صفحہ پلٹا، یہاں فہرست مضامین (تہجی) موجود تھی یعنی فہرست عنوانات میں جو موضوعات دئے گئے ہیں ان موضوعات کے تحت ذیلی موضوعات کو حروف تہجی کے تحت ترتیب دیا گیا ہے ان کے سامنے صفحہ نمبر درج ہے۔ اس فہرست کو دیکھ کر میرے چاروں طبق روشن ہو گئے، وہ چھوٹی چھوٹی جگہیں، علاقے، محلے، اسکول،

کالج، اسپتال، شاہراہیں، مختلف برادریوں جیسے کچھی، بلوچ، اردو بولنے والے، میشوری برادری، نیازی برادری، اوکھائی میمن برادری، لاسی برادری، ریلوے اسٹیشن، مختلف بازار، ہندوستان سے جنگ 1965، چڑیا گھر، ریڈیو پاکستان، سینٹرل جیل، عجائب گھر، قبرستان اور اس دور کی بعض شخصیات کی فہرست دیکھ کر میرا گمان یقین میں بدل گیا کہ واقعی یہ تصنیف ''کراچی کے سنہرے دنوں کی داستان'' ہے جو آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی، آپ بیتی بھی ہے جگ بیتی بھی، زبان عام فہم اور سادہ ہے اقبال اے رحمن مانڈویا صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انہوں نے ماضی کے کراچی کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

حروف تہجی کی فہرست پر نظر ڈالنا شروع ہی کی تھی کہ پہلے آتمارام پریتم داس روڈ اور آگرہ تاج کالونی کا نام دیکھ کر میں وہیں رک گیا۔ آتمارام پریتم داس روڈ لیاری ندی کے دائیں جانب مرزا آدم خان روڈ سے بس اسٹاپ 10 نمبر کہلاتا تھا سے شروع ہوتی ہوئی بائیں جانب بہار کالونی اور دائیں جانب آگرہ تاج کالونی، پنچھی کالونی، جونا آباد، کلری، موسیٰ لین، بغدادی کے درمیان سے ہوتی ہوئی کھارادر تک جاتی ہے۔ عرصہ دراز تک زیادہ استعمال ہونے والی یہی سڑک تھی، ہمیں کھارادر، جوڑیا بازار، مچھی میانی مارکیٹ، ٹاور یا کیماڑی جانا ہوتا تو آتمارام پریتم داس روڈ کے دوسرے بس اسٹاپ آگرہ تاج کالونی کا بس اسٹاپ کہلاتا تھا، جو شاہین اسکول اور غازی محمد بن قاسم اسکول پر تھا سے 10 نمبر بس میں یا پھر تانگے یا گھوڑا گاڑی (بگی) میں فی سواری کے حساب سے کھارادر تک پہنچ جایا کرتے پھر اگلا سفر شروع ہوا کرتا۔ یہ سب کچھ تو اپنے سے متعلق اور اس وقت کے لمحات و روز و شب جو ذہن میں آئے بتا دیے۔ یہ بات بھی واضح کروں پاکستان میں میری رہائش والدین کے ہمراہ بہار کالونی میں حنیف منزل روڈ پر آغا خان کے جماعت خانے کے بالکل برابر والا گھر میرے والدین کا تھا جو انہوں نے اپنے ماموں جناب خادم الانبیاء سبزواری کے اشتراک سے پلاٹ خرید کر بنایا تھا، لیکن جائیداد بری بلا ہے، چند سال بعد والد صاحب نے حالات سے سمجھوتا کرتے ہوئے اس گھر کو خیر باد کہا اور آگرہ تاج کالونی میں ایک پلاٹ خرید کر رہائش اختیار کر لی۔ میں نے عبداللہ ہارون کالج، کھڈا مارکیٹ سے اس وقت بی اے کیا تھا جب معروف شاعر جناب فیض احمد فیض کالج کے پرنسپل تھے، یعنی 70-1969 میں، اس کے بعد ایم اے کرنے کے بعد کالج میں ملازمت مل گئی، اتفاق کہ 1974 میں تبادلہ عبداللہ ہارون گورنمنٹ کالج میں ہو گیا۔ لیکن فیض صاحب نے 1972 میں کالج کو اس وقت خیر باد کہہ دیا تھا جب بھٹو صاحب نے تعلیمی اداروں کو سرکاری تحویل میں لے لیا تھا، اب ہمارا سفر ماری پور روڈ سے ہونے لگا، اس زمانے میں کے آر ٹی سی (KRTC) بسیں چلا کرتی تھیں، کبھی ہم پیدل ہی اپنے کالج آنے جانے لگے، ہمارا راستہ شاہ ولی اللہ روڈ ہوا کرتا تھا جس سڑک پر دریا آباد واقع ہے وہاں سے سیدھے سیدھے کھڈا مارکیٹ (نوا آباد) جس کا جدید نام میمن سوسائٹی ہے پر کالج پہنچ جایا کرتے۔ یہ مختصر سی باتیں تھیں اس زمانے کی ہمارے حوالے سے۔ لیکن ان سب کا ذکر اقبال اے رحمن صاحب نے مرحلہ وار اپنی کتاب میں کیا ہے۔ کالج سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ پڑھنے، پڑھانے اور لکھنے اور چھپنے کی عادت میں بھی مبتلا ہو گیا، مختلف موضوعات پر لکھتا رہا، نصف صدی ہونے کو آئی یہ سلسلہ جاری و ساری ہے۔ چالیس کتابیں اور سات سو مضامین آن لائن ہیں، اپنی آپ بیتی پر کئی مضامین، شخصیات، خاکے، کالم نگاری، کتابوں پر تبصرہ نگاری، نصابی کتب، ادب اور ادبی موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔

پیش نظر کتاب کے حوالے سے ایک اور اہم بات، کتاب پر اظہار یہ لکھنا شروع کیا تو حروف تہجی کے تحت موضوعات کی فہرست میں تیسرے نمبر پر موضوع کا عنوان تھا ''آگرہ تاج کالونی''، میری نگاہیں اس پر منجمد ہو گئیں، اور میں فوری طور پر ان صفحات پر پہنچ گیا۔ اس عمل کی وجہ اس بستی سے میری کئی وابستہ یادیں ہیں۔ بچپن یہاں گزرا، جوانی کی بہاریں اسی بستی میں آئیں اور جوانی نے اسی جگہ سے واپسی کا سفر شروع بھی کیا یعنی بڑھاپے کی دہلیز پر یہیں قدم رکھا بہار کالونی اور آگرہ تاج کالونی میں میری قیام کی کل مدت 39 سال پر محیط ہے جب کہ لیاری سے میری وابستگی 49 سالوں پر محیط ہے۔ اس لیے کہ ہم 1987 میں آگرہ تاج

مصنّف لائق تبریک کہ ماضی کے کراچی کو دوبارہ زندہ کر دیا

کالونی سے دستگیر منتقل ہو گئے تھے جب کہ کالج سے وابستگی 1997 تک رہی۔ ان صفحات کا مطالعہ شروع کیا جو صفحہ 140 سے شروع ہوتا ہے اگلے ہی صفحہ یعنی 141 پر پہنچا تو پھر چونک گیا، مصنف نے میرے ایک مضمون سے ایک پیراگراف نقل کر رکھا ہے اس پیراگراف کے نیچے میرا نام بھی درج ہے، دیکھ کر خوشی ہوئی، کہ مصنف نے کراچی کے موضوع پر تفصیلی تحقیق و جستجو کی ہے۔ لکھتے ہیں ''پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد ابتدائی 25 برسوں میں لوگوں نے اپنی زندگی جس طرح بسر کی ڈاکٹر رئیس صمدانی صاحب کی یادداشتوں سے عیاں ہے''۔ اس جملے کے بعد میری زندگی کے ابتدائی ایام کی کچھ باتیں نقل کی گئی ہیں جس میں بہار کالونی سے آگرہ تاج کالونی منتقل ہونے کا ذکر، وہ گھر جس میں رہائش تھی اس کی خستہ حالی اور اس وقت کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ اسی موضوع کے تحت اس علاقے کی تفصیل غازی محمد بن قاسم اسکول اور اس کے صدر مدرس سید ابوظفر آزاد کا ذکر، ان کی شریک حیات ڈاکٹر عطیہ ابوظفر کا ذکر، ان کے بچوں، اور بچوں کے بچوں کا ذکر اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ان کے خاندان میں کل ملا کر 40 ڈاکٹرز ہیں۔ آزاد صاحب میرے استاد رہے، میں نے پرائمری تعلیم غازی محمد بن قاسم اسکول سے حاصل کی تھی۔ بہار کالونی کے قیام کا ذکر، وہاں کی مساجد، اسکول، سڑکوں، علاقوں، وہاں رہائش پذیر مختلف برادریوں کا ذکر ملتا ہے۔ کتاب کے اس حصہ کو پڑھ کر اندازہ ہو گیا کہ مصنف نے ماضی کی کراچی کے مختلف علاقوں، سڑکوں، بستیوں، اہم عمارتوں، برادریوں کو تفصیل سے موضوع بنایا اور تحقیق کرنے کے بعد اسے قلم بند کیا۔

پیش نظر تصنیف کے ناشر زاہد علی خان نے عرض ناشر میں لکھا ''یہ داستان ہے اس شہر نگاراں کی گلیوں محلوں، برادریوں، شخصیات اور عمارتوں کی، اس میں تذکرہ ہے ان گم نام ہیروز کا جنہوں نے اس شہر کو تعمیر کیا اور عالم اسلام کا دوسرا ور دنیا کا چوتھا بڑا شہر بنا دیا''۔ کتاب کے مصنف اقبال اے رحمن مانڈویا نے عرض مصنف میں لکھا کہ ''یہ کتاب ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے جسے علمی و ادبی دوستوں کے مشوروں نے سند توثیق بخشی ہے، ساتھ ہی انہوں نے ان احباب کا شکریہ بھی ادا کیا جو اس کتاب کی تدوین میں ان کے قدم بہ قدم رہے''۔ عروس البلاد کراچی کے ایڈمن عمران اشرف جونانی نے کتاب کی پشت پر کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں تفصیل فراہم کی کہ یہ کتاب کس طرح ترتیب پائی۔ وہ لکھتے ہیں کہ اقبال اے رحمن علمی و کاروباری خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد عبدالرحمن اسیر علمی و ادبی ذوق کے حامل صاحب کتاب ادیب تھے جب کہ ان کے چچا یوسف مانڈویا صاحب نامور ادیب و بے باک صحافی تھے۔ جونا گڑھ سے گجراتی اخبار مجاہد نکالا کرتے تھے۔ مجاہد کے ساتھ ساتھ انہوں نے کئی کتابیں بھی ترتیب دیں جن میں سب سے اہم سیرت النبی ﷺ پر صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب ہے۔ اسی ادبی فضاء نے وقت آنے پر اپنا اثر دکھایا جس کا ثمر آج ''اِس دشت میں اِک شہر تھا'' کی صورت میں ہمارے سامنے ہے''۔

کراچی ایک تاریخی شہر ہونے کے ساتھ عالم اسلام کا دوسرا اور دنیا کا چوتھا بڑا شہر ہے۔ کراچی پر بے شمار محققین اور مصنفین نے قلم اٹھایا، تحقیقی مقالات بھی لکھے گئے، کتابیں اور مضامین بھی۔ میرے ایک شاگرد ڈاکٹر عظیم الشان حیدر نے جامعہ کراچی سے ''ہسٹری آف کراچی'' کے عنوان سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ کراچی کی اہمیت کے پیش نظر کراچی پر تحقیق و جستجو کا سلسلہ مستقبل میں بھی جاری و ساری رہے گا۔ کتاب یقیناً اس شہر کے باسیوں کے لیے خاص طور پر دلچسپ اور معلوماتی ہے، بلکہ عام قارئین کے لیے، تحقیق کرنے والوں کے لیے اہم حوالہ ہے، البتہ اس کتاب کا کراچی وہ نہیں جواب ہے بلکہ اس میں ماضی کے کراچی کو خوبصورت انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ موجودہ کراچی اپنی جغرافیائی اعتبار سے وسیع تر ہو چکا ہے، بے شمار نئی آبادیاں معرض وجود میں آ چکی ہیں، نئی نئی سڑکیں، بلند و بالا عمارتیں، تفریحی مقامات کراچی کا حصہ بن چکے ہیں۔ اس کراچی کو بھی کتابی صورت میں سامنے لانا ضروری ہے۔ کراچی اپنا حسن، خوبصورتی، صفائی ستھرائی کھو چکا ہے، آج کراچی کو کچرا کراچی، ٹوٹی پھوٹی سڑکوں والا کراچی، منشیات، سیاسی ابتری، لوٹ مار، ڈاکے، چوری، پرچی، مال بنانے الغرض کون سی ایسی برائی ہے جو اب کراچی کے نام کے ساتھ منسلک نہیں کی جاتی۔ یہ ایک الگ اور اہم موضوع ہے کہ کراچی کو اس حالت پر پہنچانے میں کس کس نے کیا کیا کردار ادا کیا، اس کا تعین کون کرے گا، ہو پائے گا بھی یا نہیں، کیا کراچی اپنی ماضی کا حسن و خوبصورتی بحال کر سکتا ہے اگر ممکن ہے تو کیسے۔ تاریخ بڑی بے رحم ہوتی ہے، کراچی کی تاریخ جب لکھی جائے گی تو وہ تمام حقائق سامنے آ جائیں گے بلکہ اب لوگوں میں اتنا شعور پیدا ہو چکا ہے کہ وہ ان حقائق پر میڈیا پر گفتگو کرنے کی جرت کرنے لگے ہیں۔ آخر میں کتاب کے بارے میں اس قدر کہنا چاہوں گا کہ یہ کراچی کے حوالے سے ایک بہترین کتاب ہے، بھرپور معلومات، سہل انداز بیان، اسے ہر کتب خانے کی زینت ہونا چاہیے۔ ۞

پسندیدہ موضوعات۔اسلام۔تاریخ۔ادب۔آپ بیتیاں

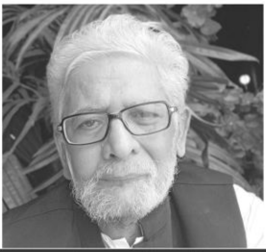

تحریر: شبیر ابن عادل

یوں تو مطالعہ کا سلسلہ ہوش سنبھالنے سے جاری ہے، پہلے میرے والدِ محترم عادل جہانگیری (ناول نویس، مصنف) بچوں کی دنیا، نونہال اور بچوں کے دیگر جرائد ہم بہن بھائیوں کو لاکر دیا کرتے تھے۔ اُن کو پڑھ پڑھ کر یہ شعور حاصل ہوا کہ دنیا میں کچھ کرنا ہے تو کتابوں سے رشتہ برقرار رکھنا ہوگا۔ چنانچہ جب جوانی کی حدود میں قدم رکھا تو چار شادیوں کی طرح میں نے مطالعہ کے لئے چار موضوعات کو چنا۔ جن میں اسلام، تاریخ، ادب اور آپ بیتیاں شامل تھیں اس کے علاوہ ان موضوعات کے علاوہ کسی ایسی کتاب کا مطالعہ بھی کرلیتا جو لوگوں میں مشہور ہوتی۔

حال ہی میں میرے دوست اور مائنڈفلنس ٹیچر اور لائف کوچ سید عرفان احمد کی کتاب ''کاش'' کا چرچا سنا۔ جسے فضلی سنز کراچی نے شائع کیا ہے تو اس کو فوراً منگوالیا۔ عرفان کا شمار میرے مخلص دوستوں میں ہوتا ہے۔ وہ گزشتہ 38 سال سے تحریر، ترجمہ اور تدوین سے وابستہ ہیں ماہنامہ سائنس میگزین، ہمدرد نونہال، ہمدرد صحت کے معاون مدیر رہے اور پھر 2005 میں شخصی نمو (پرسنل ڈیولپمنٹ) کے موضوع پر اردو کی تاریخ کا پہلا جریدہ جاری کیا مجموعی طور پر پینتیس (35) سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔

کتاب کے مطالعہ سے قبل اس کے سرورق اور گیٹ اپ پر نظر پڑتی ہے تو وہ بھی بہت عمدہ اور جاذبِ نظر تھا۔ 208 صفحات کی اس منفرد کتاب کا ایک ہی نشست میں مطالعہ کرڈالا۔ میں نے تین وجوہ کی بناء پر تازہ ترین کتاب ''کاش'' کو منتخب کیا، اُس کے مصنف میرے دوست سید عرفان احمد تھے، میرے دوستوں یعنی طارق فضلی اور ساجد فضلی کے ادارے فضلی سنز (اسے میں اپنا ادارہ اور اپنا محسن سمجھتا ہوں) نے شائع کیا تھا اور تیسرے یہ کہ اس کا تعلق انسانوں کی زندگیوں سے تھا۔ میں نے دوبارہ 208 صفحات کی اس کتاب کا ایک ہی نشست میں مطالعہ کرڈالا۔ یہ کتاب بنیادی طور پر ''پچھتاووں'' کے بارے میں ہے۔ انسان پچھتاووں سے مرکب ہے۔ ترقی یافتہ ممالک میں شخصی نمو (پرسنل ڈیولپمنٹ) کے ادب میں دیگر انسانی پہلوؤں کے علاوہ پچھتاووں پر بھی بہت تحقیقات کی گئی ہیں اور اس موضوع پر گزشتہ پچیس تیس برسوں میں درجنوں کتابیں تحریر کی جاچکی ہیں۔ مضامین اور ویڈیوز اس کے سوا ہیں۔ ان میں سب سے معروف کتاب برونی ویئر کی کتاب The Top Five Regrets of Dying ہے جو 2011 میں پہلی بار شائع ہوئی۔

موت سب سے بڑی حقیقت ہے اور عام طور پر ہم لوگ اپنی

لائف کوچ۔ سید عرفان احمد کی تصنیف ''کاش''

موت کو بھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ جنازوں میں جاتے ہیں، حادثات میں ہلاکتوں کی خبریں پڑھتے اور سنتے ہیں اس کے باوجود اپنی زندگی کی ڈگر تبدیل نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ ہم موت کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے کہ جب آدمی خود سے کہتا ہے: کاش، میں وہ کرتا جو میں چاہتا تھا، کاش، مجھے معلوم ہوتا کہ ایسا کرنے سے یہ نقصان ہوگا۔ کاش، میں فلاں کے مرنے سے پہلے اپنے کئے کی معافی مانگ لیتا۔ افسوس، میں نے جوانی آوارہ گردی میں گزاردی، اب کوئی ہنر نہیں کہ کماسکوں۔ ان پچھتاووں کی ایک طویل فہرست ہے۔ اس وجہ سے پوری دنیا میں پچھتاووں کو موویز کا موضوع بنایا گیا ہے تو ان پر سائنسی تحقیقات بھی ہوتی رہی ہیں اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ گوگل پر لفظ regret سرچ کریں تو آپ کو مشہور سلیبریٹیز کے پچھتاووں پر کثرت سے بلاگز پڑھنے کو مل جائیں گے۔ ''پچھتاوا'' کے موضوع پر اتنی بڑی تعداد میں کام ہونے کا مطلب ہے کہ پچھتاوا آدمی کی زندگی کا بہت ہی

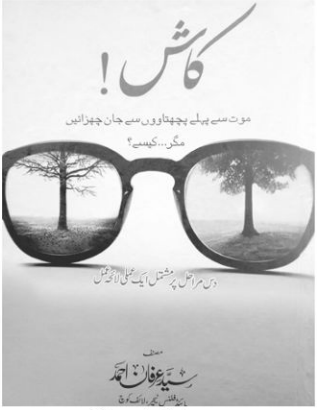

اہم پہلو ہے اور اس کے لئے لوگوں کو رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میری معلومات کے مطابق اردو زبان میں اب تک اس موضوع پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ ''کاش'' کا موضوع علمی اور منطقی سطح پر پچھتاوے کو سمجھنا اور پھر اس سے نجات کے لئے جدید نفسیاتی مشقوں اور اسلامی اصولوں کی مدد سے اپنے پرانے اور نئے پچھتاووں کو چھوڑنا ہے۔ کتاب کا مواد ان کیٹیگریز پر مشتمل ہے: پچھتاووں اور ان کے بارے میں مفصل معلومات مع سائنسی حقائق، مشقیں، تجاویز/مشورے، ایکشن لسٹ اور آئندہ زندگی میں (بالخصوص موت سے پہلے) مزید پچھتاووں سے بچاؤ کا لائحہ عمل۔ اس کے بعد کتاب میں چند عام پچھتاووں کی فہرست دی گئی ہے، فہرست میں 50 پچھتاوے شامل ہیں۔

''پچھتاوا'' ایک ناخوشگوار جذباتی کیفیت کا نام ہے جس کی بنیاد اس یقین یا سوچ پر ہوتی ہے کہ اگر میں ماضی میں فلاں کام (یا فیصلہ) نہ کرتا (یا کرتا) تو میں آج اس مسئلے (نتیجہ) سے محفوظ رہتا۔ گویا، ماضی کے اس عمل پر افسوس ہے جو کیا گیا (یا نہیں کیا گیا)۔ عمل مختلف ہوتا تو یقینا نتیجہ بھی مختلف ہوتا۔ یہ جذباتی کیفیت آدمی کے اندر یہ ناقابل عمل خواہش پیدا کرتی ہے کہ کاش، ماضی کا کوئی ایک مختلف ہوتا۔ پچھتاوا نفسیات کے اعتبار سے حقیقت سے متصادم سوچ (Counterfactual

Thinking) ہے جس کے تحت آدمی اس ادھیڑبن کا شکار ہوجاتا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو ویسا ہوتا (What ifs)، اور پھر اس سوچ کے تحت آدمی اس ماضی کے ایسے عمل کا تصور کرنا شروع کردیتا ہے جو اسے کرنا چاہیے تھا یا اُس نے نہیں کیا۔ پھر وہ مطلوبہ اقدام یا فیصلہ نہ کرنے کی وجہ سے جو نقصان ہوا ہے یا مطلوبہ نتیجہ نہیں ملا ہے، اس پر غور کرکے مغموم اور افسردہ ہوجاتا ہے۔ یہ ''پچھتاوا'' ہے۔

امریکا میں پچھتاوے کے محرکات و مزاج کو جانچنے کے لئے کچھ عرصہ قبل American Regret Project شروع کیا گیا جس میں ماہرین نے چار ہزار 489 افراد سے یہ سوال کیا کہ ''آپ جب اپنی زندگی پر پیچھے کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو کتنی بار یہ چاہتے ہیں کہ کاش، چیزیں آج سے مختلف ہوتیں۔

کتاب میں پچھتاووں کی اقسام، پچھتاووں کو چھوڑنے کا لائحۂ عمل، دس مرحلوں پر مشتمل پچھتاووں کو چھوڑنے کا طریقہ، اسی میں جرنل میں اپنے پچھتاووں اور اعترافات لکھنے، روحانی اور نفسیاتی آلات کا استعمال، دعا کی فضیلت۔ کتاب کے دوسرے حصے میں پچھتاووں سے نجات کے لئے دس مراحل اور ہر مرحلے کو ایک باب میں سمویا گیا ہے۔ پہلے مرحلے میں پچھتاووں کی فہرست کی تیاری کی ترغیب دی گئی ہے۔ دوسرے مرحلے میں پچھتاووں کا جائزہ، تیسرا مرحلہ: سوچ کے زہریلے ڈھب میں تبدیلی، چوتھا مرحلہ: نقصانات کا غم، پانچواں مرحلہ: اصلاح کرنا، ساتواں مرحلہ: ہمدردی کی

نشوونما، آٹھواں مرحلہ: دوسروں کو معاف کرنا، نواں مرحلہ: خود کو معاف کرنا اور دسواں اور آخری مرحلہ: پچھتاووں سے آزاد زندگی۔

یہ کتاب اُن کتابوں میں سے نہیں کہ اس کے مطالعہ کے بعد بک شیلف میں رکھ دیں۔ بلکہ یہ گائیڈ بک ہے، پچھتاووں سے

پچھتاوے کے موضوع پر مغرب میں بہت سی کتابیں

نجات حاصل کرنے یا ماضی میں کئے گئے کاموں پر پچھتاووں سے نجات حاصل کرنے کی ورک بک۔ اسے پڑھتے جائیں اور ایک ایک کرکے ماضی کی غلطیوں پر پچھتاووں سے نجات حاصل کرتے جائیں۔ کیونکہ انسان اپنی زندگی ماضی کے پچھتاووں اور مستقبل کے اندیشوں سے برباد کرلیتا ہے۔ اس

کا ایک ہی طریقہ ہے کہ ماضی میں جو ہوا سو ہوا، اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر بھول جائیں۔ مستقبل کی منصوبہ بندی کریں اور نتیجہ اپنے ربّ پر چھوڑ دیں اور اطمینان سے اپنی زندگی گزاریں۔ یقین جانئے کہ یہ آزمودہ نسخہ ہے، پرسکون زندگی گزارنے کا۔

میرے شہر کراچی میں میری پسندیدہ کتاب کی دکان ''فضلی بک سپر مارکیٹ'' ہے جسے ساجد فضلی چلا رہے ہیں اور ان کے بڑے بھائی طارق رحمن فضلی سے میرے چار عشروں پر مشتمل تعلقات ہیں۔ فضلی سنز کتابوں کے پبلشر بھی ہیں اور بک سیلر بھی۔ جبکہ طارق فضلی کی کراچی سائیٹ ایریا میں پیکجنگ پرنٹنگ کی فیکٹری ہے۔ جس میں ڈبوں، پیکٹوں اور پلاسٹک پر پرنٹنگ کی جاتی ہے۔ یعنی اداروں کی پیکجنگ کی پرنٹنگ کی جاتی ہے۔

فضلی بک کی بنیاد فضل الرحمن نے اردو بازار، کراچی میں رکھی، اُن کی خواہش تھی کہ وہ پرنٹنگ کے ساتھ ساتھ پبلشنگ کے میدان میں بھی اتریں۔ وہ 1982 میں ہندوستان گئے تو مولانا وحیدالدین خان مرحوم سے متاثر کن ملاقات ہوئی، انہوں نے وطن واپس آکر ان کی بیس (20) کتابیں شائع کی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے قرآن حکیم کی اشاعت کے لئے اس کی کتابت مفتی شفیع صاحب کے داماد مولانا نور احمد سے کرائی۔ انہوں نے 1984 میں قرآن پاک معریٰ شائع کیا۔ اس طرح پبلشنگ کے شعبے کی بنیاد پڑی، جس میں قرآن پاک، پنج سورے اور دعاؤں کی کتب کی اشاعت شروع ہوئی۔

اس زمانے میں اُن کے بڑے صاحبزادے طارق رحمن فضلی کالج سے سیدھے فضلی پرنٹنگ پریس آجاتے۔ اس وقت تک ادارے کی نہ کوئی دکان تھی اور نہ کوئی باقاعدہ پبلشنگ ہاؤس۔

1989 میں فضل الرحمن صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اور ان کے بڑے صاحبزادے طارق الرحمن فضلی نے ادارے کو سنبھالا اور کئی اور کتابوں کی اشاعت کی۔ 1996 میں اردو بازار ہی میں اپنے آفس کے سامنے پہلی منزل پر اپنے پرانے فلیٹ کی پہلی منزل پر ''فضلی بک سپر مارکیٹ'' کے نام سے بک شاپ قائم کی جسے میڈیا اور علمی و ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا۔ طارق فضلی نے سن 2000 میں پرنٹنگ کے سیٹ اپ کو سائیٹ شفٹ کرلیا۔ جس کے بعد ان کے چھوٹے بھائی ساجد رحمن نے، جنہوں نے آئی بی اے سے ماسٹرز کیا تھا، پبلشنگ کا کام سنبھال لیا اور وہ اسے بحسن و خوبی چلا رہے ہیں۔ انہوں نے بہت سے نئے تجربات کئے۔

پہلے اپنی تحریر کی اشاعت پر خوشی پھر تحریر کی پذیرائی پر مسرت

تحریر: نسیم انجم

حساس طبیعت اور مطالعہ کی عادت نے مجھے لکھاری بنادیا' طالب علمی کے زمانے میں فارغ اوقات میں خوب کتابیں پڑھیں، ابتدا میں بچوں کے رسائل، نونہال، پھول، آداب عرض، اور اخبارات کے

چار افسانوی مجموعے۔ چھ ناول ایک کالموں کا مجموعہ

بچوں کے ایڈیشن جو'نونہال' یا بچوں کی دنیا عنوانات ہر ہفتے کے دن شائع ہوتے تھے۔

شاعری، لطائف، سائنسی معلومات پر مبنی، تاریخ، فلسفہ، جنرل نالج، غرض ہمارے مطالعہ میں مختلف موضوعات کی کتب شامل تھیں، خوب محظوظ ہوئے۔

لیکن نہ جانے کب بچپن بیت گیا، اور ہمارے ہاتھوں میں افسانوں کے مجموئے' ناول آ گئے۔ قرۃ العین حیدر کا آگ کا دریا، کرشن چندر، عبدالحلیم شرر، نسیم حجازی، منشی پریم چند کا ''گیسودان'' اور افسانہ 'کفن' بار بار پڑھا۔ منٹو کا ٹوبہ ٹیک سنگھ' نیا قانون' ممتاز مفتی کا ''علی پور کا دہلی'' بہت سے مصنفین کی تحریریں پڑھ ڈالیں پڑھنے کا جنون تھا ایک دن میں ایک ضخیم ناول پڑھ لیا کرتے تھے۔

پڑھتے پڑھتے لکھنے کی طرف آ گئے اور جب سماجی و معاشرتی مسائل پر چند کہانیاں اور مضامین لکھ لیے تو دل چاہا ان کی اشاعت ہو' روزنامہ جنگ' روزنامہ امن' نوائے وقت' سہ ماہی، سب رس' اور دوسرے جرائد میں تحریریں بذریعہ ڈاک بھیجیں جب ہماری تخلیقات کی اشاعت ہوئی تو حیرانی اور خوشی کی انتہا نہیں تھی، حوصلہ بڑھا تو بڑے اور معیاری پرچوں میں لکھنا شروع کیا، 'افکار'، 'طلوع افکار' ، 'تخلیق'، ماہنامہ 'صریر' مدیران رسائل اور قارئین اور خاص کو ہمعصر قلمکاروں نے توصیفی رائے دی تو پھر اس دلکش کامیابی نے ہماری تحریروں میں چار چاند لگادیے۔ انہی دنوں ناول، 'کائنات' لکھنا شروع کیا، اس کی اشاعت کا مرحلہ بھی آ گیا پانچ سو چھپوائے تھے، ماشاء اللہ بہت جلدی ختم ہو گئے۔

یہ وہ ایام تھے جب لکھنے کی امنگ جنون میں بدل گئی اور لکھنا پڑھنا گویا اوڑھنا بچھونا ہوا، شادی، تعلیم، بچوں کی آمد سب کچھ ساتھ چلتا رہا، سونے پر سہاگا یہ کہ ملازمت بھی کرلی، تدریس کے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دیے، اسپورٹس انٹرنیشنل میں سب ایڈیٹر کی ملازمت کی اس کے بعد ماہنامہ 'چاند گاڑی' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا، اس رسالے کے مصنف ایڈیٹر ممتاز صحافی اور کئی سیاسی و معاشرتی کتابوں کے مصنّف آغا مسعود حسین تھے۔ برابر میں ہی محترم و مکرم جناب پروفیسر حسنین کاظمی کا دفتر تھا، فارغ اوقات میں ان کی عالمانہ گفتگو سے فیض حاصل کیا، ڈاکٹر حسنین کاظمی ایک ادبی پرچہ 'دائرے' کے نام سے شائع کرتے تھے جناب ڈاکٹر مشرف احمد مرحوم ایڈیٹر کی حیثیت سے امور انجام دیتے تھے لہٰذا ہم سے بھی افسانے طلب کیے۔ ماہنامہ دائرے' کی زینت بنے اور آہستہ آہستہ ہمارا شُمار معتبر لکھاریوں میں ہونے لگا۔ الحمد اللہ، کالم ہم نے 2000 میں روزنامہ 'ایکسپریس' میں لکھنے شروع کیے جناب طاہر نجمی ایڈیٹر تھے۔ پہلے ہی کالم کی اشاعت کے بعد ہی ایڈیٹر صاحب نے دل کھول کر تعریف کی اور قارئین کی 'میل' آنے لگیں۔ فون پر گفتگو ہوتی۔ جناب محمود شام کے پرچہ 'معیار' میں ہماری تحریریں اور تعارف شائع ہوا۔ ہم نے ایدھی سینٹر اور انصار برنی ٹرسٹ کی غمزدہ خواتین کے انٹرویوز کیے آپ بیتی لکھیں ان کی مجبوری، غم اور محرومی نے دل تڑپا کر رکھ دیا کہ کس طرح اپنے خون کے رشتے اپنوں سے عاجز آ کر محتاج خانوں میں چھوڑ آتے ہیں، اپنی جنت کو ٹھکرا دیتے ہیں۔ ان دنوں جناب محمود شام جنگ اخبار کے غالباً گروپ ایڈیٹر تھے۔ ان کے دفتر گئے اور ان سے اپنا مدعا بیان کیا بغیر پیش و پس کے انہوں نے کہانیوں کی اشاعت کی اجازت دے دی۔ پھر ہمارے یہ انٹرویوز جنگ اخبار کے سنڈے میگزین میں قسط وار شائع ہوئے، عنوان تھا' زندگی اے زندگی' ہماری محنت، جدوجہد اور قابل قدر حضرات کا تعاون تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کامیابی کی آسمان پر قدم رکھ دیا۔

بڑی خواہش تھی کہ ہماری بھی کتابیں شائع ہوں سرورق پر ہمارا نام جگمگا رہا ہو۔ دھنک رنگوں سے مرصع ہو۔ تو الحمد للہ۔ آج 13 کتابوں کی مصنّفہ ہوں۔ نام بھی جگمگایا۔ اور شہرت بھی حصے میں آئی۔ یہ سب کچھ اللہ کے کرم اس کی مہربانی اور ہماری شب و روز محنت کے نتیجے میں حاصل کیا۔

الحمد للہ میری کتابوں کو یونیورسٹی کی سطح پر پرکھ اور جانچا گیا اور طلبا و طالبات نے ایم فل، ایم ایس اور بی ایس کے طلبہ نے پندرہ مقالے لکھ کر ڈگری حاصل کی اور مزید کام ہو رہا ہے الحمد للہ۔

میری کتابوں کی تفصیل درج زیل ہے۔

1۔ دھوپ چھاؤں۔ افسانوں کا مجموعہ 1982

2۔ گلاب فن اور دوسرے افسانے۔ 1982

3۔ آج کا انسان۔ 1990

4۔ قطرہ قطرہ زندگی۔ 2022

ناول تعداد چھ

1۔ کائنات۔ 1998   2۔ نرک۔ 2007

3۔ پتوار۔ 2013   4۔ آہٹ۔ 2014

5۔ سر بازار رقصاں۔ 2018   6۔ مٹی کی دنیا۔ 2024

کالموں کا مجموعہ۔ 2020

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے (تنقید) تجزیاتی مطالعہ پر مبنی۔

خاک میں صورتیں اور اُردو شاعری

کتابوں کے ترجمے انگریزی اور سندھی میں بھی ہوئے

فضا اعظمی کے فلسفہ خوشی کا تجزیاتی جائزہ

ہماری کتابوں کے تراجم مختلف زبانوں میں ہوئے ہیں۔

افسانوں کا مجموعہ۔ ''گلاب فن اور دوسرے افسانے،، اس کتاب کا ترجمہ جناب ذوالفقار گادھی صاحب نے ''ہک وک جوسفر' کے عنوان سے کیا ہے۔

ذوالفقار گادھی ماہر تعلیم، شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔

انگریزی میں ترجمہ میرے ناول 'نرک' کا ترجمہ Off the Paradiz کے عنوان سے تنویر رؤف صاحبہ نے کیا ہے۔

سندھی زبان میں 'نرک' کا ترجمہ سندھی کے ادیب اور مترجم ننگر چنا نے کیا ہے۔

جناب ذوالفقار گادھی نے 'نرک' کا۔ اس کا عنوان ہے ''ادھ ماڑو''۔

یہ ناول اشاعت کے مرحلے میں ہے۔

ہم نے ریڈیو پاکستان کے بہت سے پروگراموں میں حصہ لیا۔ افسانے سنائے۔ وہ ہی افسانے ریڈیو کے رسالے آہنگ میں شائع ہوئے۔ ''شیشہ ٹوٹ جائے گا'' یہ ناول مقصود الٰہی شیخ کا ہے ہم نے ڈرامائی تشکیل کے مرحلے سے گزارا۔

نسیم احمد خان پروڈیوسر تھے۔ ادبی پروگراموں میں شرکت کی۔ ۞

اطراف مطبوعات

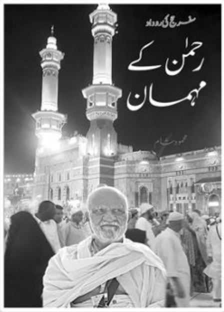

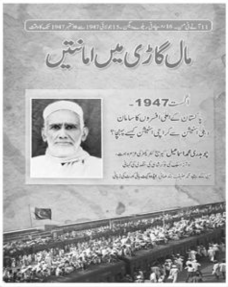

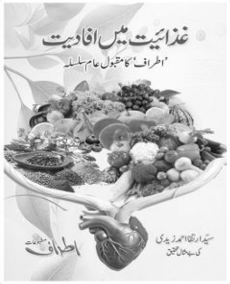

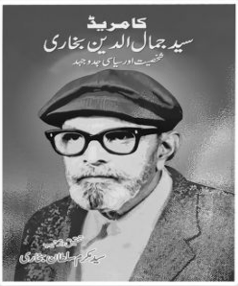

ملنے کا پتہ: A-262، بلاک 3، گلشن اقبال۔ کراچی

واٹس ایپ: 0300-8210636

ڈھاکہ میں کتاب کی دوکانیں

بنگال بوئی۔ کتابوں کے ساتھ ساتھ قیمہ سموسے۔ آلو چاپ۔ چائے

ڈھاکے سے شبانہ نوید کی مہربان تحریر

بنگالی ہمیشہ سے مطالعہ کے شوقین رہے ہیں۔۔۔۔۔کتابوں سے محبت ان کی سرشت میں شامل ہے۔۔۔۔۔آج کل جیسے ساری دنیا میں کتب پڑھنے کا رجحان کم ہو گیا ہے بنگالی بھی اس سے مبرا نہیں۔۔۔۔۔۔

ڈھاکہ میں کتابوں کی بہت بڑی بڑی دوکانیں یا بک اسٹور ہیں جہاں بنگلہ انگریزی دونوں زبانوں میں ہر موضوعات پر کتابیں مل جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔

ہر سال بے شمار نئے لکھنے والے اپنی تصنیفات لے کے حاضر ہوتے ہیں۔۔۔۔

کئ ایک مشہور کتاب کی دوکانیں ہیں جو کافی منفرد انداز میں اپنے قاری کو خوش آمدید کہتی ہیں۔۔۔۔۔ان کتب کی دوکانوں پر جانا بھی خوش کن احساس ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔کئ ایک مشہور کتابوں کی دوکان ہے جیسے کہ۔۔۔۔

بنگال بوئی

یہ کتاب کی ایک بہت عمدہ دوکان ہے۔۔۔یہاں بنگلہ ،انگریزی دونوں زبانوں میں ہر موضوعات پر کتابیں مل جائیں گی۔۔۔۔۔بہت وسیع لان میں کھلے آسمان کے نیچے درختوں سے گھرے لان پر میز کرسیاں لگی رہتی ہیں، ہر میز کے پاس ایک کتابوں بھرا شیلف ہوتا ہے جہاں کتابیں سجی رہتی ہیں، ساتھ ہی قیمہ سموسے، آلو سموسے، آلو چاپ، چائے، کافی کا انتظام ہے۔۔۔اس کے علاوہ صبح یہاں پر ناشتے کا بھی انتظام کر رکھا ہے انتظامیہ نے۔۔۔۔۔دوستوں، فیملی کے ساتھ لوگ آتے ہیں ناشتہ کرتے ہیں اور کتابوں پر تبصرے کرتے ہیں، ایک دوسرے کو نئ کتابوں سے متعارف کرواتے ہیں۔کوئ بھی کتاب منتخب کر کے چائے، کافی کے ساتھ لطف اٹھایا جاسکتا ہے۔۔۔۔۔لان سے کچھ فاصلے پر کتاب کی بہت خوبصورت دوکان ہے جہاں سے اپنی پسند کی کوئ بھی کتاب خریدی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔یہ ایک ثقافتی حلقہ کے طور پر بھی جانا جاتا ہے۔۔۔یہاں ادیب، شعرا بیٹھ کر آپس میں تبادلہ خیال کرتے ہیں۔۔۔

پروتھوما بک

پروتھوما بھی ایک بہت بڑی سی خوبصورت کتابوں سے سجی سجائے دوکان ہے۔۔۔یہاں بھی ہر طرح کی کتابیں مل جاتی ہیں۔۔۔۔یہ لوگ آن لائن بھی آڈر لیتے ہیں۔۔۔۔یہاں اوریجنل کتاب کم رعایت پر مل جاتی ہے ان کا کلیکشن بہترین ہے۔۔۔

باتی گھر

باتی گھر اعلی بک اسٹور ہے۔۔۔اس کی بہت ساری شاخیں بنگلہ دیش کے مختلف شہروں میں موجود ہے۔۔۔۔۔آن لائن کتابیں فروخت کرتے ہیں۔۔۔۔

نیل کھیت

ڈھاکہ یونیورسٹی سے ملحقہ یہ کتاب کی مارکیٹ ہے۔۔۔یہ بہت

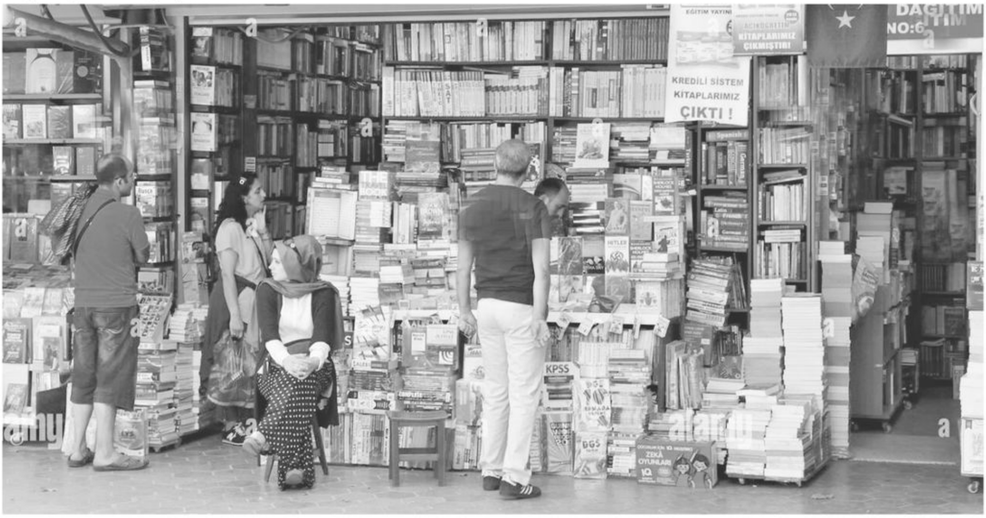

ڈھاکہ میں کتاب کی دوکانیں

پرانا کتابوں کی مارکیٹ ہے۔ جہاں میڈیکل، انجینئر نگ، ایم بی اے وغیرہ کی کتابیں، نوٹس ملتے ہیں۔۔۔اس کے علاوہ یہ مارکیٹ پرانی کتابوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔۔۔ڈھونڈ ھنے سے یہاں ایک سے بڑھ کر ایک کتابیں ملیں گی اور بہت کم قیمت پر۔۔۔۔یہ لوگ نئی انگریزی کتابوں کی پائریٹ کاپی بھی رکھتے ہیں۔۔۔طلبا اور کتاب کے شوقین کے لئے یہ ایک آئیڈیل مارکیٹ ہے۔۔۔۔۔میں اس مارکیٹ میں جا کر سارا دن گزار آتی ہوں کوئی تھکن نہیں ہوتی ہے۔۔۔۔۔ایک دفعہ میں نے پوچھا۔۔۔آپ لوگ اردو کتابیں رکھتے ہیں۔۔۔جواب آیا جی

> پروتھوما بک۔ باتی گھر
> نیل کھیت۔ زینت بک اسٹور۔
> بک وارم

ہاں ہے۔۔۔اور ایک مختصر سی اردو ڈکشنری میرے ہاتھ میں تھمادی۔۔۔

زینت بک اسٹور

زینت بک اسٹور نے اپنا سفر 1963 کو شروع کیا تھا۔۔۔ڈھاکہ نیو مارکیٹ میں زینت بک اسٹور کافی مشہور دوکان تھی۔۔۔تین نسلیں یہاں سے فیض اٹھا چکی ہیں۔۔۔۔۔اب چونکہ کتاب پڑھنے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے، لوگ کتابیں خریدتے نہیں، فوٹو کاپی کی ہوئی کتابیں کم قیمت میں دستیاب ہیں، یہ بھی ایک وجہ ہے معیاری دوکانوں کی تنزلی کی۔۔۔

زینت بک اسٹور نے پہلی مئی کو اپنے اسٹور کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔۔۔۔۔ان سے کہا جاتا تو وہ اردو کتابیں منگوا دیتے،، شمس الرحمان فاروقی صاحب کی،، کئی چاند تھے سر آسماں،، ان کے بک اسٹور سے لیا تھا۔۔۔۔۔۔زینت بک اسٹور کا بند ہونا ایک خوبصورت خواب کا ٹوٹنا ایک ہی بات ہے۔۔۔

یہ تھے ڈھاکہ کے کچھ بک اسٹورز۔۔۔۔۔۔جہاں جا کر اندرونی خوشی محسوس ہوتی ہے۔۔۔۔۔۔جہاں بیٹھ کر کتابوں کی خوشبو اپنے اندر اتارتی ہوں۔۔۔کتابیں کبھی حقیقت بن کر دکھی کرتی ہیں کبھی سپنا بن کر زندگی کو دل آویزی بخشتی ہیں۔۔۔۔۔

بک ورم (Book worm)

بک ورم بھی تقریباً تیس، پینتیس سال پرانی دوکان ہے۔۔۔یہ صرف انگریزی کتابیں رکھتے ہیں۔۔۔۔یہاں بھی ہر موضوع پر کتابیں مل جاتی ہیں۔۔۔۔

اس کے علاوہ بھی بے شمار کتاب کی دوکانیں ہیں۔ ❁

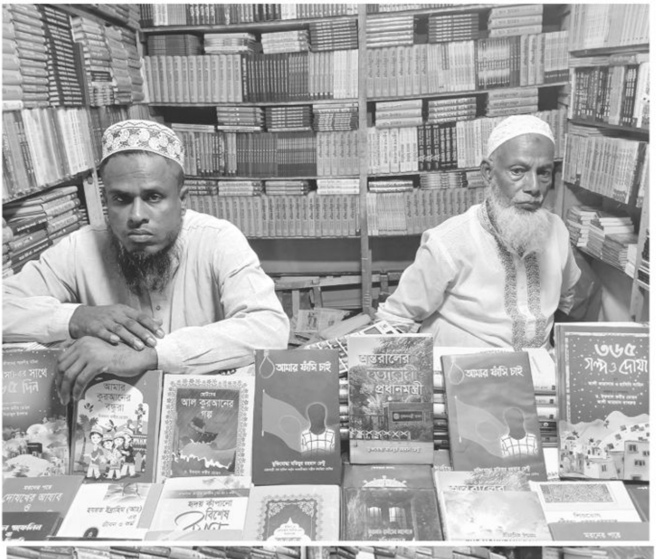

معروف ناول نگار۔ دانشور۔ زیب سندھی سے گفتگو

پرائمری میں جیب خرچی سے پکوڑے نہیں کھائے۔ رسالے کتابیں خریدیں

مقبول ناول نگار۔ زیب سندھی سے حیدر آباد میں ’اطراف‘ کے بیورو چیف مضمون نگار۔ محقق۔ پروفیسر شاداب احمد صدیقی کا خصوصی انٹرویو

پروفیسر شاداب احمد صدیقی

ماہنامہ اطراف دسمبر میں کتاب نمبر کی اشاعت کر رہا ہے۔ اس مناسبت سے میں نے کہانی کار، ناول نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار شاعر اور مترجم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مانے ہوئے کمپییئر زیب سندھی صاحب سے اپنے قارئین کے لیے خصوصی انٹرویو کیا۔
گفتگو کے آغاز سے پہلے قارئین کے لیے زیب سندھی صاحب کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے۔

پہلا افسانہ 17 سال کی عمر میں لکھا

زیب سندھی صاحب کا اصل نام محمد خان شیخ ہے۔ 7 ستمبر 1957 میں خیر پور میرس میں پیدا ہوئے۔ آپ کا آبائی شہر لاڑکانہ اور مستقل رہائش حیدر آباد سندھ میں ہے۔ سندھ یونیورسٹی سے سندھی ادب میں ماسٹر کیا اور ریڈیو پاکستان میں بحیثیت پروڈیوسر تعینات ہوئے۔ کچھ عرصے بعد شعبہ تدریس سے وابستہ ہوئے اور بحیثیت پروفیسر ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ آپ کی کہانیوں کے تراجم اردو، انگریزی، ہندی، بنگالی، ہریانوی، پنجابی، پشتو، بلوچی اور پہاڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔
سندھی اور اردو میں بہت سے کامیاب ٹی وی ڈرامے لکھے ان کی اردو ڈرامہ سیریل جانشین پاکستان کے علاوہ یورپ اور امریکہ میں بھی ٹیلی کاسٹ ہوئی۔ سیتا زینب زیب سندھی کا پہلا ناول ہے اس ناول کا شمار ان ناولوں میں ہوتا ہے جن کو مکمل پڑھے بغیر قاری نہیں رہ سکتا۔
آیئے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

سوال: علم و ادب سے آپ کی وابستگی کب ہوئی؟
جواب: پرائمری اسکول جانے سے پہلے ہی میرے اندر کوئی بے چینی موجود تھی۔ اس چھوٹی سی عمر میں تو شاید میں بے چینی لفظ سے بھی آشنا نہیں ہوا تھا لیکن بے چینی تھی ضرور۔ پہلی جماعت میں جب استاد نے میرا ہاتھ پکڑ کر الف اور ب کے دو حروف لکھوائے تھے تو مجھے سکون کا سا احساس ہوا تھا۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ علم سے وابستگی تو میری فطرت میں شامل تھی۔ میرے اندر کی بے چینی مجھے کہانیوں کی طرف لے گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں نے اسکول کے زمانے میں جیب خرچ سے آئس کریم اور چنے، پکوڑے کم کھائے تھے جب کہ ان پیسوں سے بچوں کی کہانیوں کی کتب اور رسائل بہت خریدے تھے۔ ہائی اسکول پہنچا تو میں ریاضی میں بہت کمزور تھا۔ روزانہ میرا حساب غلط ہوتا تھا۔ بدلے میں استاد مجھے اور ان تمام لڑکوں کے ہاتھ پر ایک زوردار ڈنڈا مارتا تھا، جن کا جواب غلط ہوتا تھا۔ غلط جواب والے دوسرے لڑکوں کا حساب کبھی نہ کبھی درست بھی ہوتا تھا لیکن میرا جواب ہمیشہ غلط ہی ہوتا۔ اس استاد نے کبھی بھی مجھے پاس بلا کر پیار سے ریاضی سمجھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں ریاضی کی کلاس شروع ہونے سے پہلے اسکول سے بھاگ جاتا تھا۔ گھر جا کر ڈانٹ کھانے کی بجائے اسکول کا وقت ختم ہونے تک راستے میں پڑنے والے لاڑکانہ کے مشہور جناح باغ بیٹھ جاتا تھا۔ وہاں تنہائی میں بیٹھے بیٹھے میرا ذہن کہانیاں بننے لگتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے ذہن میں ابھرنے والی ایک صفحہ کی کہانی اردو میں لکھی اور روزنامہ مشرق کے بچوں کے صفحے کے لئے پوسٹ کر دی۔ اسی ہفتے وہ کہانی شائع ہو گئی اور ادب سے میرا اٹوٹ رشتہ جڑ گیا۔

سوال: پہلا افسانہ کب لکھا؟
جواب: بچوں کے ادب کے بعد میں نے پہلا افسانہ سترہ سال کی

’سیتا زینب‘ ناول سمیت سندھی میں 22 کتابیں

عمر میں لکھا تھا۔ سندھی کی ”رہبر ڈائجسٹ“ میں آٹھ صفحات پر مشتمل وہ افسانہ 1974ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد میں سندھی میں ہی کہانیاں لکھتا رہا جو سندھی کے معیاری ادبی رسائل میں شائع

معروف ناول نگار۔ دانشور۔ زیب سندھی سے گفتگو

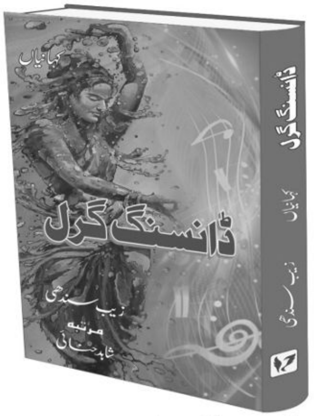

ہوتی رہیں۔ بچوں کی کہانیوں کے بعد، افسانوی ادب سے میرا نصف صدی کا تعلق ہے۔ کہانی میرے پچاس برس سے طویل ادبی سفر کی ساتھی ہی نہیں، بلکہ میرا کہانی سے اس سے بھی پہلے یعنی بچپن کا ساتھ ہے، جیسے بچپن میں کوئی کسی لڑکی کے ساتھ کھیلے، جوانی میں اس سے محبت ہوجائے اور پھر وہ جینے کی لیے ناگزیر ضرورت بن جائے۔

سوال: آپ کی کہانیوں کی ایک کتاب "ڈانسنگ گرل" اردو میں بھی تو شائع ہوئی ہے۔اس کے بارے میں کچھ بتایئے؟

جواب: "ڈانسنگ گرل" دراصل میری سندھی کہانیوں کے اردو تراجم پر مشتمل کتاب ہے۔ مختلف اوقات میں مختلف ترجمہ نگار میری کہانیاں اردو اور دیگر کئی زبانوں میں ترجمہ کرتے رہتے ہیں۔اردو میں خاص طور پر شاہد حنائی، اظہرالحق نسیم، ابراہیم جمالی اور آکاش مغل صاحب نے میری کئی کہانیاں ترجمہ کی ہیں۔ ویسے تو میری اردو میں سو سے زائد کہانیاں ترجمہ ہوچکی ہیں لیکن "ڈانسنگ گرل" میری بیس منتخب کہانیوں کی کتاب ہے، جو شاہد حنائی نے مرتب کی تھی۔ پاکستان میں اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 2017ء میں شائع ہوا تھا۔اس وقت یہ کتاب انڈیا میں میٹرلنک پبلشرز لکھنو کی جانب سے زیر اشاعت ہے۔

سوال: اس کے بعد اردو میں آپ کی کوئی اور کتاب کیوں شائع نہیں ہوئی؟

جواب: "ڈانسنگ گرل" کے نام سے میری سندھی میں کتاب نہیں ہے۔ میری مختلف سندھی کتابوں اور رسائل سے ترجمہ کی گئی کہانیوں کو یہ نام دے کر کتاب شائع کی گئی تھی۔ جیسا کہ میں نے پہلے بتایا کہ میری بہت کہانیاں اردو میں ترجمہ ہو چکی ہیں لیکن نہ تو انہیں میں کتابی صورت میں ترتیب دے سکا ہوں اور نہ کسی اور نے ترتیب دی ہیں۔ وہ کہانیاں میری مختلف سندھی کتابوں سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ان کہانیوں کو ترتیب دیا گیا تو وہ کتابیں یا کتاب بھی "ڈانسنگ گرل" کی طرح کسی ایسے نام سے شائع ہوگی کہ اس نام سے میری سندھی میں کتاب نہیں ہوگی۔ اکادمی ادبیات پاکستان اور انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی کی جانب سے ایوارڈ یافتہ میری سندھی کہانیوں کی کتاب "آخری مانہو" (آخری آدمی) جو اب انڈیا میں بھی شائع ہوئی ہے، آکاش مغل صاحب نے اس کتاب کا مکمل اردو ترجمہ کیا ہے۔ امید ہے نئے سال میں یہ کتاب شائع ہوگی۔

سوال: سندھی میں اب تک آپ کی کتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

جواب: بائیس کتابیں ہیں جس میں غیر افسانوی ادب کی کتابیں بھی شامل ہیں۔

سوال: آپ کے سندھی ناول "سیتا زینب" کو بہت پذیرائی ملی ہے۔ یہ ناول آپ نے کب لکھا تھا اور اب تک کتنی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے؟

جواب: "سیتا زینب" کا پہلا سندھی ایڈیشن 2011ء میں شائع ہوا تھا۔ شاہد حنائی صاحب نے کویت میں رہائش کے دوران اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ 2014ء میں لاہور سے پہلا اردو ایڈیشن شائع ہوا تھا۔اب تک پاکستان اور انڈیا میں اردو کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔اردو کے بعد پہاڑی، عربی اور

> **کتابوں کے ترجمے 9 سے زیادہ زبانوں میں ہو چکے**

ہریانوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، جبکہ بنگالی اور پنجابی میں زیر ترجمہ ہے۔ اس ناول کے چند ابواب انگریزی میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ کسی بھی تخلیق کا دیگر زبانوں میں ترجمہ ہونا بلاشبہ اہمیت رکھتا ہے لیکن اگر مترجم اچھے ہوں۔ خوش قسمتی سے "سیتا زینب" جس زبان میں بھی ترجمہ ہوا وہ مترجم اس زبان کے نامور لکھاری بھی ہیں۔ اردو میں شاہد حنائی، پہاڑی میں راشد عباسی، عربی میں اسداللہ میر الحسنی، ہریانوی میں اختر مرزا نے ترجمہ کیا ہے۔ بنگالی میں ہیکل ہاشمی اور پنجابی میں ثروت سہیل ترجمہ کر رہی ہیں۔ یہ تمام اپنی اپنی زبان کے جانے پہچانے مصنفین ہیں۔

سوال: آپ نے بچپن میں کہانیاں لکھنے کی ابتداء اردو سے کی تھی۔ اس کے بعد اردو میں کیا لکھا؟

جواب: بچوں کی کہانیوں کے بعد تین سال تک سندھی میں کہانیاں لکھنے کے بعد 1977ء میں ایک افسانہ اردو میں لکھا تھا۔ تب میں لاڑکانہ میں رہتا تھا اور وہاں اردو کے ادبی رسائل شاید نہیں آتے تھے، اس لئے یہ افسانہ فلمی رسالے ماہنامہ "شمع" کراچی کو بھیج دیا تھا۔ شائع بھی ہو گیا لیکن لاڑکانہ میں اردو کے ادبی رسائل دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے میں مسلسل سندھی میں ہی لکھتا رہا۔ پھر ایسا وقت

آیا کہ میری سندھی لکھی ہوئی اکثر کہانیاں اردو میں ترجمہ ہوتی رہیں لیکن میں نے اردو میں ٹی وی ڈرامے بہت لکھے۔ کبھی کبھی کالم اور مضامین بھی اردو میں لکھتا رہا ہوں جو "ہم سب" ویب سائٹ پر موجود ہیں۔ اردو میں بہت سی نظمیں بھی لکھی ہیں۔ نظموں کی کتاب شائع ہوگی تو وہ اردو میں میری پہلی طبع زاد کتاب ہوگی لیکن میں بنیادی طور پر فکشن رائٹر ہی ہوں۔

سوال: پہلا ٹی وی ڈرامہ کب لکھا تھا اور اب تک کتنے ڈرامے لکھے ہیں؟

جواب: پہلا ڈرامہ 1986ء میں پی ٹی وی کے لئے سندھی میں لکھا تھا۔ اس کے بعد سندھی اور اردو میں میں مختلف چینلز کے لئے کئی سولو پلیز، ڈرامہ سیریلز اور ٹیلی فلمیں لکھیں لیکن تعداد یاد نہیں۔

سوال: افسانہ، ناول اور ڈرامہ میں آپ کی ترجیح کون سی صنف ہے؟

جواب: ان تینوں اصناف میں کہانی ہوتی ہے۔ Storytelling تو شاید میرے خمیر میں شامل ہے، اس لئے اگر وقت کے ساتھ ترجیح بدل بھی جائے تو کہانی ساتھ ہی رہتی ہے۔ ابتدا میں کئی برس صرف افسانے لکھے، پھر تیرہ سال تک مسلسل ڈرامے ہی لکھے کہ ڈرامہ غم روزگار کا مداوا بھی بنتا ہے لیکن اب میری پہلی ترجیح ناول ہے۔ میں کافی عرصے سے اپنا دوسرا ناول لکھ رہا ہوں۔ زندگی نے مہلت دی تو اس کے بعد بھی مزید ناول ہی لکھنا چاہوں گا۔ ناول میں جو وسعت ہے وہ مجھے کسی اور صنف میں محسوس نہیں ہوتی۔

سوال: ماہنامہ "اطراف" کے کتاب نمبر کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: "اطراف" کے کتاب نمبر کے لئے تو میں یہی کہوں گا کہ یہ محمود شام صاحب کی کتاب سے محبت کا اظہار ہے اور اپنی اس محبت میں انہوں نے ہمیں بھی شامل کرلیا ہے۔ ❁

نیپا کو ہارورڈ کا معیار دینے کا عزم

نیپا۔(انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈ منسٹریشن) میں ڈائریکٹر جنرل ڈاکٹر سید سیف الرحمن کی دعوت پر جانے کا اتفاق ہوا۔تو تیزی سے مثبت تبدیلیاں ہوتی دیکھیں۔ڈاکٹر سید سیف الرحمن پاکستان کے ان نیک نام افسروں میں سے ہیں کہ وہ جہاں بھی جاتے ہیں۔دشت کو گلزار کر دیتے ہیں۔ایمپریس مارکیٹ کے شباب کی بحالی۔کراچی کی عظمت رفتہ کی واپسی کی مساعی۔نیپا کے صحن اور سبزہ زار میں نئی شجر کاری۔وقت کا احساس دلانے کے لیے دیوار گیر کلاک۔آیات قرآنی۔نوشتہ دیوار کے طور پر اقوام متحدہ کے متعین اہداف کا حصول۔ماحول کو حسن فطرت کے روبرو۔یہ تصاویر ملاحظہ فرمائیں۔نیپا میں مستقبل کے اسسٹنٹ کمشنر۔ایڈ منسٹریٹر۔آفیسرز کی تربیت ہوتی ہے۔ان کے لیے سازگار آس پاس کی تخلیق کے لیے ڈاکٹر سید سیف الرحمن کو سلام۔آج کل ہر طرف نفی ہی نفی ہے۔اس میں اگر کوئی اثبات میں منہمک ہے تو لائق تحسین ہے۔وہ نیپا کا معیار اور عمدگی ہارورڈ یونیورسٹی کی سطح تک لے جانا چاہتے ہیں۔(محمود شام)

ایک گل مہر۔ہمارے نام۔

قائداعظم کی تلقین۔ اور ڈھاکے کی تقریر۔ یاد رہے کہ مشرقی پاکستان بھی کبھی پاکستان تھا

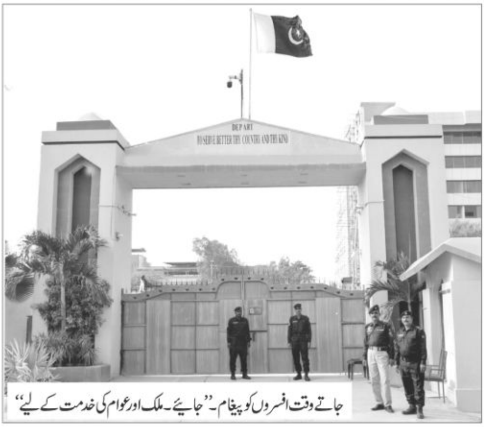

جاتے وقت افسروں کو پیغام۔ ’’جایئے۔ ملک اور عوام کی خدمت کے لیے‘‘

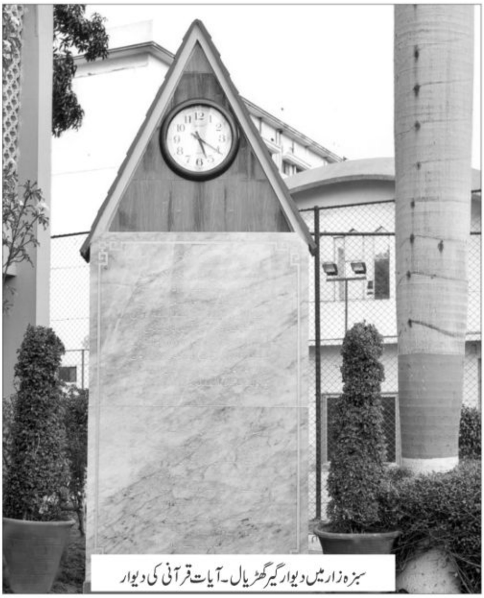

سبزہ زار میں دیوار گیر گھڑیال۔ آیات قرآنی کی دیوار

نیپا کے داخلی دروازے پر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح۔ آپ کو بہت کچھ یاد دلاتے ہیں

بند فوارے بھی اب چل پڑے

”پاکستان لائبریری“ کا وطن عزیز میں قیام

101 کتب جن کی مالیت دولاکھ روپے ہے صرف تیس ہزار روپے (Rs:30,000) میں حاصل کریں۔ پاکستان لائبریری کے نام سے اپنے گھر، محلے، گاؤں، ہسپتال، جیل خانہ جات، کالونی، سکول، کالج، یونی ورسٹی میں اوراپنی اپنی مادرِ علمی میں، اپنے والدین، قومی ہیروز اوراپنے پیاروں کے نام پر یہ کتب خرید کر لائبریری قائم کریں۔

نوٹ: 100 خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم لائبریریوں کا قیام عمل میں لایا جا چکا ہے۔

قدم بڑھائیں، لائبریری بنائیں
کتابیں ایک سو ایک، مقصد اعلیٰ اور نیک

قلم فاؤنڈیشن انٹرنیشنل

یثرب کالونی، بینک سٹاپ، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

ای میل: qalamfoundation2@gmail.com 0300-0515101 / 0309-4105484

تذکرہ کتابوں کا

”خان ظفر افغانی۔اس بار شہر قائد کی خوشبوئوں،لہجوں۔تاریخ اور جغرافیے عادتوں پر لکھی گئی کتابوں کا تذکرہ آپ کے پیش نظر کر رہے ہیں۔کراچی قائداعظم کا محبوب۔غریبوں کی آغوش۔صنعتکاروں کی جنت۔ہنرمندوں کی نگری ہے۔کتابیں اس کے ماضی۔حال کے ساتھ اس کا مستقبل بھی تصویر کر رہی ہیں۔کراچی صرف ایک شہر نہیں۔ایک جذبہ ہے۔ایک عشق ہے۔“

☆ خان ظفر افغانی

”کراچی۔برٹش غلبے سے پہلے“

عارف حسن کی تحقیق

کراچی میں کئی برسوں سے بنی روایت کے مطابق، اس ماہ یعنی دسمبر میں ”سالانہ کتب میلہ“ منعقد ہو رہا ہے۔ تو کیوں نا، کراچی کے حوالے سے حالیہ برسوں میں شائع ہونے والی چند کتب منتخب کر کے، ان کا تذکرہ کیا جائے! لہٰذا پہلے عارف حسن کی کتاب۔

عارف حسن کی یہ تحقیقی کتاب انگلش زبان میں ہے:

"Karachi : Before The British Conquest"

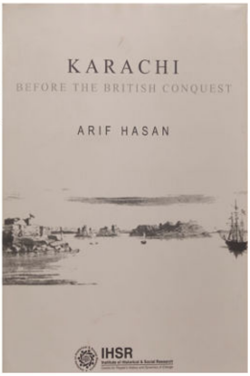

عارف حسن مختلف حوالوں سے معروف ہیں۔ وہ ماہر تعمیرات و منصوبہ بندی، معلم، محقق، بڑی تعداد میں شائع ہونے والے تحقیقی مقالوں اور کتابوں کے مصنّف ہیں۔ ”اورنگی پائلٹ پروجیکٹ ریسرچ و ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ“ کے طویل مدت تک مشیر رہے۔ ”اربن ریسورس سینٹر“ کراچی کے بانی سربراہ ہیں۔ ملک میں اور بیرون ملک مختلف جامعات میں درس دیتے رہے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کے علم اور تحقیقی کام کو ملکی اور بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا۔ ان کے قابل تحسین کام کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے انہیں ”ہلال امتیاز“ پیش کیا۔ معروف ملکی اور غیر ملکی اداروں کی جانب سے انہیں اعلیٰ اعزازات پیش کیے گئے ہیں۔

عارف حسن کی زیر تذکرہ کتاب میں، برٹش راج سے پہلے کے شہر کراچی کی تاریخ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کتاب 145 صفحات پہ مشتمل ہے جن میں کراچی کے مختلف ادوار کے نقشے، تاریخی عمارات و مقامات شامل ہیں۔

کتاب میں جغرافیائی حوالوں، نقشوں کے علاوہ، کراچی کے پس منظر، نظام حکومت اور سماجی زندگی، برٹش غلبے، اس سے پہلے کراچی کے ذرائع محصولات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

محقق و مصنّف عارف حسن نے کتاب کا تعارف کراتے ہوئے بتایا ہے کہ ”یہ (زیر تذکرہ) کتاب ان کی زیر منصوبہ ضخیم کتاب ’انڈر اسٹیڈنگ (کراچی)‘ کا مختصر سا حصّہ ہے۔ مکمل تحقیق چار جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ بقیہ تین جلدوں کے لیے کام جاری ہے۔“

یہ کتاب ”انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ“ کراچی نے شائع کی ہے۔ یہ ادارہ ڈاکٹر طارق سہیل اور ڈاکٹر سید جعفر احمد کی نگرانی میں تاریخی و تحقیقی کام پہ مشتمل قابل مطالعہ و قابل قدر کتابیں شائع کر رہا ہے۔

عارف حسن کی زیر تذکرہ کتاب بھی ایسی ہی قابل تحسین پیشکش ہے جو تاریخ خصوصاً کراچی کے حوالے سے مطالعے کا تجسس رکھنے والی کراچی کی تاریخ پر تحقیق کرنے اور مطالعہ کرنے والے طلبا کے لیے مفید کتاب۔

کتاب کی قیمت ہے 800 روپے۔ اس کے حصول کے لیے، ٹیلی فون نمبر 021-34140035 پر رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔

”ایک لاپتہ شہر کا سراغ“

رمضان بلوچ کی تصنیف

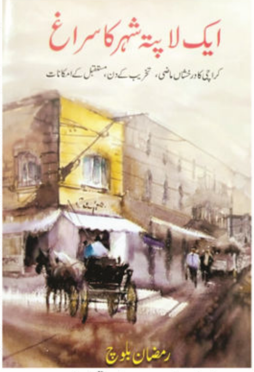

کراچی کی تاریخ کے حوالے سے ایک اور اہم ، قابل مطالعہ کتاب، معروف لکھاری رمضان بلوچ کے تحقیق پہ مبنی اور اسی معتبر تحقیقی ادارے یعنی ”انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ" کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتاب ”ایک لاپتہ شہر کا سراغ“ کا تذکرہ۔

کتاب کا تعارف وطن عزیز کے معروف و کہنہ مشق صحافی ، کالم نویس، ناول نگار، شاعر شام جی نے کرایا ہے۔ بطور اقتباس چند سطریں ہم نے اپنے قارئین کے لیے منتخب کی ہیں کہ ” دردمند شہری رمضان بلوچ کے ’ایک لاپتہ شہر کا سراغ‘ کا مسودہ جب آنکھوں کے سامنے آیا تو کھلا کہ کراچی کو کالم نویس نہیں کتاب نویس میسر آئے ہیں۔ رمضان بلوچ کی ’لیاری‘ پر دردمندانہ تحریر مقبول خاص و عام رہی ہے۔ وہ پوری تحقیق کر کے کتابوں کے اور مصنف کے حوالے سے حقائق اور اعداد و شمار بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کی تکمیل میں کتنے سال رَت جگے کیے ہوں گے، کتنی لائبریریوں کی خاک چھانی ہوگی، اس کے گواہی کتاب کا ہر باب دے رہا ہے۔ گزشتہ کم از کم چار صدیوں کی تفصیلات ملتی ہیں کہ اس شہر میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔ ہر چند کہ اس کتاب کا نام ’ایک لاپتہ شہر کا سراغ‘ ہے۔ مگر اس کتاب کی اشاعت کے بعد اب یہ شہر لاپتہ نہیں رہا۔ مصنف نے اسے اپنی ریاضت سے سے بازیاب کرلیا ہے۔ ان کی یہ کاوش، کراچی کے تاریخ اور جغرافیے پر لکھی جانے والی کتابوں میں ایک اہم اور قیمتی اضافہ ہے۔ اگر کسی یونیورسٹی کے لیے رمضان بلوچ تحقیق کرتے، وہ یقیناپی ایچ ڈی کی ڈگری لے سکتے تھے۔ اب بے نظیر یونیورسٹی لیاری انھیں اس اس تحقیقی کاوش پر اعزازی ڈگری جاری کرسکتی ہے۔

یہ کتاب 326 صفحات پہ محیط ہے۔ اس میں 1729ء سے 1839ء تک کا جائزہ، کلہوڑوں، خان قلات، سیٹھ بھوجول، تالپوروں کے ادوار، برطانوی استعمار کی صدی (1843ء سے 1947ء)، سوسال پہلے کراچی کیسا تھا، قیام پاکستان، مہاجرین، جنرل ایوب، بھٹو اور جنرل ضیا کے ادوار حکومت، پھر جنرل پرویز مشرف کا دور حکومت، دیگر اہم واقعات۔ طلبا تحریک کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

معروف محقق، معلم، مصنف دانش ور اور ڈاکٹر سید جعفر احمد کا کتاب اور مصنّف کے حوالے سے تحریر کردہ مضمون اور معروف ماہر سماجیات، مصنّف، محقق ڈاکٹر ریاض شیخ کی رائے کتاب کے ابتدائی اوراق میں شامل کی گئی ہیں جو اس کتاب کو سند عطا کرتی ہیں۔ کتاب کے قیمت ہے 1600 روپے۔

کراچی کی تاریخ‘ کے بارے میں جاننے کی خواہش رکھنے والوں، تاریخ کے طلباء کے لیے رمضان بلوچ کی یہ کتاب اہم و مفید ماخذ ہے۔

”شکستہ تہذیب“

شاہ ولی اللہ جنیدی کی تحریر و تحقیق

کراچی کے حوالے سے شائع ہونے والی زیر تذکرہ کتاب ”شکستہ تہذیب“ معروف صحافی شاہ ولی اللہ جنیدی کی تصنیف و تحقیق ہے۔ اس سے پہلے ان کی کتاب ”نارتھ کراچی نصف صدی کا قصہ“ 2017ء میں شائع ہوئی۔ 2019ء میں ان کی کتاب ”یہ شارع عام نہیں“ شائع ہوئی جو کراچی کی شاہ راہوں کے بارے میں ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ 2021ء میں شائع ہوا تھا۔

زیر تذکرہ کتاب میں کراچی کی دو بستیوں ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد میں مقیم شخصیات و واقعات اور ان علاقوں کے تاریخ کا ذکر ہے مصنف کا کہنا ہے کہ ” قیام پاکستان کے وقت بھارت سے ہجرت کے بعد خاندان کے بزرگوں نے اس علاقے (ناظم آباد) کا انتخاب کیا تھا، یہ ہی اس علاقے سے تعلق خاطر کی وجہ بنا اور اسی فطری محبت نے مجھے اس کتاب کی تصنیف کے لیے اکسایا اور یوں لوگوں سے رابطے اور مواد کی تلاش شروع ہوئی۔ اس کوشش کو ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کی تاریخ نہ سمجھا جائے۔ یہ یہاں مقیم شخصیات اور اس علاقے میں پیش آنے والے واقعات کا تشنہ سا ایک جائزہ ہے۔

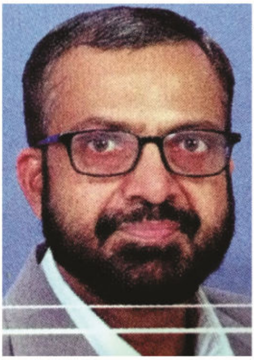

کتاب 269 صفحات اور دس ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے سات ابواب ناظم آباد کی تاریخ محل وقوع سماجی و ادبی تقریبات، سڑکوں کے نام ٹرانسپورٹ کے نظام، یہاں آباد معروف کھلاڑیوں، صحافیوں، فلم و ٹی وی فنکاروں، شعراء، بازاروں، مساجد اور دیگر اہم و دلچسپ واقعات اور کرداروں کے بارے میں ہیں۔ بقیہ تین ابواب نارتھ ناظم آباد کے بارے میں ہیں۔

شاعر، محقق اور مطالعاتِ قائداعظم کے حوالے سے معروف خواجہ رضی حیدر کہتے ہیں کہ "یہ کتاب جہاں ان آبادیوں کے گم شدہ تہذیبی وثقافتی ماضی سے ہمیں روشناس کراتی ہے وہاں ان شخصیات و واقعات سے جڑی یادوں کو بھی ہمارے ذہنوں میں تازہ کرتی ہے جن کو ہم نے نئی زندگی کی ہماہمی میں بڑی حد تک بھلا دیا ہے۔"

معروف معلم، کراچی کی کئی جامعات کے سابق وائس چانسلر، شاعر و پروفیسر ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی نے اظہار خیال کیا ہے کہ "شاہ ولی اللہ جنیدی کی کتابی پیشکش، کراچی کی دو بستیوں کا احوال ہے۔ یہاں رہنے بسنے والی اہم شخصیات اور اہم واقعات کا احوال نہایت سلیقے سے اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔"

ناشر شاہ محمد حمزہ، ریسرچ اینڈ پبلی کیشن سینٹر ، 1526۔ سیکٹر الیون اے نارتھ کراچی " (0300-926-7983) کی شائع کردہ اس کتاب کی قیمت ہے ہزار روپے۔

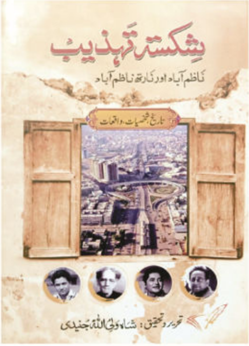

"بلدیہ کراچی سال بہ سال"

بشیر سدوزئی کی تحقیق

بشیر سدوزئی (محمد بشیر خان) کراچی کی معروف شخصیت ہیں۔ انھوں نے بلدیہ کراچی کے مختلف محکموں میں مختلف عہدوں پر طویل عرصے خدمات انجام دی ہیں۔ سماجی مسائل پر ان کے قریباً ڈیڑھ ہزار مضامین اور پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ، گورنر سندھ کے اسپیچ رائٹر اور پی آر او بھی رہ چکے ہیں۔ کئی سماجی اور ثقافتی اداروں سے وابستہ ہیں۔

زیر تذکرہ کتاب بلدیہ کراچی سے ان کی گہری وابستگی اور دس برسوں کی تحقیق پر مبنی ہے جو 1844ء سے 1979ء تک کی تاریخ اور واقعات، سماجی، ثقافتی، سیاسی واقعات، اہم تاریخ تقریبات، تعمیرات و ترقی، بلدیاتی انتخابات، شہری سہولتوں کے محکموں، سیر و تفریح کے مقامات، نقل و حمل کے ذرائع، بازاروں، تعلیمی اداروں و درس گاہوں، اسپتالوں، تعلیمی و سماجی اداروں، بلدیاتی محصولات و مالیات، عوامی کتب خانوں، قیام پاکستان کے بعد نئی بستیوں کے قیام، شہری مسائل اور ان کے حل کے لیے کیے گئے اقدامات، قیام پاکستان سے پہلے سڑکوں کے ناموں کی تبدیلی، قبرستانوں کے لیے قطعات اراضی کی فراہمی، مختلف مقامی محکموں کے حوالے سے قانون سازی، بلدیات قوانین کی تاریخ اور دیگر واقعات و اقدامات کا انتہائی قابل قدر اور قابل رشک کام ہے۔

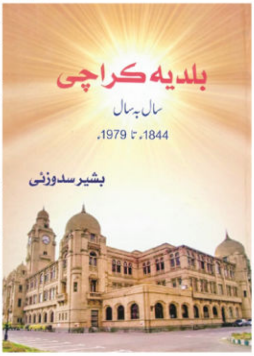

بلدیہ کراچی کے حوالے سے تحقیقی کام کی یہ پہلی جلد ہے جو 744 صفحات پہ مشتمل ہے۔ اس کے تین ابواب ہیں۔ پہلا باب 1844ء سے 1900ء تک، دوسرا باب 1901ء سے 1950ء تک اور تیسرا باب 1981ء سے 1979ء تک کے برسوں کو خود میں سموئے ہوئے ہے۔

کمال کی تحقیق، تصنیف، تالیف ہے۔ بلدیہ کراچی کے حوالے سے ایسی معلوماتی، اتنی تحقیقی کتاب اور وہ بھی اردو زبان میں ہماری نگاہ سے پہلے نہیں گزری۔ اتنی جامع کتاب کو قارئین تک پہنچانے میں بشیر سدوزئی نے کتنی عرق ریزی کی ہوگی، کتنی سرکاری تاریخی دستاویزات کو کھنگالا ہوگا، کتنے دن رات ایک کیے ہوں گے! اس کتاب میں موجود جزئیات دیکھ کر قابل رشک حیرت ہوتی ہے

افسران تو لاتعداد ہوتے ہیں خواہ سرکاری ہوں یا غیر سرکاری۔ لیکن اپنے عرصہ ملازمت کے دوران تحقیق و مطالعے کا شوق رکھنا، اپنے ادارے یا محکمے سے ذہنی وابستگی اور اس کے ماضی و حال کے بارے میں تحقیق اور تصنیف، کسی کسی کے حصے میں آتی ہے۔ بشیر سدوزئی نے وہ تحقیقی کام کیا ہے جو اداروں کی ذمّے داری ہوتی ہے۔ ایک فرد یہ پہاڑ سر کرلے تو لائق تحسین ہے۔ یہ کتاب تعلیمی اداروں، سرکاری و غیر سرکاری کتب خانوں میں لازمی رکھی جانا چاہئے۔

اتنے قابل قدر، قابل ستائش تحقیقی کام پر کوئی ستارہ، کوئی تمغہ، کوئی ہلال!!!

’’کراچی کے اہلِ قلم‘‘ ۔ منظر عارفی کی تحقیق و ترتیب

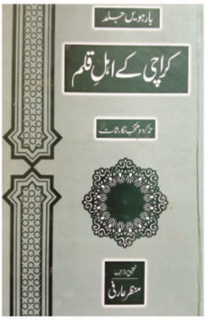

’’کراچی کے اہلِ قلم‘‘ کے نام سے جو سلسلہ شروع کیا گیا‘ اس کی جلدیں ہشتم، نہم، دہم، بارہویں جلد، ’اطراف، کو موصول ہوئی ہیں۔ ہر جلد میں حرف تہجّی کے لحاظ سے یعنی الف سے ہ تک، سو اہل قلم کا تذکرہ اور ان کی نگارشات کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح بارہ جلدوں میں بارہ سو اہلِ قلم کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

اس بارہویں جلد کا مقدمہ سعید الظفر صدیقی نے تحریر کیا ہے۔ اس سے اقتباس بطور تعارف ملاحظہ کیجئے۔ ’’یہ معروف تذکرے ہیں جو اسلاف اہل قلم سے لے کر آج تک کے تذکرہ نگاروں نے لکھے اور مشہور ہوئے۔ فی زمانہ سب سے اہم تذکرہ نگاری کا سلسلہ پاکستان کے معروف تذکرہ نگار منظر عارضی نے کراچی کے ’اہل قلم‘ کے عنوان سے شروع کیا ہوا ہے۔ یہ پروجیکٹ معروف شاعر و ادیب، ناشر و صحافی شاعر علی شاعر کا ہے اور وہ اسے اپنے، معروف اشاعتی ادارے ’رنگِ ادب پبلی کیشنز‘ سے کثیر سرمایہ خرچ کر کے شائع کر رہے ہیں۔ یہ ان کا فروغِ ادب میں حصّہ بھی ہے اور ان کا اُردو زبان و ادب کے لیے جذبہ و ایثار بھی۔‘‘

آٹھویں جلد میں مقدمہ، ڈاکٹر انصار احمد شیخ کا تحریر کردہ ہے۔ نویں جلد کے لیے ڈاکٹر شیما ربانی نے مقدمہ تحریر کیا ہے اور دسویں جلد کے لیے ڈاکٹر رخسانہ صبا نے۔

ہمارے سامنے موجود ان چار جلدوں میں، چار سو اہل قلم کا تذکرہ موجود ہے۔

آٹھویں جلد کی ضخامت، 352 صفحات، نویں جلد 416 صفحات، دسویں جلد 430 اور بارہویں جلد 410 صفحات۔

منظر عارفی کا یہ تحقیقی کام بہت منفرد ہے۔ (اب تک) بارہ سو اہل قلم کا تذکرہ شائع ہو چکا ہے۔ اور یہ عزم ہے کہ بیس جلدوں میں اسے مکمل کر دیا جائے گا۔ گویا دو ہزار، کراچی کے اہل قلم کا تذکرہ مع نگارشات سے چھپ کر محفوظ ہو جائے گا۔ یہ ذخیرۂ معلومات، قابل ستائش ہے۔ جس کے لیے منظر عارفی قابل تحسین ہیں۔ اتنا وقیع کام، سخت محنت طلب ہے۔ اس تحقیق و ترتیب میں کتنا وقت صَرف ہوگا، کتنی عرق ریزی ہوئی ہوگی۔ آفریں ہے اس لگن، محنت اور جذبے پر۔

اس قیمتی اور قابل قدر سلسلے کی اشاعت پر ناشر قابل مبارکباد ہیں۔

’’مثنوی سَیر کراچی‘‘ از: شبنم رومانی

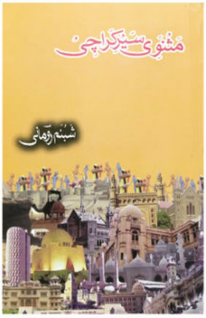

شہر کراچی کے بارے میں تحریروں کا تذکرہ ہو رہا ہے تو کیوں نامعروف شاعر شبنم رومانی (مرحوم) کی مثنوی کا ذکر بھی کیا جائے جو کراچی کی سیر کراتی ہے۔ گو کہ اس مثنوی کو کہے ہوئے کئی عشرے گزرے لیکن یہ اپنی نوعیت کی منفرد اور یادگار مثنوی ہے۔ یہ جیسی کتاب کی شکل میں شائع ہوئی تھی۔ اسے اس تذکرے میں شامل کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ آج کے پڑھنے والوں تک اسے پہنچایا جائے۔

’’جوئے کوہسار‘‘ کے عنوان سے جوش ملیح آبادی نے یوں اظہار رائے کیا ہے۔ کہ ’’شبنم رومانی صاحب کی ’مثنوی سیر کراچی‘ کے سرسری مطالعے کے بعد میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ انہوں نے شہر کے تمام ہو نکتے ہوئے گوشوں کا رواں دواں مطالعہ کیا ہے اور اپنے مشاہدات کے تاثرات کو نہایت قابل تعریف ہلکی پھلکی زبان، لچکتے ہوئے لہجے اور رسیلے طرزِ بیان میں شگفتگی و روانی کے ساتھ ادا کر دیا۔ میرے نزدیک ایک بڑی کامیاب نظم ہے جس میں شگفتگی بھی ہے اور بہاؤ بھی اور یہ ایک ایسی شفاف پانی کی مچلتی اور گنگناتی ہوئی جوئے کوہسار ہے جس کے ساحل پر کھڑے ہو کر ایک نہایت دلچسپ و متحرک تماشا دیکھا جا سکتا ہے۔‘‘

آغا شورش کاشمیری کا کہنا ہے کہ ’’زیر نظر مثنوی خوبصورت بلاؤں، کے شہر کراچی پر ایک بھرپور طنز اور اس کے ساتھ ایک دلچسپ مذاق ہے، مگر مطالعے کے دوران طنز اور مذاق کے تاثرات سروں کی طرح گزر جاتے ہیں اور ساحل ذہن پر مصنّف کی سنجیدگی کے نشانات باقی رہ جاتے ہیں۔‘‘

شاعر نے اس مثنوی میں تفریح گاہیں، بستیاں، سات عجائبات، ادارے، درس گاہیں، ادب و صحافت، نعت و حرفت، بازیاں، پیداوار، سڑکیں‘ بازار کے عنوانات سے اشعار کہے ہیں۔

شبنم رومانی نے اپنے اشعار کی شکل میں کراچی شہر کی جو تصویر کشی کی ہے وہ دلچسپ ہونے کے ساتھ قابل غور ہے اور سنجیدگی کا پہلو بھی رکھتی ہے، یہ مثنوی واقعی کراچی کی سیر کراتی ہے، اس میں کراچی کے لوگوں کے نفسیات، یہاں کے مختلف مسائل، شہر کا ماحول، معروف شخصیات کا ذکر ہے۔

شوکت تھانوی کہتے ہیں کہ ’’یہ نہ پوچھئے کہ اس مثنوی میں کیا ہے بلکہ سوال یہ کیجئے کہ اس مثنوی میں کراچی سے متعلق کیا نہیں ہے۔ اس مثنوی کو کراچی کی اچھی خاصی منظوم ڈائریکٹری کی حیثیت حاصل ہے۔‘‘

ماہر القادری اور پروفیسر عصمت اللہ خان کی آراء بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

’’مثنوی سیر کراچی‘‘ اپنی انفرادیت، شعریت، طنز و مزاح اور شہر کراچی کی تصویر کشی کی خوبیوں کے اعتبار سے خاصے کی چیز ہے۔ دستیاب ہو جائے تو اسے ضرور پڑھئے۔ ❁

کفالتِ یتیم سے --- جنّت کا حصول بھی --- رفاقتِ رسولﷺ بھی
الخدمت
ALKHIDMAT
الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان
ALKHIDMAT FOUNDATION PAKISTAN
AGHOSH COLLEGE
دُعاء
تقدیر بدلنے کا فن جانتی ہے
تو کیا ہی افضل ہو کسی یتیم کی دُعا لے لی جائے
آپ بھی زکوٰۃ و عطیات دے کر شامل ہو جائیں ۔۔۔ لاکھوں دُعاؤں میں
زکوٰۃ اور عطیات کے لیے
زکوٰۃ میزان بینک 02140101095120
عطیات میزان بینک 02140100861151
0800 44448
www.alkhidmat.org/give

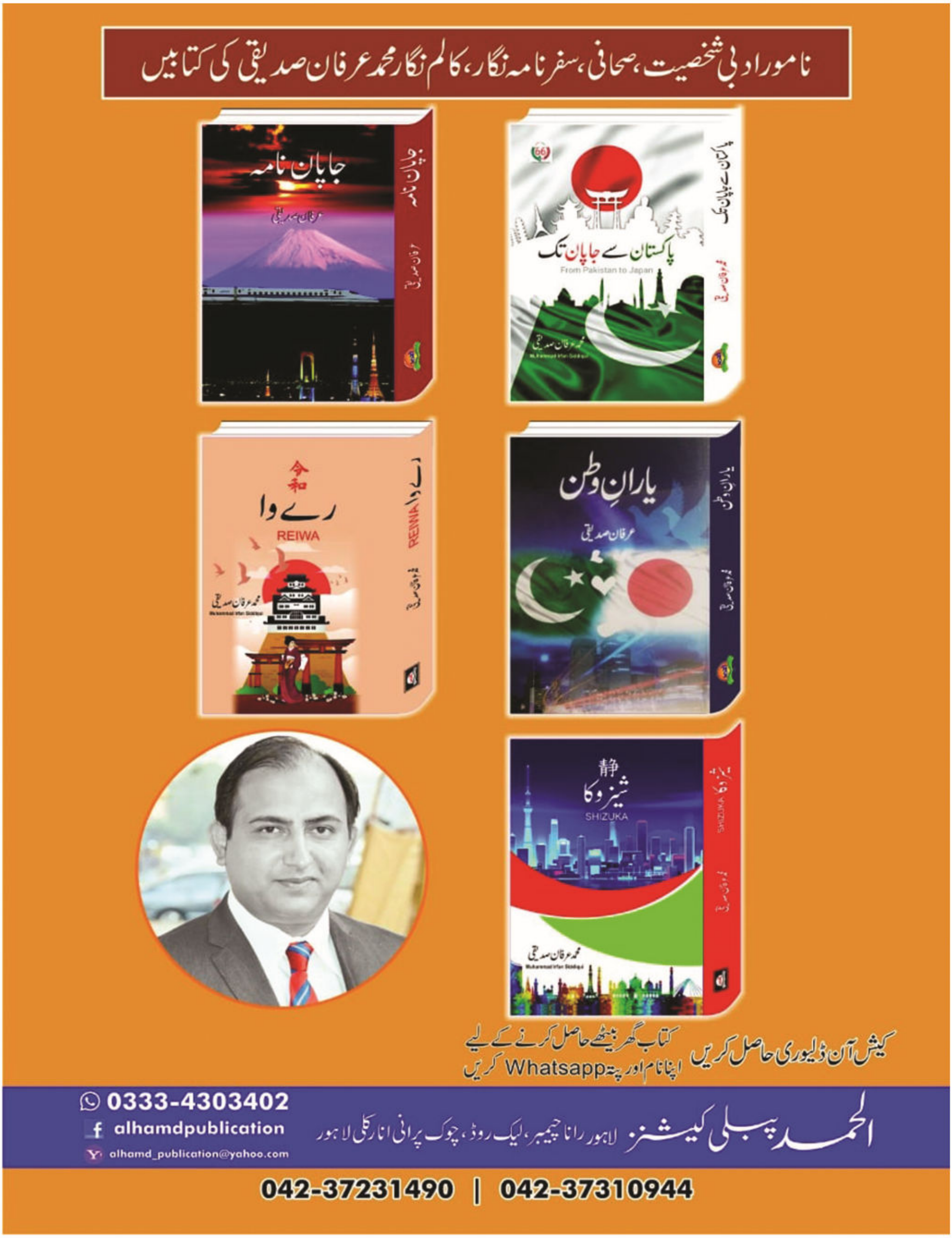

نامور ادبی شخصیت، صحافی، سفر نامہ نگار، کالم نگار محمد عرفان صدیقی کی کتابیں
جاپان نامہ
پاکستان سے جاپان تک
From Pakistan to Japan
令和
رے وا
REIWA
یارانِ وطن
عرفان صدیقی
静
شیزوکا
SHIZUKA
کیش آن ڈلیوری حاصل کریں
کتاب گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے
اپنا نام اور پتہ Whatsapp کریں
0333-4303402
alhamdpublication
alhamd_publication@yahoo.com
الحمد پبلی کیشنز
لاہور رانا چیمبر، لیک روڈ، چوک پرانی انارکلی لاہور
042-37231490 | 042-37310944

اٹلانٹس پبلکیشنز — کراچی بین الاقوامی کتاب میلہ 12 سے 16 دسمبر

اشتیاق احمد کے ناول اٹلانٹس پبلی کیشنز کے اسٹال سے رعائتی قیمت پر خریدیئے

- محمود ، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید کے ڈھیروں جاسوسی ناول
- انسپکٹر جمشید سیریز کا نیا ناول "موت گھر"
- اشتیاق احمد کے 65 خاص نمبروں کا مکمل سیٹ
- اشتیاق احمد کا غیر مطبوعہ بیباک ناول "جنونی" پہلی بار منظرِ عام پر
- باطل قیامت کا انگریزی روپ The Doomsday Deception
- ناولوں کے پہلے ایڈیشنز کے نئے پرنٹ، اوریجنل سرورق اشتہارات اور بچوں کے خطوط کے ساتھ

ایک بات

اشتیاق احمد کے ایک اور نئے غیر مطبوعہ ناول ''موت گھر'' کے منظرِ عام پر آنے کا اور آپ سب سے ملاقات کا سالانہ موقع آن پہنچا۔ موت گھر کراچی کتاب میلے کے پہلے روز اٹلانٹس کے اسٹال سے آپ حاصل کر سکیں گے۔ اس سال ''باطل قیامت'' انگریزی میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس سال اٹلانٹس نے کتاب میلے کے لیے شروع سے آخر تک کے سارے ہی یعنی 65 خاص نمبروں کے پہلے ایڈیشن اپنی اصل شکل میں دوبارہ چھاپ دیئے ہیں یعنی ویسے ہی جیسے وہ پہلی بار چھپے تھے۔ اب آپ کو پھٹے پرانے ناول خریدنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے علاوہ لاتعداد شاہکار ناول جو عرصہ دراز سے ناپید تھے دوبارہ شائع کئے گئے ہیں۔ اٹلانٹس نے اُس وقت اشتیاق احمد کے ناولوں کی نشاۃ ثانیہ کی ذمے داری سنبھالی جب اشتیاق احمد حالات سے مایوس ہو کر لکھنا ترک کر چکے تھے۔ اٹلانٹس پبلی کیشنز کا وہی اسٹال اس بار بھی آپ کو خوش آمدید کہے گا جہاں بیٹھ کر اشتیاق احمد وفات سے ایک روز پہلے تک ناولوں پر آٹوگراف دیتے رہے۔ اشتیاق احمد کا سسپنس سے بھرپور ضخیم غیر مطبوعہ بیباک ناول ''جنونی'' بھی شائع کیا جا رہا ہے۔ اشتیاق احمد کے قلم کا یہ روپ آپ نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ اے حمید کا یادگار ناول ''لاش زندہ ہوگئی'' اور محمود خاور کی ''بچوں کی عمران سیریز'' کے سولہ مزیدار ناولوں کا مکمل سیٹ بھی اٹلانٹس نے شائع کر دیا ہے۔ اور ہاں حکومت پاکستان نے اشتیاق احمد پر جو کتاب شائع کی ہے وہ بھی اٹلانٹس کے اسٹال سے لینا نہ بھولیے۔ اسرائیل سے نبرد آزما فلسطینی فدائین کی جدوجہد کو سلام پیش کرنے کے لئے جبار توقیر کا ایمان افروز ناول ''العاصفہ'' ضرور خریدیئے گا۔ کتاب میلے میں اٹلانٹس پبلی کیشنز کا اسٹال کہاں ہوگا؟ یہ جاننے کے لیے ہمارا فیس بک پیج وزٹ کیجیے۔

facebook.com/InspectorJamshed
facebook.com/atlantispublications

فاروق احمد

اٹلانٹس پبلکیشنز — رابطے اور معلومات کیلئے 0348-2568546 0300-2472238 0331-4853445

انسٹی ٹیوٹ آف ہسٹاریکل اینڈ سوشل ریسرچ

کی علمی اور تحقیقی کتابیں، معروضی اور غیر جانبدار تاریخ کا بیش بہا سرمایہ

شب گزیدہ سحر

پاکستان میں فوج اور بیوروکریسی کی حکمرانی کا آغاز

مصنف: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

قیمت: ۵۰۰ روپے

ہندوستان کی تاریخ: مارکسی تناظر

مصنف: پروفیسر عرفان حبیب

ترجمہ: ڈاکٹر انور شاہین

قیمت: ۱۶۰۰ روپے

کراچی، برطانوی قبضے سے قبل

(بزبان اردو)

معروف اربن پلانر اور مصنف عارف حسن کی مستند تحقیق

Karachi Before the British Conquest
by Arif Hasan

قیمت: ۸۰۰ روپے

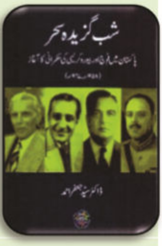
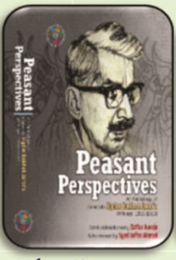

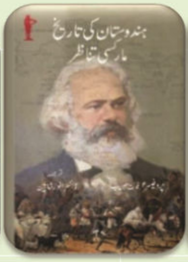
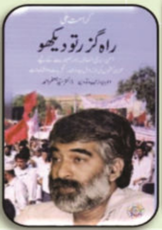
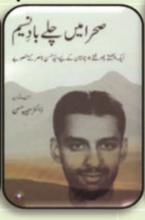
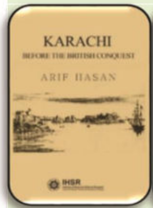

معروف ہاری رہنما حیدر بخش جتوئی

کی تاریخی اہمیت کی حامل انگریزی تحریروں کا مجموعہ

Peasant Perspectives

An Anthology of Comrade Hyder Baksh Jatoi's Writings (1950-1969) Edited and Introduction by: **Zaffar Junejo** with a foreword by: **Syed Jaffar Ahmed**

قیمت: ۳۰۰۰ روپے

راہ گزر تو دیکھو

امن، سماجی انصاف اور جمہوریت کے لیے محنت کشوں کی

لازوال جدوجہد تجربات و مشاہدات، کرامت علی

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

قیمت: ۸۰۰ روپے

صحرا میں چلے بادِ نسیم

ایک پھلتے پھولتے بلوچستان کے لیے

سیّد حسن ناصر کے منصوبے

مرتب: ڈاکٹر حبیبہ حسن

قیمت: ۶۰۰ روپے

احفاظ الرحمٰن اور مزاحمت

ترتیب و تدوین:

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

قیمت: ۸۰۰ روپے

پاکستان میں معاہدۂ عمرانی

ڈاکٹر سیّد جعفر احمد،

ظفر جونیجو

قیمت: ۴۰۰ روپے

ایک لاپتہ شہر کا سراغ

(کراچی کی تاریخ اور معاشرتی تبدیلیاں)

مصنف: رمضان بلوچ

قیمت: ۱۶۰۰ روپے

خدائی خدمتگار تحریک

مصنف: احمد

پیش لفظ: خان عبدالولی خان

دو جلدیں، قیمت: ۳۰۰۰ روپے

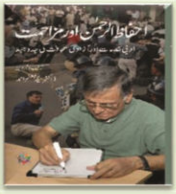

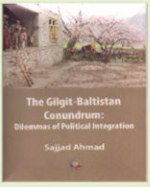

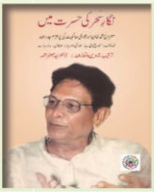
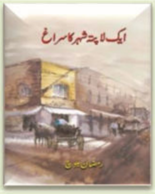
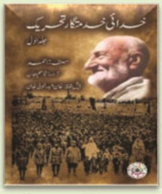

نگارِ سحر کی حسرت میں .... (ڈاکٹر سیّد جعفر احمد)

معراج محمد خان اور عوامی حاکمیت کی پُر عزم جدوجہد قیمت: ۲۰۰۰ روپے

The Gilgit-Baltistan Conundrum:

Dilemmas of Political Integration by Sajjad Ahmad

Rs. 600/-

Contact: Institute of Historical and Social Research
22-23, Shaheed-e-Millat Road, Karachi. Tel: (92 21)34140035 - E-mail: mail@ihsr.pk / Website: www.ihsr.pk

BIN AHSAN
Builders & Developers

BIN AHSAN GREEN CITY PHASE-I

PROJECT OF BIN AHSAN BUILDERS AND DEVELOPERS

اعتماد کی دنیا میں بڑا نام بن احسان

بن احسان گرین سٹی میں ترقیاتی کاموں کا آغاز ہو چکا ہے، 120 گز کے پلاٹ پر خصوصی رعایت
کے لیے رابطہ کریں اور آج ہی اپنا پلاٹ بک کرائیں۔ اپنا اور اپنے بچوں کا مستقبل محفوظ بنائیں۔

A PIECE OF LAND
THAT EVERYONE CAN AFFORD !

MEMBER OF: abad

Universal Account Number : 03-111-155-530

www.binahsanbuildersanddevelopers.com

HEAD OFFICE LOCATION : OFFICE # 59,60 1ST FLOOR JABL-E-REHMAT TOWER ,GULISTAN-E-JAUHAR BLOCK 16A

Bridging Extremes
Monthly "ATRAAF" Karachi
December 2024
Regd No. MC - 1398 ☎ 0300-8210636 ✉ www.Atraafmagazine.com